

# حضرت استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ

مولانا سید سلیمان ندویؒ  
حضرت استاذی المحترم

سید صباح الدین عبد الرحمنؒ

سید صباح الدین عبد الرحمنؒ

ناشر

علامہ سید سلیمان ندوی اکیڈمی استخوانوال، (بہار شریف) نالندہ

دارین بک ڈپو

حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ  
(مشاہدات و تراثات)

مطبوعہ  
ظہرت ندوی

دارین بک ڈپو، آئی اے اے، ٹاگور مارگ، نادرہ روڈ، لکھنؤ-20

دارین بک ڈپو

**DARAIN BOOK DEPOT**

Tagore marg, Nadwa Road, Lucknow-20

darainbookdepot@gmail.com

Mob.: 09335790353, 09335858300

Designed by Abdur Rahim Mob. 8726305094

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

## باراؤل

حضرت استاذی المحترم

# مولانا سید سلیمان ندویؒ

|             |  |
|-------------|--|
| نام کتاب :  | حضرت استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ                |
| نام مصنف :  | سید صباح الدین عبدالرحمنؒ                                  |
| ترتیب :     | طلحہ نعمت ندوی   |
| سنہ اشاعت : | ۱۴۳۷ھ مطابق ۲۰۱۶ء  |
| صفحات :     | ۳۸۴  |
| ناشر :      | علامہ سید سلیمان ندوی اکیڈمی استھانواں، (بہار شریف) نالندہ |
| باہتمام :   | مکتبۃ الدارین، لکھنؤ فون نمبر: 9335858300<br>9335790353    |
| قیمت :      | ۲۵۰  |

سید صباح الدین عبدالرحمنؒ

ناشر

علامہ سید سلیمان ندوی اکیڈمی استھانواں، (بہار شریف) نالندہ

ملنے کے پتے

- ۱- مکتبۃ الدارین
- ۲- مکتبۃ عکاظ دیوبند
- ۳- بک اپوریم سبزی باغ پٹنہ

## فہرست مضامین

| صفحہ نمبر | عنوان   |
|-----------|---|
| ۵         | ● مقدمہ   |
| ۱۱        | ● علامہ سید سلیمان ندوی   |
| ۲۰        | ● استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی کی رحلت پر ہم پر کیا گذری   |
| ۱۰۳       | ● استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی کے اخلاق و سیرت کے کچھ جلوے |
| ۱۲۷       | ● استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی اور تاریخ ہند               |
| ۱۵۰       | ● افادات سید صاحب   |
| ۱۶۸       | ● حضرت سید صاحب اور ڈاکٹر اقبال                                     |
| ۱۹۸       | ● حضرت سید صاحب اور سیاسیات   |
| ۲۱۵       | ● سلوک سلیمانی پر ایک نظر   |
| ۲۱۸       | ● حضرت سید صاحب کی اہلیہ محترمہ                                     |
| ۲۲۳       | ● حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی کی خیام پر ایک نظر            |
| ۲۴۶       | ● حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی                               |

- ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے ۲۷۷
- حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی اپنی سیرۃ النبی میں انشاء ۳۰۹
- پرداز کی حیثیت سے
- حضرت استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی کی سیرۃ النبی جلد ۳۵۵
- پنجم ایک طالب علمانہ جائزہ
- حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کی سیرۃ النبی جلد ششم پر ایک نظر ۳۷۵

## عرض مرتب

حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر ساٹھ سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے، اس طویل عرصہ میں ان کے اوصاف و کمالات اور علمی عظمت و منزلت پر جتنی روشنی ڈالی گئی اور ان کی زندگی کے جلوہائے صدر رنگ کی نمائش میں جو کوششیں ہوئیں وہ بجائے خود ایک مستقل و مفصل موضوع ہے، لیکن ان کی زندگی کے بہت سے گوشے ہنوز پردہٴ خفا میں ہیں، ان کی شخصیت مجمع الکمالات اور متنوع الاوصاف تھی، وہ علوم اسلامیہ کے شناور بھی تھے، اور اقلیم شعرو سخن کے تاجدار بھی وہ بادۂ تصوف کے جوان جرمہ نوش بھی رہے اور ارشاد و معرفت کے پیرمے فروش بھی بنے، انہوں نے تقسیم ہند کے عہد آشوب میں ہندوستانی مسلمانوں کے رہبری و رہنمائی بھی کی اور تقسیم ملک کے بعد اسلامی ملک میں جا کروہاں کی دستور سازی کی نازک ذمہ داری بھی انجام دی۔

مخدومی و محترمی جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب دسنوی رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت سید صاحب علیہ الرحمہ کی ذات والا صفات سے جو عقیدت و محبت بلکہ جنون کی حد تک ان کی ذات سے جو والہانہ تعلق و شفیقتی تھی چشم فلک نے استاذ و شاگرد اور شیخ و مرشد کی محبت کے ایسے نمونے کم ہی دکھے ہوں گے، وہ حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے عزیز تھے لیکن ان کی تحریر میں خاندانی عصبیت یا اظہار تعلق کی کوئی جھلک بھی نہیں نظر آتی، وہ بقول خود آستانہ شبلی و سلیمان کے مجاور تھے اور پوری زندگی اسی مجاوری میں گذاردی، جب وہ حضرت سید صاحب پر کچھ لکھتے ہیں تو بے خود ہو جاتے ہیں، اور ان کا قلم قابو میں نہیں رہتا، ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کا سب سے محبوب کام انجام دے رہے ہیں، وہ صفحات کے صفحات لکھتے چلے جاتے

ہیں لیکن انہیں کوئی تکان محسوس نہیں ہوتی، حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر سب سے پہلا مضمون انہی کے قلم سے نکلا جو ۱۹۴۲ء کے ماہنامہ ”ندیم“ (گیا) کے بہار نمبر میں شائع ہوا، یہ مضمون حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے معتقدین کی طلب پر لکھا گیا تھا، اور جب سید صاحب کے حالات دریافت کئے جائے تو اس کے جواب میں یہ مضمون ارسال کر دیا جاتا، یہی مضمون ”حیات سلیمان“ کی تصنیف میں شاہ صاحب کے بھی پیش نظر رہا، اس لئے اس مجموعہ میں بھی اسے ہی اولیت دی گئی ہے، حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ کے انتقال کے بعد جنوری ۱۹۵۴ء میں ندوۃ العلماء میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی دعوت پر حضرت سید پر ایک روزہ تعزیتی نشست منعقد کی گئی جس میں ملک کے ممتاز اہل علم نے شرکت کی تھی، اور حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی صدارت فرمائی تھی، اس موقع پر بھی دیگر اہل قلم کی طرح سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب نے حضرت سید صاحب کے ادب و انشاء کے موضوع پر ایک مضمون قلمبند فرمایا تھا، بقول مولانا عبداللہ عباس ندوی رحمۃ اللہ علیہ ”سید صباح الدین صاحب نے اپنے لئے جو موضوع انتخاب کیا تھا وہ سید صاحب کے قلم سے نکلے ہوئے وفیات کے منتخب اجزاء تھے، جب ان کی باری آئی، میکروفون کے سامنے کھڑے ہوئے تو آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے، آواز گلوگیر ہو گئی، وہ اپنا مقالہ سنائے بغیر ہی نشست پر بیٹھ گئے“۔ (نگارشات ص: ۲۹۹)

معلوم نہیں یہ مضمون شائع ہوسکا یا نہیں، اس وقت سے سید صاحب کی شخصیت پر ان کی تحریروں کا جو سلسلہ شروع ہوا تو وفات پر ہی جا کر رکا، سید صاحب کی وفات کے دوسرے مہینہ میں ”آہ سید صاحب ہم پر کیا گذری“ کے عنوان معارف میں جو مضمون شائع ہوا اس میں انہوں نے اپنے زخمیائے جگر اور اشکبار ہوئے بغیر نہیں رہتا، ایسا لگتا ہے کہ جیسے حضرت سید صاحب کی وفات ابھی ہوئی ہے، اور پھر علالت سے لے کر وفات اور تعزیت تک کے تمام مناظر اس کی نگاہوں کے سامنے آ جاتے ہیں، اور قاری بے چین ہو جاتا ہے، مئی

۱۰۵۵ء میں حضرت سید صاحب پر سلیمان نمبر نکلا تو انہوں نے اس میں بھی آگے بڑھ کر حصہ لیا، سوانح حیات اور سیرت و اخلاق کے کچھ جلوے اسی خصوصی شمارہ کی یادگار ہیں۔

علامہ اقبالؒ اور حضرت سید صاحبؒ کے تعلقات پر دسیوں مضامین کے علاوہ دو تین کتابیں بھی منظر عام پر آئی ہیں لیکن سید صباح الدین عبدالرحمن کی طرح شاید ہی کسی نے چشم دید واقعات رقم کئے ہوں گے، سید صاحبؒ کی شخصیت پر ۱۹۸۵ء میں ان کی صد سالہ تقریب ولادت کے موقع پر برصغیر ہندوپاک میں متعدد سیمینار منعقد ہوئے، ان میں سے اکثر سیمیناروں میں سید صباح الدین صاحب نے شرکت کی اور صدر محفل و شمع مجلس بن کر شریک ہوئے، مزید تفصیل مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحبؒ سے سنئے، لکھتے ہیں: ”ان کی (سید صاحبؒ کی) صد سالہ سال گرہ کی تقریبات اس برصغیر میں مختلف جگہ منائی گئیں، جناب سید صباح الدین صاحب مرحوم ان تقریبات میں مدعو ہوتے تھے، اور اکثر میں انہوں نے بڑی دلچسپی اور سرگرمی سے حصہ بھی لیا، وہ سید صاحبؒ کی وفات کے بعد ہی سے ان پر مضامین لکھتے رہے ہیں، ان تقریبات کی وجہ سے اس کا مزید موقع ملا۔“

ان تقریبات ہی کی مناسبت سے ان کے متعدد مضامین منظر عام پر آئے، ”ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہوں جسے“ بہار اردو اکیڈمی پٹنہ میں سید شہاب الدین دسنوی کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے ایک روزہ سیمینار میں پیش کیا گیا، ”سیرۃ النبیؐ میں انشاء پر داز کی حیثیت سے“ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی جانب سے منعقدہ سیمینار میں اور خیام پر مفصل مقالہ انجمن ترقی اردو ہند کے سیمینار میں پیش کیا گیا، ”حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندویؒ دارالعلوم تاج المساجد میں مولانا عمران خان ندوی کے زیر اہتمام منعقد شدہ مذاکرہ علمی کی یادگار ہے۔“

ان تقریبات کے بعد انہیں بہت زیادہ اس دنیا میں رہنے کا موقع بھی نہیں ملا، اور صرف دو سال کے بعد وہ ۱۹۸۷ء کے اواخر میں اس دار فانی سے رخصت ہو گئے، یہ حسن اتفاق تھا کہ ان کی آخری زندگی دیگر علمی کاموں کے باوجود حضرت سید صاحبؒ ہی کی یاد سے معمور رہی اور انہوں نے سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تمام تصانیف کا بالاستیعاب مطالعہ

کر کے ان پر مفصل تبصرہ کا آغاز کیا، اور پہلی جلد کی تکمیل کے بعد اس کی طباعت کا سامان ہی کر رہے تھے کہ لکھنؤ کے ایک سفر میں سفر آخرت پر روانہ ہو گئے، ان کو دفن کے لئے دارالمصنفین میں وہی جگہ ملی جو ان کے محبوب حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مسجد سے متصل علامہ شبلیؒ کے پہلو میں اپنے لئے منتخب کی تھی، چنانچہ ان کی وصیت کے مطابق لکھنؤ سے ان کا حسد خالی دارالمصنفین لا کر اسی جگہ سپرد خاک کر دیا گیا، اور اس طرح حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک صداقت شعار اور مخلص عقیدت کیش جانشین کی ابدی آرام گاہ بھی وہی جگہ بنی جو اس کے محبوب کو پسند تھی، اللہ رب العزت کی ذات عالی سے امید ہے کہ انشاء اللہ آخرت میں بھی وہ حضرت سید صاحب کی رفاقت و محبت سے سرفراز ہوں گے۔

ان کی آخری تصنیف ”مولانا سید سلیمان ندویؒ کی تصانیف ایک مطالعہ“ کی صرف پہلی جلد منظر عام پر آسکی، مولانا ضیاء الدین اصلاحی اس کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں: ”اسی سلسلہ (تقریبات صد سالہ) میں انہیں ان کی تصنیفات پر مبسوط تبصرہ لکھنے کا خیال ہوا، اس غرض سے انہوں نے سید صاحبؒ کی تمام تصنیفات کا غور و خوض سے از سر نو مطالعہ کیا اور بڑی محنت، جاں فشانی اور عرق ریزی سے یہ کتاب لکھی، جس سے سید صاحبؒ کی تصنیفات کی خصوصیات و خوبیاں پوری طرح نمایاں ہو گئی ہیں، ان کو حضرت سید صاحبؒ کی ذات سے جو الہانہ عقیدت و شفیقتگی اور گہری واقفیت تھی، اس کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کام کو اس قدر شوق و محنت سے اور اتنے بہتر طریقہ پر کوئی نہیں کر سکتا تھا“ (مقدمہ کتاب مذکور)۔

معلوم نہیں دوسری جلد کا کچھ حصہ لکھ بھی سکے تھے یا نہیں، جہاں تک پہلی جلد کا تعلق ہے اس میں سید صاحبؒ کی صرف چار کتابوں کے علاوہ تمام اہم کتابوں پر تبصرے آ گئے ہیں، ان چار کتابوں میں حیات شبلی، نقوش سلیمانی اور عربوں کی جہاز رانی کے علاوہ ان تصنیفی شاہکار سیرۃ النبیؐ بھی شامل ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ ”سیرۃ النبیؐ“ پر وہ الگ سے ایک مستقل رسالہ لکھنا چاہتے تھے، ان کی ایک تحریر سے (جو اس مجموعہ میں شامل ہے) معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کی پانچوں جلدوں پر

جو حضرت سید صاحبؒ کی تصنیف کردہ ہیں مفصل تبصرہ لکھ چکے تھے لیکن کہیں ان کی اشاعت کا علم نہیں، چنانچہ سیرۃ النبی جلد پنجم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”لرزتے ہوئے دل اور کپکپاتے ہوئے ہاتھ سے خامہ فرسائی شروع کی تو اپنی کج معیاری ساتھ نہ دے سکی، پھر بھی لکھتا چلا گیا، ساتوں جلدوں پر تحریر بڑی لمبی ہو گئی۔“ سیرۃ النبی میں انشاء پرداز کی حیثیت سے“ کے عنوان سے جو مضمون اس مجموعہ میں شامل ہے وہ بہت طویل ہے، جلد پنجم پر تبصرہ بھی بہت مفصل ہے، جلد ششم کا جائزہ اختصار سے لیا گیا ہے، ان کے علاوہ بھی اس مجموعہ کے متعدد مضامین میں پانچوں جلدوں کا تذکرہ وضاحت کے ساتھ کیا گیا ہے۔

انسان کی تحریر کے زور و قوت اور تاثیر میں اس کے اندرونی جذبات و احساسات کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے، وہ خود حضرت سید صاحبؒ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں: ”حضرت سید صاحبؒ نے مولانا محمد علی جوہر اور علامہ اقبالؒ کی وفات حسرت آیات پر جو شذرات معارف میں لکھے ہیں وہ ان کے ادب و انشاء کے سونے کے ٹکڑے سمجھے جاتے ہیں اور سمجھا جانا چاہئے، یہ جذبات سے لبریز ہو کر لکھے گئے ہیں، جب کسی تحریر پر خصوصاً المناک جذبات کا رنگ چھا جاتا ہے تو اس کا مؤثر ہونا لازمی ہے۔“

سید صباح الدین کے مجموعہ مضامین کا بھی یہی حال ہے اس مجموعہ کا ہر مضمون ان کے گہرے جذبات عقیدت کا آئینہ دار اور ان کی سچی محبت کا عکس ہے اسی لئے اس پورے مجموعہ میں ان کی انشاء پردازی کی معراج دیکھی جاسکتی ہے، اور ان کی تحریروں اور تصانیف میں اس مجموعہ میں شامل مضامین کو ان کی انشاء نگاری کا اعلیٰ شاہکار قرار دیا جاسکتا ہے، انہوں نے مختلف مضامین کے ذریعہ حضرت سید صاحبؒ کو اپنی پر خلوص عقیدت کا جو خراج پیش کیا ہے، اور اس کے اظہار میں وقفہ وقفہ سے ان کے قلم نے جو گلکاریاں کی ہیں وہ سب (جہاں تک میرے علم میں ہے) اس مجموعہ میں سمٹ آئی ہیں، اس مجموعہ کے مطالعہ سے قارئین اندازہ کریں گے کہ انہوں نے حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رنگارنگ اور ہشت پہل شخصیت کی مرقع آرائی، ان کے کمالات و امتیازات اور اخلاق کے جلووں کی منظر نگاری اور ان کی متنوع الجہات علمی زندگی کے مختلف

پہلوؤں کی صورت گری میں کس طرح کامیابی حاصل کی ہے، گویا شاعر کے الفاظ میں مصور نے محبوب کی صورت کو معیار کمالات بنا کر دانستہ قلم توڑ دیا ہے، اس مجموعہ میں مباحث کا تکرار ضرور ہے لیکن ہر جگہ پڑھنے والے کو اسلوب کے تنوع اور طرز ادا کی رنگارنگی اور دلکشی کا ایک نیا لطف حاصل ہوا، انہوں نے سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حالات و سوانح زندگی پر کئی سیمیناروں میں مقالات پڑھے اور لکھے لیکن ہر مرتبہ ایک نئے اسلوب میں اس طرح پیش کیا کہ مضمون نیا معلوم ہوتا ہے، انہوں نے حضرت سید صاحبؒ پر جو کچھ تحریر فرمایا حضرت والا کی عقیدت میں ڈوب کر لکھا اور اپنی تحریروں کے ذریعہ حضرت سید صاحبؒ کی عقیدت و محبت کا ایسا چمن لگا دیا جس میں جا بجا ادب و انشاء کے رنگ برنگ پھول کھلے ہیں وہ حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد اپنے اشکبائے غم کے قطروں سے اپنی عقیدت کے چمن کو سیراب کر کے اپنا غم غلط کرتے رہے، جہاں تک رسائی ہوئی ہم نے ان کے تمام گلہائے عقیدت کو یکجا کر دیا ہے۔

ان مضامین میں کئی جگہ بعض الفاظ کی کمی یا بیشی نظر آئی جو ممکن ہے کاتب کی غلطی ہو یا مصنف کا سہو قلم، جہاں کتابت کی غلطیاں واضح نظر آئیں وہاں اصلاح کر دی گئی ہے، اس کے علاوہ کوئی تبدیلی نہیں کی گئی ہے، یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مصنف حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے گہری عقیدت کے باوجود کہیں انہیں علامہ نہیں لکھتے، اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ یہ لفظ خود حضرت سید صاحبؒ کو پسند نہیں تھا، وہ اکثر حضرت استاذی المحترم، یا حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں، اس لئے ہم نے بھی اس مجموعہ کے لئے ان کا یہی نام محبوب نام اختیار کیا ہے۔

ہمیں امید ہے کہ یہ مجموعہ قدر کے ہاتھوں سے لیا جائے گا، اور سید والا کے ساتھ ساتھ ان کے مخلص محب عزیز صاحب کتاب اور مرتب کتاب کے حق میں بھی دعائے خیر کی جائے گی۔

والسلام

العبد الفقیر

طلحہ نعمت ندوی

## علامہ سید سلیمان ندوی (۱)

سید صاحب موصوف کی ولادت ۱۸۸۵ء (۱۳۰۲ھ) میں دیسہ ضلع پٹنہ میں ہوئی، جو صوبہ بہار میں سادات کا ایک مردم خیز گاؤں ہے۔ عربی کی تعلیم اپنے بڑے بھائی مولوی حکیم سید ابوحیب صاحب رضوی مجددی سے شروع کی، پھر ایک برس پھلوری شریف میں اور چند مہینے مدرسہ امدادیہ درجنگہ میں رہے۔ اس کے بعد ۱۹۰۱ء میں لکھنؤ کے دارالعلوم ندوۃ میں داخل ہوئے اور وہیں سات برس رہ کر علوم عربیہ کی تکمیل کی۔ مدرسہ مذکور کے معتمد و ارکان جن میں مولانا سید محمد علی صاحب مونگیری، شاہ سلیمان صاحب پھلوری اور مولانا شبلی نعمانی تھے، موصوف کی ذکاوت و ذہانت کی بنا پر ہمیشہ اُن پر شفقت فرماتے تھے، غالباً ۱۹۰۳ء میں نواب محسن الملک دارالعلوم آئے تھے، اُس وقت شاہ سلیمان پھلوری ندوہ کے معتمد تھے، نواب صاحب نے طلبہ کا امتحان لیا، اور عربی اخبار پڑھوا کر سنا، اس امتحان میں سید صاحب موصوف اوّل آئے، ساتھ ہی انھوں نے نواب صاحب کی مدح میں اپنا عربی قصیدہ پڑھ کر سنایا، نواب صاحب بہت محظوظ ہوئے، اور شاہ صاحب بھی بہت خوش ہوئے۔ اس زمانہ کے اخبارات میں شاہ صاحب نے اس کا حال چھپوایا اور لکھا تھا کہ انشاء اللہ ہر زمانہ میں ایک سلیمان بہار کی سرزمین میں علم اور دین کی خدمت کے لئے موجود رہے گا۔ ۱۹۰۴ء میں مولانا شبلی معتمد ہو کر آئے تو مولانا شبلی نعمانی نے ان کو اپنے دامن تربیت میں لے لیا۔

(۱) مطبوعہ ماہنامہ ندیم (گیا) بہار نمبر ۱۹۴۰ء

سید صاحب کا خاندانی پیشہ طبابت تھا۔ اہل خاندان چاہتے تھے کہ یہ طب پڑھیں مگر موصوف کی طبیعت ادھر مائل نہ تھی، ۱۹۰۸ء میں مولانا شبلی پٹنہ آئے ہوئے تھے، اور جسٹس مولوی شرف الدین صاحب یا مولوی خدا بخش خاں صاحب کے یہاں ٹھہرے تھے کہ اتفاقاً موصوف کے چھوٹے چچا مولوی ابو یوسف صاحب کی ملاقات مولانا سے ہوئی، مولوی صاحب موصوف نے عرض کی، کہ سید سلیمان کو نصیحت فرمائی جائے کہ وہ طب پڑھیں۔ مولانا نے فرمایا: آپ لوگ اس کو کیوں خراب کرنا چاہتے ہیں، اس کو میرے حوالہ کر دیجئے، میں اس کی تربیت کر کے اپنے کام کا بناؤں گا، چنانچہ اس دن سے اہل خاندان نے ان کو مولانا کی نذر کر دیا۔

سید صاحب موصوف کو ادب کا شوق پھلوری کی علمی صحبتوں میں ہوا، درجنگہ جب گئے تو داخلہ کے پہلے ہی ہفتہ میں وہاں کے طلبہ کی انجمن میں ایسی تحریر پڑھ کر سنائی کہ ہر طرف سے تحسین و آفریں کا نعرہ بلند تھا، اور اس ہفتہ کی وہی تحریر اخبار ”المنجی“ میں چھپنے کے لئے بھیجی گئی، سید صاحب کا سب سے پہلا مضمون ”وقت“ کے عنوان سے مخزن لاہور میں ۱۹۰۳ء میں شائع ہوا، اسی سال اپنے وطن کی انجمن الاصلاح کے جلسہ سالانہ میں ”علم اور اسلام“ پر ایک بسیط تقریر لکھ کر پڑھی، جس کو اہل علم نے بہت پسند کیا، چنانچہ وہ تقریر علی گڑھ کے مشہور رسالہ ”علی گڑھ منتقلی میگزین“ میں ایڈیٹر کے تعریفی نوٹ کے ساتھ چھپی، اس کے بعد موصوف کی ادبی شہرت آہستہ آہستہ بڑھنے لگی، اسی زمانہ میں ندوۃ العلماء کی طرف سے ”الندوہ“ نام مشہور علمی رسالہ نکلنا شروع ہوا تھا، جس کے ایڈیٹر مولانا شبلی اور مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی تھے، سید صاحب نے علم حدیث پر پہلا مضمون لکھا جس کی دادمولانا حالی نے مولانا شبلی کو دی۔

۱۹۰۶ء میں اُن کی اور ان کے رفقاء کی دستار بندی کا جلسہ رفاه عام لکھنؤ میں ہوا، فلسفہ جدید و قدیم پر انھوں نے تقریر کی، مجمع بہت بڑا تھا، اہل علم بھی شریک جلسہ تھے، اتفاقاً جلسہ میں سے کسی نے اُٹھ کر کہا، اگر یہ عربی میں تقریر کریں تو جانیں کہ مدرسہ کی تعلیم کیسی

ہے۔ سید صاحب موصوف نے اسی وقت عربی میں ایسی تقریر کی کہ لوگ حیرت میں آ گئے، یہ دیکھ کر مولانا شبلی مرحوم نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ یہ تقریر پہلے سے تیار کر کے لائے ہیں، اگر کوئی صاحب چاہیں تو اسی وقت موضوع مقرر کریں، یہ تقریر کریں گے۔ مولانا شبلی مرحوم نے اپنے خط میں یہ واقعہ خود لکھ کر ۲۴ مارچ ۱۹۰۶ء کو مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کے نام بھیجا ہے:

”جلسہ بڑی کامیابی سے ہوا، سلیمان کی طرف سے درخواست کی گئی کہ فی البدیہہ جو مضمون بتایا جائے اسی وقت اس پر عربی زبان میں لکچر دوں گا۔ غلام الثقلین نے ایک مضمون دیا، اور بغیر ذرا سی دیر کے سلیمان نے نہایت مسلسل فصیح صحیح عربی میں تقریر شروع کی، تمام جلسہ جو حیرت تھا۔ اور آخر لوگوں نے نعرہ ہائے آفریں کے ساتھ خود کہا کہ اب حد ہو گئی۔“ (۱)

استاد نے غایت خوشی میں اٹھ کے اپنے سر سے عمامہ اتار کر شاگرد کے سر پر باندھ دیا، یہ فی البدیہہ عربی میں تقریر ہندوستان میں بالکل نئی بات تھی، تمام ملک میں شور مچ گیا، اور عربی مدرسوں میں ایک انقلاب برپا ہو گیا۔ اور اسی وقت سے مدرسوں میں عربی تحریر و تقریر کا وہ شوق پیدا ہوا، جو آج تک جاری ہے۔

سید صاحب موصوف کو طالب علمی سے ”الندوہ“ کی دیکھ بھال کی خدمت سپرد تھی، اب وہ ۱۹۰۶ء میں اس کے سب ایڈیٹر مقرر ہوئے، ان کے مضامین نے ان کی شہرت کو چار چاند لگا دئے۔ ۱۹۰۸ء میں دارالعلوم میں علم کلام اور جدید ادب عربی کے استاد مقرر ہوئے، دو برس کے بعد مولانا کے قائم کردہ شعبہ ”سیرۃ النبی“ میں ان کے لٹریچر اسسٹنٹ ہوئے، یہ وہ زمانہ تھا جب تمام ہندوستان طرابلس کی جنگ کے ہنگامہ سے پر شور تھا، پھر بلقان کی لڑائی شروع ہو گئی۔ اور مسلمانوں کی سیاسیات کا نقطہ نظر بدل گیا۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ خالص علمی مشاغل کو چھوڑ کر سیاسیات میں آئے۔ مولانا شبلی مرحوم خود بہت

آزاد سیاسیات داں تھے، وہ سرسید کے ساتھ رہ کر بھی سیاست میں ان سے الگ اور ملک کی آزادی کے حامی تھے۔ اور اسلامی سیاسیات میں اتحاد اسلامی پر ایمان رکھتے تھے۔ اور وہ سب سے پہلے مسلمان عالم تھے جنہوں نے اسی جذبہ میں ۱۸۸۶ء میں ترکی کا سفر کیا۔ یہی اثر ان کے شاگردوں پر ہے۔

جب ۱۹۰۹ء-۱۹۱۰ء میں مولانا ابوالکلام نے جو خود بھی مولانا شبلی کے ہم نشین اور صحبت یافتہ ہیں، کلکتہ سے ”الہلال“ نکالا جس کی دعوت بعینہ یہی تھی تو اس موقع پر سید صاحب موصوف علمی و تعلیمی مشاغل کو چھوڑ کر ۱۹۱۰ء میں الہلال کے اسٹاف میں داخل ہو گئے، اور اس کے اصلی ہیجان کے زمانہ میں اُس کے مضامین میں شریک رہے۔ بلقان اور مسجد کانپور کے زمانہ میں وہ کلکتہ میں مولانا ابوالکلام کے ساتھ سرگرم عمل رہے۔ الہلال میں واقعہ کانپور پر ”مشہد اقدس“ کے عنوان سے سید صاحب نے جو مضمون لکھا تھا وہ بڑا انقلاب انگیز تھا، گورنمنٹ نے اس کو ضبط کر لیا۔

واقعات کے سکون کے بعد وہ پھر دفتر سیرت میں آ گئے، اور یہاں سے ۱۹۱۲ء میں مولانا کے حکم سے بمبئی یونیورسٹی کے ماتحت دکن کالج پونہ میں السنہ مشرقیہ کی معتمدی قبول کی۔ ابھی دو برس بھی نہیں گزرے تھے کہ نومبر ۱۹۱۳ء میں مولانا شبلی نے انتقال کیا۔ مرتے دم شاگرد کو تار دے کر بلوایا اور وصیت کی کہ وہ سب کام چھوڑ کر سیرۃ النبی کی تکمیل کریں، جس کو وہ ناتمام و نامرتب چھوڑ گئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے استاذ کی وصیت کے مطابق سرکاری نوکری سے استعفا دیدیا، اور اُس وقت سے لے کر آج تک اس کام کے انجام میں مصروف ہیں۔ اور اس وقت تک اس کی چھ ضخیم جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ یہ جلدیں اسلامی معلومات کا خزانہ اور جدید علم کلام کی اساس ہیں۔

موصوف کی سب سے پہلی تصنیف دروس الادب نام عربی کی دو ریڈریں ہیں۔ ۱۹۱۲ء میں مولانا شبلی کے اشارہ سے لغات جدیدہ کے نام سے انہوں نے جدید عربی الفاظ کی ڈکشنری لکھی، اس کے بعد ارض القرآن کی دو جلدیں لکھیں۔ پہلی ۱۹۱۵ء اور دوسری



۱۹۱۸ء میں، اس کتاب نے ہندوستان کے علمی حلقہ میں ہلچل ڈال دی۔ بعد ازاں نواب سلطان جہاں بیگم والیہ بھوپال کی فرمائش سے ۱۹۲۰ء میں سیرت عائشہ لکھی۔ ان تصانیف کے ساتھ ساتھ ملک کے دیگر علمی و تعلیمی و مذہبی مدارس و مجالس کی خدمات بھی بجالاتے رہے۔ ۱۹۱۵ء میں انجمن ترقی اُردو کے سالانہ اجلاس منعقدہ پونہ کی صدارت کی۔ اور اس میں وہ خطبہ صدارت پڑھا جو آگے چل کر اُردو کی تاریخ پر تحقیق کرنے والوں کے لئے پیش خیمہ ثابت ہوا۔

۱۹۱۴ء کے آخر میں ٹرکی نے جب جنگ عظیم میں شرکت کی، تو مسلمانوں میں ہيجان ہوا۔ اور بڑے بڑے مسلمان ارباب فکر قید و بند میں ڈالے گئے۔ اس موقع پر جونیا گروہ ان کی قائم مقامی کے لئے بڑھا ان میں ایک شخصیت ان کی بھی ہے۔ ۱۹۱۵ء سے لے کر ۱۹۱۶ء تک انھوں نے مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی سیاسی تحریکات میں شمولیت کی، ۱۹۱۷ء میں مجلس علمائے بنگالہ کلکتہ کے نہایت اہم اجلاس سالانہ کی صدارت کی، جس میں تمام رہنمایان ہند شریک تھے۔ اُس سال اسی کے ساتھ کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس بھی انہیں تاریخوں میں کلکتہ میں تھے۔ اس لئے مجلس علمائے بنگالہ کا یہ اجلاس بڑا اہم تھا۔ اس اجلاس میں موصوف نے جو خطبہ پڑھا وہ بنگال میں بڑا اثر انداز ہوا۔ یہ پہلا خطبہ تھا جس میں جنگ کے ہیبت ناک اثرات کے باوجود مولانا ابوالکلام وغیرہ کا نام جو اس زمانہ میں نظر بند تھے جرأت کے ساتھ لیا گیا۔ اور لوگوں کے دلوں سے رعب اٹھا۔

۱۹۱۹ء میں خلافت کے سب سے پہلے اجلاس لکھنؤ میں ممتاز شرکت کی، بلکہ علماء اور خالص ارباب سیاست کے درمیان حلقہ اتصال کا کام دیا۔ اور ایسی پر جوش تقریر کی کہ مسند صدارت سے پائیں تک ساری مجلس بزم ماتم بن گئی، اور مولانا عبدالباری مرحوم اور چودھری خلیق الزماں صاحب وغیرہ کے سارے اختلافات کے خس و خاشاک اس سیل نم میں بہ گئے۔

فروری ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی کی سرکردگی میں معاملات ٹرکی میں انصاف طلبی اور

مسلمانان ہند کے مطالبات کی تشریح کے لئے جو خلافت ڈیپوٹیشن یورپ بھیجا گیا اس کے تین ممبروں میں ایک ممبر وہ منتخب ہوئے۔ اس وفد کے ساتھ اٹلی، فرانس، اور انگلستان میں حقوق ٹرکی کے لئے زبان و قلم اور دعوت و اشاعت کے ذریعہ سے لڑتے، اور وہاں کے وزراء، ارباب سیاست اور آزاد مسلمانوں کے گروہ درگروہ سے جو فرانس، سوئزر لینڈ اور اٹلی میں تھے ملتے اور تحریکات میں شمولیت کرتے رہے۔

۱۹۲۰ء کے آخر میں یورپ کے سفر سے واپس آ کر وہ کانگریس میں داخل ہوئے۔ اور ترک موالات کی تحریک میں دیگر علماء و وزراء کے ساتھ مل کر ملک کا دورہ کیا۔ خلافت کے اجلاس سالانہ منعقدہ میرٹھ میں صدر ہوئے۔ اور دوسری سیاسی مجلسوں میں شرکت کی۔ اخبارات میں مضامین لکھے۔ پلیٹ فارموں پر تقریریں کیں۔ ۱۹۲۱ء کی کانگریس احمد آباد میں اس کی ورگنگ کمیٹی کے ممبر منتخب ہو کر سال بھر تک کانگریس کے کاموں میں شریک رہے۔ اسی طرح خلافت اور جمعیتہ العلماء کی مجلس عاملہ کے رکن مقرر ہوئے۔ اور ۱۹۲۲ء تک اس کے جزء وکل میں شریک رہے۔

۱۹۲۲ء میں ابن سعود اور شریف حسین میں جب جنگ کا آغاز ہوا۔ اور دونوں نے مجلس خلافت کی طرف ہاتھ بڑھایا، تو مسلمانان ہند نے موصوف کی صدارت میں ایک وفد حجاز کو بھیجا، تاکہ وہ فریقین کے سامنے مجلس خلافت کی تجاویز کو پیش کرے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے دو ماہ جدہ میں جنگ کے زمانہ میں رہ کر مفوضہ فرائض کو انجام دیا۔ اور بڑی دلیری سے شریف حسین اور سلطان ابن سعود کی حکومتوں سے حجاز میں عربوں کی ایک جمہوری حکومت کے قیام کے مسئلہ میں گفتگو اور خط و کتابت کرتے رہے۔ اور جب اس میں ناکامی ہوئی تو خدیوی میل پر حجاز سے مصر کا سفر کیا، اور وہاں کے علماء اور اکابر سے مل کر حجاز کے معاملہ پر گفتگو کی۔ اس گفتگو کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ ازہر نے ان تجاویز پر اپنی رضامندی ظاہر کی، یہ اس وفد کی ایسی کامیابی تھی کہ ریوڑ نے اس کی خبر مصر سے ہندوستان بھیجی، اور دنیا کے دوسرے شہروں میں مشتہر کی۔

مارچ ۱۹۲۶ء میں کلکتہ میں جمعیت العلماء کا جواہم سالانہ اجلاس ہوا، اس کے وہ صدر منتخب ہوئے۔ اس موقع پر موصوف نے جو خطبہ صدارت پڑھا، وہ ہندوستان کے اسلامی سیاسیات میں یادگار ہے۔ اسی سال وہ پھر دوسرے وفد حجاز کے صدر منتخب ہوئے۔ یہ ہندوستان میں شدھی اور سنگٹھن کے زور کا زمانہ تھا۔ اس موقع پر دہلی میں مجلس خلافت کا خاص اجلاس ہوا اور حکیم اجمل خاں مرحوم کی تحریک پر موصوف نے اس کی صدارت کی۔ اس اجلاس میں موصوف نے ہندو مسلمان تعلقات کی نسبت مسلمانوں کے نقطہ نظر کو علی الاعلان پیش کیا۔

اس کانفرنس سے فارغ ہو کر وہ حجاز کا وفد خلافت لے کر جس کے ممبر مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور شعیب قریشی تھے، حجاز کو روانہ ہوئے۔ اس وقت سلطان ابن سعود نے تمام دنیا سے مسلمانوں کی کانفرنس مکہ معظمہ میں طلب کی تھی۔ ٹرکی، مصر، افغانستان، یمن اور دوسرے اسلامی ملکوں کے نمائندے شریک اجلاس تھے۔ اور چند ہفتوں تک برابر اس کے اجلاس ہوتے رہے۔ تمام دنیا کے نمائندوں نے بہت بڑی اکثریت سے موصوف کو اس اجلاس کا وائس پریسیڈنٹ (نائب الرئیس) منتخب کیا۔ اور متعدد دفعہ انھوں نے صدر اجلاس کی غیر حاضری میں اس اسلامی موتمر کے جلسوں کی صدارت کی۔ اسی سفر میں حجاز کے معاملات اور ابن سعود کے تسلط کی موافقت و مخالفت کے مسائل میں وہ اپنے رفقاء مولانا محمد علی صاحب وغیرہ سے اختلاف رائے کی بناء پر سیاسیات سے کنارہ کش ہو کر خالص اصلاحی و علمی و تعلیمی کاموں میں مصروف ہو گئے۔

سید صاحب موصوف کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ دارالمصنفین ہے۔ جو مولانا شبلی کی یادگار میں ۱۹۱۴ء میں مولانا شبلی کے موطن و مدفن اعظم گڑھ میں قائم ہوا۔ اس ادارہ نے اسلامی علوم و فنون پر بہت سی کتابیں ہمارے نوجوانوں کے لئے شائع کی ہیں۔ ”معارف“ اس کا ماہوار رسالہ ہے، جو پچیس برس سے ان کی ایڈیٹری میں نکل رہا ہے۔ دارالمصنفین اس وقت جو کچھ علمی خدمات انجام دے رہا ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔

۱۹۳۳ء میں ہنرمند شاہ نادر خاں کی دعوت پر ڈاکٹر سراقبال اور نواب سر اس مسعود کے ساتھ کابل یونیورسٹی کے قیام کے مشوروں کے لئے کابل گئے۔ اور وہاں حکومت کے مہمان رہے۔ اور اسی سلسلہ میں غزنی اور قندھار کا سفر کیا۔ ۱۹۳۵ء میں ریاست حیدرآباد دکن نے ضابطہ فوجداری شرعی کی تدوین کی خدمت ان کو سپرد کی، جس کو بخوبی انجام دیا۔ ریاست نے اس ضابطہ پر نظر ثانی کرنے کیلئے ایک کمیٹی مقرر کی۔ جس میں ایک سابق جج ہائیکورٹ، مفتی ریاست اور آپ تھے۔ اس کمیٹی نے ایک مہینہ میں اپنا کام پورا کیا۔

ادھر مدت کی سیاسی خاموشی کے بعد فلسطین کے مسئلہ میں انھوں نے اپنی آواز بلند کی، اور ۱۹۳۶ء کی آل انڈیا فلسطین کانفرنس دہلی کی صدارت کی۔ اس موقع پر جو خطبہ انھوں نے پڑھا اس نے سارے ملک بلکہ دنیائے اسلام میں تہلکہ مچا دیا۔ مصر اور شام کے اخبارات نے اس کے ترجمے چھاپے، مجلس اعلیٰ فلسطین کے صدر سید امین الحسینی نے تار سے ان کا شکریہ ادا کیا۔

اب وہ زیادہ تر علمی و تعلیمی معاملات میں حصہ لیتے ہیں۔ ۱۹۳۷ء میں ہندوستانی ایکادمی کی ادبی کانفرنس لکھنؤ کی صدارت کی، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معتمد، علی گڑھ یونیورسٹی کورٹ، ہندوستانی اکادمی الہ آباد، مدرسہ اکزامنیشن بورڈ پٹنہ، ہندوستانی کمیٹی حکومت بہار اور جامعہ ملیہ دہلی کے ممبر ہیں۔

اردو زبان اور اردو ادبیات سے ان کو ہمیشہ ذوق رہا ہے، ان کے قلم کی نگلی ہوئی تحریریں ادب اردو کا اعلیٰ نمونہ سمجھی جاتی ہیں، ہندوستانی زبان کی تحریک کی بنا انہی نے ڈالی ہے جو آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی ہے۔ اس وقت تک ان کی جو تصنیفات شائع ہو چکی ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں:

دروس الادب (عربی ریڈر)، لغات جدیدہ (جدید عربی لغات)، ارض القرآن دو جلدیں، سیرت عائشہ، سیرۃ النبی کی پانچ ضخیم جلدیں، حیات امام مالک، خطبات مدراس، عرب و ہند کے تعلقات، عربوں کی جہاز رانی، خیام، خلافت اور تعلیم کے موضوع پر

چند رسالے اور بے شمار علمی و ادبی مضامین اور ابھی حال میں ان کے ادبی مضامین کا مجموعہ ”نقوش سلیمانی“ کے نام سے چھپا ہے۔ ان کتابوں میں سے سیرت عائشہ اور سیرۃ النبیؐ کے ترجمے ترکی اور فارسی میں، اور خطبات مدراس، عرب و ہند کے تعلقات اور عربوں کی جہاز رانی کے ترجمے انگریزی میں کئے گئے ہیں، خیام کی داد ہندوستان سے لے کر ایران و کابل اور یورپ تک کے فضلاء نے دی، فردوسی کی ہزار سالہ برسی کے موقع پر افغانستان نے ایران کو جو تحائف دئے، ان میں ایک تحفہ ”خیام“ بھی تھا، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے اس کو سال کی بہترین کتاب قرار دیکر اس پر مصنف کو پانچ سو روپے انعام دئے، خطبات مدراس، عرب و ہند کے تعلقات اور عربوں کی جہاز رانی درحقیقت علمی خطبات کے مجموعے ہیں، پہلا مجموعہ خطبات مدراس میں وہاں کی اسلامی جنوبی کانفرنس کی فرمائش پر ۱۹۲۶ء میں دیا گیا تھا، یہ مجموعہ ملک میں بے حد مقبول ہوا، اور کئی دفعہ چھپ کر شائع ہو چکا ہے، اس خطبہ کے معاوضہ میں کانفرنس مذکور نے ایک ہزار کی رقم پیش کی۔ دوسرا مجموعہ جو عرب و ہند کے تعلقات پر ہے ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد کی فرمائش پر ۱۹۲۹ء میں پڑھا گیا تھا۔ اس کا ترجمہ ہندی اور انگریزی میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ اکاڈمی نے اس خطبہ کا معاوضہ ایک ہزار ادا کیا، تیسرا مجموعہ جو عربوں کی جہاز رانی پر ہے ۱۹۲۱ء میں بمبئی کی وزارت تعلیم کی سرپرستی میں بمبئی کی انجمن اسلامیہ ہال میں سنایا گیا تھا جس کے معاوضہ میں گورنمنٹ نے پانچ سو روپے پیش کئے۔

اعلیٰ حضرت سرکار عالیہ بیگم صاحبہ مرحومہ بھوپال کی فرمائش پر آپ نے سیرت عائشہ لکھی جس کے معاوضہ میں سرکار عالیہ مرحومہ نے پانچ سو روپے انعام مرحمت فرمایا۔ اعلیٰ حضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہ نے کئی بار آپ کو شرف باریابی بخشا اور اپنے دست مبارک سے آپ کو لطف نامے لکھ کر علم و فضل کی قدر بڑھائی اور ۱۹۳۸ء سے از خود ازراہ کمال قدر دانی سو روپے ماہوار کا منصب عطا فرمایا۔

## استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی

### کی رحلت پر ہم پر کیا گزری (۱)

۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء مطابق ۱۴ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ کا دن گزار کر عشاء کی نماز کے بعد حسب معمول خبریں سننے کے لیے ریڈیو کھولا، پونے نو بجے جب پاکستان سے انگریزی خبریں شروع ہوئیں تو اہم خبروں میں دوسری خبر یہ سنی کہ ہم دلی رنج و الم کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ: ”ابھی کچھ دیر پہلے علامہ سید سلیمان ندوی کا انتقال ہو گیا“۔

سننے ہی چیخ اٹھا اور کرسی سے لڑکھڑا کر فرش پر گر پڑا، اہلیہ پاس ہی ایک پلنگ پر بیٹھی تھیں، گھبرا کر پوچھنے لگیں ”کیا ہوا کیا ہوا“ میں نے چیختے ہوئے کہا کہ ”سید صاحب..... کا انتقال..... ہو گیا“ وہ چیختی ہوئی کمرے سے نکل پڑیں کہ ہائے چھوٹے نانا کا انتقال ہو گیا..... میں فرش سے اٹھ کر اندر گھر جانے کے بجائے زار و قطار روتا ہوا برادر محترم جناب شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی کے کمرے کی طرف دوڑا، اور قریب پہنچ کر چلایا:

شاہ صاحب! سید صاحب..... سید صاحب.....

شاہ صاحب نے پوچھا کیا ہوا..... خیریت تو ہے،

میں نے روتے ہوئے کہا ”سید صاحب کا انتقال ہو گیا“۔

اتنا سننا تھا کہ اُن کے منہ سے بھی چیخ نکل گئی اور وہ مجھ سے لپٹ گئے کہ ”آہ یہ کیا

(۱) یہ معارف جنوری ۱۹۵۴ء کے شمارہ ”آہ استاذی المحترم ہم پر کیا گزری“ کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔

ہو گیا“ میں دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا، شاہ صاحب مجھ کو چھوڑ کر سر پکڑ کر بستر پر بیٹھ گئے ہماری آوازیں سن کر استاذی المحترم مولانا عبدالسلام ندوی بغل کے کمرے سے یہ کہتے ہوئے نکل آئے: ”ہیں، کیا ہے، کیا ہے“ شاہ صاحب بہ مشکل تمام اُن سے یہ کہہ سکے کہ: ”سید صاحب جنت کو سدھارے“

مولانا ہنگامہ ہو کر رہ گئے، پوچھا کس نے کہا اور کہاں سے خبر آئی، شاہ صاحب نے کہا کہ ابھی ریڈیو سے معلوم ہوا ہے، مولانا کہنے لگے ”مجھ کو چکڑا رہا ہے“ اور وہیں تخت پر بیٹھ گئے اور میں اس گہری کرسی پر جو سید صاحب نے شاہ صاحب کو دی تھی، بیٹھ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، مولانا عبدالسلام صاحب نے غایت شفقت و محبت میں مجھ سے کہا: ”صبر کیجئے صبر، اتنا نہ رویئے“

میں نے اُن سے گستاخانہ طور پر بلند آواز میں کہا ”مجھے رونے دیجیے، صبر کی تلقین نہ کیجیے۔“

شاہ صاحب کے کمرے میں بہ مشکل دس منٹ ٹھہرا ہوں گا کہ غایت اضطراب میں وہاں سے نکل کھڑا ہوا، وہ مجھ کو آواز دیتے رہے لیکن میں اپنے گھر کی طرف بھاگا، وہاں کہرام مچا ہوا تھا، عورتیں، بچے سب رو رہے تھے، ریڈیو سے خبریں جاری تھیں اور اب پاکستان سے اردو میں خبریں دہرائی جا رہی تھیں۔

پھر ایک بار سید صاحب کی رحلت کی خبر سنی، جی چاہا ریڈیو توڑ ڈالوں کہ کیا اسی المناک خبر سننے کے لیے اس کو رکھا تھا اور جلدی سے اس کو بند کر دیا، اب روتے روتے ہچکیاں آنے لگی تھیں، آہ یہ وہی کمرہ ہے جہاں سید صاحب نے اپنی زندگی کے سولہ سترہ سال گزارے تھے، اب یہ ویسا آراستہ اور بارونق تو نہیں ہے لیکن اُن کی بعض یادگاریں اب تک یہاں محفوظ ہیں۔

بے قرار ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگا، دیوار پر اُن کی یادگاروں میں سے شیشہ کے چوکھٹوں پر نظر پڑی، ایک چوکھٹے میں خط کوفی میں ”لا إله إلا الله محمد رسول الله“ لکھا

نظر آیا، میں دل میں کہنے لگا کہ آہ! آج اُس کی تفسیر لکھنے والا چل بسا اور خیال آیا کہ سید صاحب نے ایک بار فرمایا تھا کہ:

”لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ سیرۃ النبی کو چھ جلدوں میں لکھنے کی کیا ضرورت تھی، اصل سیرت تو پہلی دو جلدوں میں ختم ہو گئی ہے، جواب دیتا ہوں کہ پہلی دو جلدوں میں تو صرف یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیا تھے اور باقی چار جلدوں میں یہ ہے کہ محمد ﷺ اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے کیا پیغام لائے اور کیا تعلیم دی۔“

گویا تمام جلدوں میں ”لا إله إلا الله محمد رسول الله“ ہی کی شرح لکھی گئی ہے، ایک دوسرے چوکھٹے پر نگاہ پڑی تو خط طغرائیں ”محمد“ لکھا تھا، میری زبان سے نکلا محمد کا سیرت نگار اب محمد کی آغوش رحمت میں ہوگا، پھر خیال آیا کہ سید صاحب نے ایک مرتبہ اسی کمرے میں فرمایا تھا کہ میں نے اسی کمرے میں خواب میں دیکھا کہ حضور ﷺ جلوہ افروز ہیں اور سیرۃ النبی کے اوراق الٹ پلٹ کر دیکھ رہے ہیں اور مسکرا رہے ہیں، یہ واقعہ یاد کر کے میرے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا کہ اللہ اکبر! یہ کمرہ کس قدر مقدس اور بابرکت ہے اور میری نظر ادھر ادھر دوڑنے لگی کہ کہیں کوئی بے ادبی تو نہیں ہو رہی ہے۔

بے قراری میں پھر ٹہلنے لگا، یکا یک میری نظر ان چوکھٹوں پر بھی پڑی جن میں امجد حیدر آبادی کی رباعیاں لکھی ہوئی تھیں، ان رباعیوں کا ایک مصرع یہ بھی تھا: اک چشم زدن میں کیا سے کیا ہوتا ہے

اس کو بار بار دہراتا رہا کہ آہ! سید صاحب کی رحلت سے کیا سے کیا ہو گیا، اسلامی دنیا ایک بڑی دولت سے محروم ہو گئی، ایک بڑی نعمت فرش زمیں سے عرش بریں کی طرف منتقل ہو گئی، دارالمصنفین یتیم ہو گیا، گوئی سال سے وہ ہم سے دور کراچی میں تھے لیکن انھوں نے ہم لوگوں کو اپنے قلب و جگر کا ٹکڑا ہی بنا رکھا تھا اور وہ بھی ہم لوگوں کے دل و دماغ پر چھائے رہتے تھے۔

پھر اشک بار آنکھوں کے ساتھ بستر پر لیٹنے کی کوشش کی لیکن ایسا معلوم ہوا کہ وہ خود مسہری پر لیٹے ہوئے ہیں، میں بستر پر لیٹ نہ سکا، بیٹھا رہا اور ایسا نظر آیا کہ وہ مسہری سے اتر کر نیچے اپنے خوش رنگ اور خوش وضع قالین پر بیٹھے ہیں اور ان کا چاند جیسا چمکتا چہرہ نگاہوں کے سامنے ہے، دارالمصنفین کے رفقاء ان کے ارد گرد مودب بیٹھے ہیں اور وہ حسب معمول مذہبی اور اخلاقی درس دے رہے ہیں، علمی نکتے بیان کر رہے ہیں اور تصوف کے اسرار فاش کر رہے ہیں، اس تصور سے بے چین ہو گیا اور وہ ساری مجلسیں نگاہوں میں گھومنے لگیں جو اس کمرے میں ہوتی رہتی تھیں اور یاد آیا کہ وہ اکتوبر ۱۹۳۵ء میں جب ذات الجنب کے مرض میں مبتلا ہوئے تھے، تو اسی کمرے میں رہتے تھے، میں اسی سال نیا نیا دارالمصنفین آیا تھا، تمام لوگوں نے بڑی دل سوزی اور محبت سے ان کی تیمارداری کی تھی، پھر ۱۹۴۳ء کے مارچ میں یہیں قلب کے مرض میں مبتلا ہوئے تھے، جس میں دوبارہ کراچی میں مبتلا ہو کر اللہ کو پیارے ہوئے، یہاں بھی ان کا قلب بڑھ گیا تھا اور ایسی تکلیف تھی کہ چھتیس گھنٹے مسلسل کھڑے رہ گئے تھے، بیٹھنے اور لیٹنے میں تکلیف ہوتی تھی لیکن یہاں مجی ڈاکٹر عبدالحفیظ انصاری نے بڑی تن دہی اور محنت سے علاج کر کے مرض پر قابو پا لیا تھا، خیال آیا کہ اگر کراچی کے بجائے اعظم گڑھ میں بیمار پڑتے تو پھر ڈاکٹر عبدالحفیظ ان کو اچھا کر لیتے، لیکن مشیت ایزدی اور ہی تھی۔

اب میرے آنسو تو تھم چکے تھے، لیکن دل میں رنج و الم کا تلاطم بپا تھا، مومن کا یہ شعر زبان پر آ گیا:

بے نالہ منہ سے جھڑتے ہیں بے گریہ آنکھ سے

اجزائے دل کا حال نہ پوچھ اضطراب میں

میں تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گیا اور سکون پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن کسی طرح طبیعت قابو میں نہ آئی، غم کا پہاڑ ٹوٹا پڑتا تھا، بار بار اٹھ کر بیٹھ جاتا تھا اور یہ حال تھا کہ:

تاثیر صبر میں اثر اضطراب میں

بالآخر گاؤ تکیہ سے لگا کر بستر پر نیم دراز ہو گیا، میرا سر قبلہ کی طرف تھا، بائیں طرف زنان خانہ کا وہ برآمدہ تھا جس میں سید صاحب عموماً مغرب کے بعد آکر بیٹھا کرتے تھے اور یہیں ان کی خانگی مجلس منعقد ہوتی تھی، یہ مجلسیں نظروں کے سامنے گھومنے لگیں۔

ان کا معمول تھا کہ صبح ناشتہ کے بعد کتب خانے میں میز پر بیٹھ جاتے اور جب تک کام کرتے دنیا و مافیہا سے بے خبر رہتے، دو قدم پیچھے دیوار سے لگی ہوئی گھڑی گھنٹے پر گھنٹہ بجاتی رہتی لیکن ان کو مطلق خبر نہ ہوتی کہ کتنے گھنٹے گزر گئے، دوپہر کے کھانے پر ہم لوگ آکر بیٹھ جاتے لیکن ان کا اشبہ قلم دوڑتا ہی رہتا، آدمی پر آدمی بلانے کے لیے جاتا لیکن وہ قلم نہ چھوڑتے اور سب سے آخر میں بادل نا خواستہ اٹھ کر آتے، کھانے میں شریک ہوتے، پھر گھر چلے جاتے اور اپنے کمرہ میں آکر قیلولہ فرماتے، جس میں یہ سیہ بخت اس وقت لیٹا ہوا تھا، تھوڑی سی چھکی لینے کے بعد اٹھتے، وضو کرتے، مسجد میں ظہر کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرتے، پھر کتب خانے میں آکر بیٹھ جاتے اور عصر تک اسی انہماک کے ساتھ کام میں مشغول رہتے، عصر کی نماز کے بعد چائے پر دارالمصنفین کے تمام رفقاء ان کے پاس جمع ہو جاتے، ان کے انشراح کا یہی وقت ہوتا تھا، بڑی محبت و شفقت سے باتیں کرتے، زیادہ تر مذہبی، علمی اور سیاسی مسائل پر گفتگو ہوتی، ان کی مذہبی اور علمی گفتگو ہم لوگ ہمہ تن گوش ہو کر سنتے اور ایسا معلوم ہوتا کہ ہم سب پر الہام ہو رہا ہے، وہ چند فقروں میں علمی حقائق اس طرح بتا دیتے کہ علوم کا دفتر نگاہ کے سامنے کھل جاتا، خود مجھ کو ذاتی تجربہ ہے کہ جب کوئی علمی یا تاریخی گتھی ان کے سامنے پیش کی تو وہی چار فقروں میں پوری گتھی سلجھا دیتے، کسی مضمون کا خاکہ یا کسی کتاب کی ترتیب ان کی مختصر سی ہدایتوں پر مکمل طور سے ذہن میں آجایا کرتی تھی، ہاں سیاسی موضوع پر البتہ ان سے بے تکلفانہ گفتگو ہوتی تھی، اس میں اظہار خیال کی پوری آزادی تھی اور اپنی رائے کے مخالف خیال کو بھی پوری توجہ اور مسرت سے سنتے تھے، مغرب کے قریب یہ مجلس ختم ہو جاتی اور سید صاحب اپنی سب سے چھوٹی اولاد کو گود میں لے کر دارالمصنفین کی اندرونی گول سڑک پر ایک دو چکر لگاتے، یہی ان کی گویا روزانہ

کہ جسمانی ورزش تھی، مغرب کی نماز اور نفلیں پڑھ کر زنان خانے میں چلے جاتے اور اس وقت ان کی خانگی مجلس ہوتی، یہی روزانہ کی مجلس میرے بستر پر آنکھوں کے سامنے تھیں۔

گھر میں ایک کھڑی چار پائی پر آکر لیٹ جاتے، ان کے چھوٹے صاحب زادے سلمان سلمہ جب تک محض بچے رہے ان کے پہلو میں آکر سینے سے چٹ جاتے، کبھی پیٹ پر بھی لیٹ رہتے، ان کی دو چھوٹی بہنیں بھی پہنچ جاتیں، سلمان کو جن کا گھریلو نام ٹوٹوں میاں تھا اس کا احساس تھا کہ وہ والد کے بہت چہیتے ہیں، اس لیے چھوٹی بہنوں پر جابرانہ حکومت قائم رکھنا چاہتے تھے، جب چھوٹی بہنیں سید صاحب سے ان کی زیادتیوں کی فریاد کرتیں تو میٹھے اور دھیمے لہجے میں فرماتے:

”ٹوٹوں میاں آپ طاغوتی حرکت کرتے ہیں۔“

اور یہ کہہ کر مسکرا دیتے اور اگر بچیاں کبھی حدود سے آگے بڑھ جاتیں تو کہتے:

”آپ لوگ شرارت کریں گی تو آپ کے ابا باہر چلے جائیں گے، پھر آپ اپنے

ابا کے پاس کیسے بیٹھیں گی۔“

اپنے بچوں کو بھی ”آپ“ ہی کہہ کر مخاطب کرتے اور ان کو ڈانٹنے اور جھڑکنے میں بھی ان کی فطری متانت، سنجیدگی اور شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹا اور ان کو بہلانے یا پھسلانے میں بھی کوئی ایسی بات نہ کہتے جس میں غلط بیانی ہوتی، جب کبھی ان کو کوئی کہانی سناتے تو وہ بھی سچی اور سبق آموز ہوتی، اس مجلس میں ان کی دونوں بڑی لڑکیاں اور بیگم صاحبہ بھی آکر شریک ہو جاتیں، مجھ کو بھی اکثر و بیش تر اس میں شرکت کی سعادت حاصل ہوتی، اس وقت زیادہ تر تفریحی گفتگو ہوتی، بڑی لڑکیاں کبھی کبھی خانگی یادگار المصنفین کی اجتماعی زندگی کے کسی ناخوشگوار واقعہ کی طرف اشارہ کرتیں تو سید صاحب برہمی ظاہر کرتے اور فرماتے یہ میری تفریح کا وقت ہے، اس کو آپ لوگ ملکہ نہ کریں، اگر کسی دن کوئی ناخوشگوار واقعہ بیان کیا جاتا تو فرماتے:

”آپ لوگ اپنی شکایت بیان کر یا غیبت کرنا چاہتی ہیں، اگر شکایت ہے تو مجھ

سے کہنا فضول ہے، میں کیا چیز ہوں، پھر غیبت میں کیوں مبتلا ہوتی ہیں، میرا طریقہ تو یہ ہے کہ دکھ پہنچانے والے کے لیے بھی اچھے ہی الفاظ استعمال کرتا ہوں، بلکہ اس کے لیے دعائے خیر کرتا ہوں۔“

ایک بار اسی خانگی مجلس میں ہم سب سے مخاطب ہو کر فرمایا:

”آپ لوگ کسی کے حلقہٴ ارادت میں تو داخل نہیں ہیں لیکن مظلومیت کے موقع

پر خوش رہیں تو تصوف کی بہت سی منزلیں آسانی سے طے ہو جائیں۔“

۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۹ء تک برابر مجھ کو ان کی خانگی مجلسوں میں شریک ہونے کی

سعادت حاصل ہوتی رہی اور ان ہی مجلسوں میں ان کی اصلی عظمت کا سکھ میرے دل پر بیٹھا، ان میں محبت و شفقت، لہجہ و نرمی، حلم و بردباری، تہذیب و شائستگی، عجز و انکسار اور عفو و درگزر کے ایسے ایسے جلوے دیکھنے میں آئے کہ میں جتنا زیادہ ان سے قریب ہوتا گیا ان کا والد و شفیق ہوتا گیا اور ان کے اوصاف کو دیکھ کر رسول اللہ (ﷺ) کی ذات اقدس سے محبت و عقیدت بڑھتی گئی کہ رسول کے ایک سیرت نگار میں جب اتنے اوصاف ہیں، تو پھر خود رسول (ﷺ) کی ذات بابرکات میں کیا کیا اخلاق و فضائل نہ ہوں گے۔

یہ تمام باتیں بستر پر یاد آ رہی تھیں اور یہ ساری مجلسیں، متحرک تصویروں کی طرح نظروں کے سامنے گھوم رہی تھیں۔

میں سوچنے لگا کہ وہ دار المصنفین میں بیس تین سال رہے، وہ یہاں کے آفتاب تھے، لیکن اپنے کو ذرہ ہی بنا کر رکھا، وہ یہاں کے حاکم اعلیٰ تھے لیکن خادم ادنیٰ کر اس کی خدمت کرتے رہے، ان ہی کے فیض سے ہم میں سے ہر شخص بن گیا تھا، لیکن انھوں نے اپنے کو مٹا مٹا کر رکھنا ہی پسند کیا۔

ان ہی خیالات میں گم رات بھر کروٹیں بدلتا رہا کہ یکا یک شہر کی کسی مسجد سے فجر کی اذان سنائی دی، میں ایک لمحہ کے لیے بھی نہ سو سکا تھا، لیکن مطلق کوئی مکان نہ تھی، رات بھر گویا ہجر کی کلفت کے بجائے وصل کی لذت ہی میں گزری، اذان کی آواز سنتے ہی اٹھ گیا

اور سوچا کہ آج مصلیٰ بچھا کر اسی جگہ فجر کی نماز ادا کروں گا جہاں سید صاحب تہجد کی نماز پڑھا کرتے تھے، یہ جگہ اس وقت بڑی متور نظر آئی، چنانچہ وہیں پر نماز پڑھنے لگا اور فرض کے بعد جب دعا کے لیے ہاتھ اٹھے تو بے اختیار زبان پر یہ الفاظ جاری ہو گئے۔

”اے رسول کے سیرت نگار! اب تو بارگاہ رسالت میں پہنچ چکا ہے، فرشتوں نے تیرا شاندار خیر مقدم کیا ہوگا، حوروں نے جنت الفردوس کے پھول برسائے ہوں گے، جنت نعیم میں امام ابن تیمیہ تیرے لیے چشمِ براہ ہوں گے، امام غزالی تجھ کو اپنے پہلو میں جگہ دینے کے لیے بے قرار ہوں گے، شاہ ولی اللہ مسرور ہوں گے کہ ان کا ہم مشرب و ہم مذاق آگیا، مولانا شبلی نے بڑھ کر گلے سے لگا لیا ہوگا کہ تو نے میرا تمام کام بڑی خوبی سے انجام دیا اور میرا نام بلند اور روشن کیا، مولانا اشرف علی تھانوی سینے سے لگا کر فرما رہے ہوں گے کہ میں نے تیرے دل میں جو آگ روشن کی تھی، اس کو تو نے فروزاں رکھا۔“

آخر میں زبان پر تھا:

”اے رب العالمین! رحمۃ للعالمین کے سیرت نگار، دینِ متین کے خادم اور تیرے کلام کے شارح کو میری دعاؤں کی احتیاج نہیں، تو نے اپنی ستاری اور غفاری سے خود ہی نوازا ہوگا۔“

مصلے سے اٹھ کر کمرے کا بیرونی دروازہ کھولا تو ایسا معلوم ہوا کہ دارالمصنفین پر اندوہ والہ بادل چھائے ہوئے ہیں، ساری فضا مغموم ہے، یہاں کے شجر و حجر تک سو گوار ہیں، میری زبان سے بے اختیار نکلا کہ ”موت العالم والند موت العالم“ کمرے سے نکل کر برآمدے میں کھڑا ہو گیا، یہ وہی بیرونی برآمدہ تھا، جہاں سید صاحب لوگوں سے ملا کرتے تھے، خیال آیا کہ اسی جگہ مولانا شوکت علی مرحوم ان سے بڑی محبت اور گرم جوشی سے ملے تھے، یہیں مولانا ظفر علی خاں نے ان سے سیاست پر باتیں کی تھیں، یہیں رفیع احمد قدوائی موجودہ وزیر غذا نے وقت کی سیاسیات پر تبادلہ خیال کیا تھا، یہیں

چودھری خلیق الزماں (فی الحال گورنر مشرقی بنگال) نے اپنا سیاسی دردِ دل بیان کیا تھا، یہیں مولانا حسرت موہانی نے آکر اپنے نئے انقلابی سیاسی رجحانات کا اظہار کیا تھا، یہیں وہ وفد آکر ملا تھا، جو مسلم لیگ کی تحریک پاکستان کے زمانے میں مسلم اکثریت کے صوبہ سے مسلم اقلیت کے صوبہ میں آیا تھا، اس کے صدر پشاور کے ایک مشہور بیرسٹر تھے، جن کے نام کا آخری جزء غزنوی تھا، اس کے اراکین میں قاضی محمد عیسیٰ اور مولانا کرم علی صاحب تھے، یہیں ایک بار مشہور احراری لیڈر اظہر علی مظہر خاموشی سے آکر بیٹھ گئے تھے، ہم میں سے کسی نے ان کو نہیں پہچانا، جب انھوں نے اپنا نام بتایا تو سید صاحب اٹھ کر ان سے بڑے اخلاق و محبت سے ملے، اس برآمدے میں معلوم نہیں کتنے اہل قلم آئے اور جو آیا وہ سید صاحب کی علمی عظمت اور اخلاقی جلالت کا نقش دل پر لے کر اٹھا۔

برآمدے سے نیچے اترتا تو خیال آیا کہ مولانا محمد علی مرحوم، مہاتما گاندھی، پنڈت موتی لال نہرو، سروجنی ناندو اور پنڈت جواہر لال نہرو جیسے بڑے بڑے لیڈران ہی کی بدولت دارالمصنفین آئے، میرے قیام کے زمانے میں پنڈت جواہر لال نہرو دوبار آئے، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ سید صاحب کے سامنے اس طرح بیٹھتے تھے جیسے کوئی پیارا اور مہذب بچہ کسی شفیق بزرگ کے پاس بیٹھا ہو۔

پھر خیال آیا کہ یہیں سید صاحب کی دعوت پر ایک بار ایک مجلسِ صوفیہ بھی منعقد ہوئی تھی، جس میں مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اکابر خلفاء خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب، مولانا وصی اللہ صاحب فتح پوری، مولانا عبدالغنی صاحب پھول پوری، مولانا محمد احسن صاحب کاکوروی، ڈاکٹر عبدالحی صاحب اور مولانا ابرار الحق صاحب ہردوئی نے شرکت فرمائی تھی اور خود بھی جامِ شریعت اور بادۂ طریقت سے سرشار ہوئے تھے اور دوسروں کو بھی مخمور کیا تھا، یہ مجلسیں تین دن تک رہی تھیں، آہ! کیسے پر کیف دن تھے۔

میں ان ہی باتوں کو سوچتا ہوا جا رہا تھا کہ دارالمصنفین کے کتب خانے پر نظر پڑی، جہاں سید صاحب کی نگرانی میں ہم لوگ کام کیا کرتے تھے، اس کو دیکھ کر دل یہ کہہ رہا تھا:

یاشب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہ بساط  
دامان باغبان و کف گل فروش ہے  
یا صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں  
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

شاہ صاحب کے برآمدے کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ وہ مغموم اور محزون بیٹھے ہیں، مجھ کو دیکھ کر کہنے لگے کہ آج مسجد دیر کر کے پہنچا، جماعت کھڑی ہو چکی تھی، سلام کے بعد مولوی مسعود علی صاحب کو یہ اندوہ ناک خبر سنائی، وہ سن کر متحیر ہو گئے اور ابھی کچھ دیر پہلے تک اسی برآمدے میں بیٹھے رو رہے اور کہہ رہے تھے کہ میں ان کے ساتھ پچاس برس رہا، ایسا شریف اور حلیم انسان کسی اور کو نہیں پایا، شاہ صاحب نے پھر کہا کہ میں رات بھر گویا جاگتا ہی رہا، ایک بجے کے بعد ذرا سی آنکھ لگی تھی تو خواب میں دیکھا کہ ہم تم اور سید حسین (سید صاحب کے منجھلے داماد ڈائریکشنل کمشنر آگرہ) ہندوستان کی سرحد تک پہنچ گئے ہیں، سرحد کے اس پار قریب ہی سید صاحب کا جنازہ رکھا ہوا ہے، لیکن ہم لوگوں کے پاس پاسپورٹ نہیں ہے، اس لیے سرحد پار نہیں کر سکتے، البتہ سید حسین کسی طرح سرحد پار کر کے چلے گئے، تھوڑی دیر کے بعد دیکھا کہ دریا کے راستے سے ایک کشتی پر جنازہ جا رہا ہے، اوپر سفید گاڑھے کا شامیانہ ہے اور صاف شفاف لباس میں چند منور صورتیں جنازہ کے ساتھ ہیں، اس طرح جنازہ کی روحانی زیارت ہم دونوں کو بھی ہو گئی۔

تھوڑی دیر کے لیے برآمدے سے ہٹ گیا اور واپس آیا تو دیکھا کہ مولانا مسعود علی صاحب پھر آکر بیٹھے ہیں، ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، مولوی عبدالسلام اور شاہ صاحب پر بھی حزن و ملال طاری ہے اور برآمدہ ماتم کدہ بنا ہوا ہے، مجھ سے وہاں کھڑا نہ رہا گیا، پھر گھر چلا آیا، جب ناشتہ کے لیے تخت پر بیٹھا تو یہ خیال کر کے اسی تخت پر سید صاحب ناشتہ کیا کرتے تھے، مجھ سے اس پر بیٹھا نہ گیا، کسی طرح دو چار نوالے حلق سے اتار کر پھر باہر نکل گیا، کتب خانے کے پاس پہنچا تو دفتر کے چہرے اسی خالق رضا خاں مجھ کو دیکھ کر رونے

لگے، وہ پہلے کتب خانے میں کام کرتے تھے، اب دفتر میں ہیں، رو رو کر کہنے لگے، ”صاحب، سید صاحب مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے“، وہیں دفتر کے قاضی احمد حسین صاحب بھی آگئے، ان کی آنکھیں بھی اشکبار تھیں اور کہہ رہے تھے کہ ایک بہت بڑے بزرگ سے دنیا خالی ہو گئی۔

میں پھر جا کر شاہ صاحب کے برآمدے میں بیٹھ گیا، اتنے میں کتب خانے کے ملازمین آگئے، شاہ صاحب نے کہا آج کتب خانہ بند رہے گا، یہ ربیع الاول کا مہینہ اور دوشنبہ کا دن تھا، شاہ صاحب اور ہم یہ کہہ رہے تھے کہ رسول ﷺ کی ولادت اور وفات بھی اسی دن ہوئی تھی، رسول ﷺ کے سیرت نگار کو بھی یہی مہینہ اور دن نصیب ہوا، صرف تاریخ میں تین دن کا فرق رہا، یہ بھی اتفاق ہے کہ استاذ اور شاگرد کی وفات میں بھی کل چار دن کا فرق رہا، مولانا شبلی کی وفات ۱۸ نومبر کو ہوئی تھی۔

یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ کتب خانہ کے لائبریرین اور پروف ریڈر ملا عبدالباری شبلی منزل میں داخل ہوئے، ملا جی سید صاحب کے ساتھ پچیس چھبیس سال تک رہے، ان کے مسودوں کی کچی کتابت وہی کرتے اور ان کی کتابوں کا پروف بھی یہی پڑھتے رہے، سید صاحب کو ان کی پروف ریڈنگ پر بڑا بھروسہ رہتا، اور وہ ان کو بہت مانتے تھے، ملا جی شبلی منزل میں داخل ہو کر پھاٹک سے سیدھے اپنے کمرے کی طرف جا رہے تھے کہ شاہ صاحب نے ان کو بلا کر سید صاحب کی رحلت کی خبر سنائی، ایسا معلوم ہوا کہ ان پر بجلی گر پڑی ہے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور دیر تک روتے رہے۔

دن چڑھے شہر میں خبر پھیل گئی، اس لیے تعزیت میں آنے والوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، ان میں ایک صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ پاکستان ریڈیو سے اعلان ہوا ہے کہ ساڑھے نو بجے صبح جنازہ کی نماز ہوگی، میرا ریڈیو دن میں کام نہیں دیتا کیوں کہ پاکستان کے کسی اسٹیشن سے دن کو آواز نہیں آتی ہے، ساڑھے نو بجے کا وقت ہو چکا تھا، اس لیے خیال پاکستان کی ہی طرف تھا کہ معلوم نہیں عاشق رسول کا جنازہ کس طرح اٹھ رہا ہوگا، اور دل



کہہ رہا تھا کہ:

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

جب آنے جانے والوں سے شاہ صاحب کا برآمدہ کچھ دیر کے لیے خالی ہو گیا تو غایت اضطراب میں ٹہل ٹہل کر کہنے لگے کہ آج عالم اسلام کے ماتم کا دن ہے، اسلامی دنیا ایک بڑی جلیل القدر ہستی سے خالی ہو گئی، وہ اپنی جامعیت اور دینی حکمت و بصیرت میں شاہ ولی اللہ دہلوی کی یادگار تھے، پھر شانے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے کہ اب ہم لوگوں کو حق شاگردی ادا کرنا، ان کے کاموں کو تکمیل تک پہنچانا اور ان کے نام اور کام دونوں کو زندہ رکھنا ہے، اگرچہ ان کا کام خود اتنا روشن ہے کہ اس کو ہماری احتیاج نہیں لیکن دارالمصنفین میں انھوں نے جوشع جلای ہے، اس کو انشاء اللہ روشن رکھنا ہے، دارالمصنفین کے ذرہ ذرہ پران کا نام ہمیشہ ثبت رہے گا، شاہ صاحب کے ان مخلصانہ جذبات کو سن کر میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

اس درمیان میں پریس اور دفتر کا وقت آ گیا تھا، مولانا مسعود علی صاحب ندوی نے دونوں بند کر دیے اور شاہ صاحب کے برآمدے میں دفتر اور پریس کے لوگ بھی جمع ہو گئے، ان میں ہر ایک شخص غمگین و ملول تھا۔

مجھے بار بار یہی خیال آرہا تھا کہ اب جنازہ کی نماز ہو رہی ہوگی، لوگوں کا ہجوم ہوگا، ہم لوگ ایک بڑی سعادت سے محروم ہیں، اگر یہ سانحہ دارالمصنفین میں ہوا ہوتا تو زندگی میں ان کی خدمت گزاری کے ساتھ سفر آخرت پر رخصت کرنے کی آخری سعادتیں بھی حاصل ہوتیں اور دارالمصنفین میں استاد کے پہلو میں احمد مختار کا سیرت نگار سپردِ خاک ہوتا تو دارالمصنفین کی یہ دولت ہمیشہ اس کے پاس رہتی، خود سید صاحب کو استاد کے پہلو میں دفن ہونے کی بڑی دیرینہ تمنا تھی اور وہ اپنی جگہ بھی بہت پہلے سے متعین کر چکے تھے، ۱۹۴۴ء کے مارچ اپریل میں سخت بیمار پڑے تھے، ان کے منجھلے داماد سید حسین صاحب نے جو جو پور میں ڈپٹی کلکٹر تھے، ان کو اپنے یہاں لے جانا چاہا، سید صاحب کو جانے میں کچھ

تاثر ہوا اور فرمایا کہ کہیں جو پور میں وقت آخر ہو گیا، تو اپنی اصل جگہ سے محروم ہو جاؤں گا، وعدہ کرو کہ یہیں لا کر سلا دو گے تو پھر چلوں گا۔

ظہر کے وقت مسجد جانے لگا تو مولانا شبلی کے مزار کے پاس وہ جگہ نظر آئی، دل میں درد سا اٹھا، کہ یہ سعادت اس زمین کے مقدر میں نہ تھی، مسجد میں داخل ہوا تو ایسا معلوم ہوا کہ خود سید صاحب مسجد میں داخل ہو رہے ہیں، جاڑے میں کوٹ سوٹر پہنتے تھے، اور دایاں ہاتھ اُس کی جیب میں رکھے ہوئے مسجد کے دروازے میں داخل ہوتے تھے، ہلکے پھلکے بے پوری سلیم شامی جوتے اتار کے فرش پر پہلے داہنا پاؤں رکھتے، پھر اُن کی نماز کی شکل نگاہوں کے سامنے پھر نے لگی۔

تحریر باندھنے کے بعد ان کی گردن دائیں جانب تھوڑی سی جھک جاتی اور ایسا معلوم ہوتا کہ بہت ہی ادب سے اللہ تبارک و تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہیں۔

فجر کی نماز سے مغرب تک شہر کے عمائد و معززین کا سلسلہ جاری تھا اور جو بھی آیا سید صاحب ہی کا ذکر جمیل کرتا رہا۔

مغرب کے بعد ہم لوگوں کے رفیق کار حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی آئے، اور وہ شہر ہی میں رہتے ہیں، اس دن صبح کو ان کی بچی کا انتقال ہو گیا تھا، مجھ کو بڑا دکھ تھا کہ آج ان کو دو حادثوں کا غم اٹھانا پڑا، انھوں نے اپنی بچی کی موت کی خبر عمداً ہم لوگوں کو نہ دی تھی، آنے کے ساتھ ہی کہنے لگے، آج سید صاحب کی رحلت کی خبر پا کر اپنی بچی کو بھول گیا، آج تو پورے عالم اسلام میں ماتم ہوگا، پھر بولے معلوم نہیں کراچی میں جنازہ کی نماز کس نے پڑھائی، مولانا شبیر احمد ہی کے پہلو میں دفن ہوئے ہوں گے، انشاء اللہ کل ہم لوگ بھی ان کے جنازہ کی غائبانہ نماز یہاں پڑھیں گے۔

چھ بجے شام کو میں نے ریڈیو کھولا، اس وقت مختصر خبریں آتی ہیں، تاہم یہ معلوم ہوا کہ جنازہ بڑی شان سے نکلا، تفصیل سننے کے لئے پونے نو بجے کا انتظار کرنے لگا، شاہ صاحب بھی تفصیل سننا چاہتے تھے، اس لیے عشاء کی نماز کے بعد اپنی قیام گاہ کے سامنے

والے بنگلے میں بیٹھ گئے، اس میں بھی ریڈیو ہے، میں اپنے زنان خانے میں چلا آیا، سوا آٹھ بجے ریڈیو کھولا تو سنا کہ علامہ سید سلیمان صاحب ندوی پر ایک فحش پروگرام ہے، اس فحش کو کئی آدمی مل کر پیش کر رہے تھے، ان میں ہر ایک کا لہجہ غم ناک تھا، اس میں سید صاحب کی زندگی کے ہر پہلو پر مختصر لیکن بڑا جامع تبصرہ تھا، میں ہمد تن گوش ہو کر سُن رہا تھا اور جب اس میں یہ کہا گیا کہ سید صاحب نے اعظم گڑھ کے ایک اجڑے ہوئے باغ کو ملک کا سب سے بڑا شاندار، باوقار اور مستند تصنیفی ادارہ بنادیا تو مجھ کو ایک پندار سا محسوس ہوا، یہ فیچر آدھے گھنٹے تک پاکستان کے ہر اسٹیشن سے جاری رہا، گویا سارا پاکستان اس وقت ماتم کر رہا تھا، اسی کے بعد پونے ۹ بجے خبریں شروع ہوئیں اور میں انتہائی رنج و ملال کی حالت میں وہ تمام تفصیلات سن رہا تھا کہ کس طرح غیر ملکی سفراء، پاکستان کے وزراء، اعلیٰ حکام اور ہزاروں شہریوں نے مل کر علم و فن کے نیر اعظم اور نظر و فکر کے بدر کامل کو تہہ خاک کر دیا۔

پھر باری باری پاکستان کے تمام ارباب حکومت اور ممتاز افراد کے تعزیتی پیامات سنائے جا رہے تھے، اُن کو سن کر دل میں ایک ہوک سی اٹھی کہ آہ! اب ہندو پاکستان میں ایسی جامع شخصیت کہاں پیدا ہوگی، جو مفسر بھی، محدث بھی، فقیہ بھی، متکلم بھی، صوفی بھی، معلم بھی، نعت نویس بھی، محقق بھی، مؤرخ بھی، ادیب بھی، شاعر بھی، خطیب بھی، سیاسی مفکر بھی، اور سب سے بڑھ کر تقویٰ و طہارت اور مہر و محبت کا اعلیٰ نمونہ بھی ہو۔

میں نے سوانو بجے ریڈیو بند کر دیا لیکن شہر کے ایک صاحب سے معلوم ہوا کہ اس کے بعد لاہور سے بھی ایک تعزیتی تقریر براڈ کاسٹ ہوئی، ڈھا کہ سے بھی اردو اور بنگلے میں تقریریں نشر ہوئیں، افسوس ہے کہ میں اُن کو سن نہ سکا، ریڈیو سے تو نہیں لیکن اخبار سے یہ معلوم ہوا کہ جنازہ کی نماز مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ اور سید صاحب کے خواجہ تاش ڈاکٹر عبدالحی صاحب نے پڑھائی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کے پہلو میں دفن کیے گئے۔

ریڈیو بند کر کے بستر پر لیٹا تو دل کہہ رہا تھا کہ ہندوستان کی سرزمین رسول کے

سیرت نگار کو اپنے سینے میں رکھنے کے شرف سے محروم ہوگئی اور پھر بستر ہی پر وہ تمام واقعات یاد آنے لگے کہ یہ نعمت کس طرح پاکستان منتقل ہوگئی اور وہ یہ ہیں:

اگست ۱۹۴۹ء میں سید صاحب بھوپال سے بیگم صاحبہ اور سلمان سلمہ کے ساتھ حج کے لیے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے، زیارت خانہ کعبہ کے بعد مدینہ منورہ پہنچے تو وہاں ان کا قیام طویل ہو گیا، اس اثنا میں لکھنؤ اور دہلی کے اخبارات میں یہ خبر پڑھی کہ سید صاحب حج کے بعد کراچی پہنچ گئے ہیں، وہاں حکومت ان سے اسلامی دستور تیار کرائے گی، یہ خبر ہم لوگوں کو بے بنیاد معلوم ہوئی، چنانچہ خود سید صاحب کا ایک شفقت نامہ مدینہ منورہ سے موصول ہوا تو اس کو پڑھ کر حقیقت ظاہر ہوئی، بالآخر وہ دسمبر کی اخیر تاریخوں میں بمبئی پہنچ گئے، وہاں آ کر علیل ہو گئے، جنوری کے وسط میں آپ بھوپال آئے اور بھوپال ہی میں تھے کہ ڈھا کہ کے ایک انگریز روزنامہ نے یہ غلط خبر شائع کر دی کہ مولانا سید سلیمان ندوی کی بیگم صاحبہ مشرقی پاکستان آرہی تھیں کہ کٹیہار کے پاس پولس نے ان کو بلا وجہ گرفتار کر لیا، اس خبر سے پورے پاکستان میں ایک سنسنی پھیل گئی، پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خان نے ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو سے تار کے ذریعہ حقیقت حال پوچھی، پنڈت جی نے ان کو اطمینان دلایا کہ یہ خبر بالکل بے بنیاد ہے۔

پھر دو صفحے کا ایک تار سید صاحب کے نام، اعظم گڑھ کے پتے پر بھیجا جس میں اس غلط خبر کی تفصیل لکھ کر ان کی اور بیگم صاحبہ کی خیریت دریافت کی، ہم لوگوں نے اس تار کا جواب پنڈت جی کو دے کر ان کے اخلاق و محبت کا شکریہ ادا کیا اور اس کی خبر سید صاحب کو بھی دی، انھوں نے اپریل کے آخر میں بھوپال سے اپنا تعلق ختم کر دیا اور اہل و عیال کو لے کر اپنے منجھلے داماد کے یہاں کانپور آ گئے، وہاں سے لکھنؤ آئے اور پھر ممبئی کے شروع میں اعظم گڑھ تشریف لائے، یہاں آ کر پنڈت جواہر لال نہرو کا تار اپنی آنکھوں سے دیکھا، تو بہت متاثر ہوئے اور شکریہ میں ان کو ایک خط لکھا، ہم لوگ بے حد مسرور تھے کہ اب پھر سید صاحب مستقل قیام کے لیے دارالمصنفین آجائیں گے، اور وہی اگلی رونق اور چہل پہل

قائم ہو جائے گی، یہاں وہ تقریباً دو ہفتے رہے، بڑی پُرکف صحبتیں رہیں، شہر کے تمام معززین اور عوامندین آکر ان کے ارد گرد بیٹھے رہتے تھے لیکن کانپور واپس جانے سے دو چار روز پہلے افسردہ رہنے لگے اور اس کے کچھ اسباب بیان کر کے فرمایا میں نے یہ طے کیا ہے کہ وطن ہی میں قیام کر کے آخرت کی تیاری کروں گا، وہیں مجھ کو سکون ملے گا، میں نے عرض کیا، ”اور ہم لوگ“ تو فرمایا:

”آپ لوگ کب تک کسی کے سہارے چلیں گے، کبھی کبھی دیکھ بھال کے لیے دارالمصنفین چلا آیا کروں گا۔“

اس کے بعد یہ بھی فرمایا کہ ”تم یہاں کے گھر کا سامان رفتہ رفتہ فروخت کر دو، دیسنہ میں سادہ زندگی رہے گی، سلمان کی والدہ کانپور سے پہلے اعظم گڑھ آئیں گی، یہاں سے دیسنہ چلی جائیں گی، میں ان کو ساتھ لے کر تمہارے یہاں اسی مہینے کے آخر تک پہنچ جاؤں گا“ یاد آتا ہے کہ وہ ۱۴ مئی ۱۹۵۰ء کو یہاں سے کانپور تشریف لے گئے، آہ! کیا معلوم تھا کہ اس تاریخ کو دارالمصنفین سے دائمی مفارقت کر رہے ہیں، میں ان کو پہنچانے اسٹیشن بھی نہیں گیا، خیال تھا کہ وہ جلد ہی واپس ہوں گے، صبح وشام ان کا انتظار ہی تھا کہ ایک روز شام کو تار ملا لیکن یہ خود سید صاحب کے نام تھا، کھولا تو لکھا تھا کہ خیر سگالی وفد پاکستان جا رہا ہے، آپ کا پر مٹ لے لیا گیا ہے، جلد آئیں، میں نے نیچے نام حفظ الرحمان پڑھا، مجھ کو تعجب ہوا کہ یہ تاران کے نام کیسے آیا ہے، دوسرے دن میں نے ان کے پاس اصل تاریخ بھیجنے کے بجائے ایک دوسرا تار لکھا کہ مولانا حفظ الرحمان دہلی سے تار دیتے ہیں کہ خیر سگالی وفد پاکستان جا رہا ہے، آپ کا پر مٹ لے لیا گیا ہے، جلد آئیں، یہ تار پا کر سید صاحب نے مجھ کو لکھا کہ خیر سگالی وفد کی طلاع پہلے سے نہیں دی گئی، لیکن اس تار کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہاں جاؤں، ذرا شمیمہ (۱) اور ان کے بچوں کو دیکھ لوں گا، حج کے بعد سب سے تو ملاقات ہو گئی، ان سے نہیں ہوئی ہے، کانپور سے دہلی پہنچ کر مجھ کو ایک

خط لکھا، جس میں کچھ برہمی تھی کہ:

”تم نے مجھ کو یہاں بھیج کر پریشانی میں ڈال دیا، مولانا حفظ الرحمان ناظم جمعیت العلماء نے مجھ کو کوئی تار نہیں بھیجا، تار مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی کے صاحب زادے مولانا عزیز الرحمان کی طرف سے تھا، اور وفد تو کب کا جا چکا ہے، اب میں اپنے طور پر پر مٹ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

پھر لاہور سے ان کا ایک خط ملا کہ یہاں پہنچ گیا ہوں لیکن پاس ایک پیسہ بھی نہیں، اس لیے شیخ مبارک علی تاجر کتب سے دو سو روپے قرض لے لیے ہیں، تم دفتر میں یہ رقم شیخ مبارک علی کے حساب میں جمع کر دو، لاہور سے کراچی پہنچے تو وفد وہاں سے بہت پہلے ہندوستان روانہ ہو چکا تھا، کراچی پہنچ کر اپنی صاحبزادی کے پاس مقیم ہوئے، وہاں سے خط لکھا کہ صرف چند جوڑے کپڑے اپنے ساتھ ہیں اس لیے جلد ہی واپسی ہوگی، لیکن مصلحت خداوندی یہی تھی کہ وہ اس سرزمین کے ہو کر رہیں، اس لیے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وہیں کے ہو کر رہ گئے، ان کے کراچی پہنچنے پر وہاں کے ایک اخبار نے یہ لکھا کہ ان پر حکومت بہار نے مقدمے دائر کر دئے تھے، اس لیے وہاں سے پریشان ہو کر دہلی آئے اور دہلی سے وفد کے ساتھ کراچی پہنچ کر امان لی، یہ بالکل بے بنیاد خبر تھی، اسی طرح لکھنؤ کے ایک اخبار نے ان کے کراچی میں رہ جانے پر نا ملائم الفاظ میں تنقید کی کہ وہ وفد کے ساتھ گئے تھے تو واپس آنا چاہیے تھا، اس کو پڑھ کر ہم لوگوں کو دکھ ہوا اور جب میں نے سید صاحب کو اس کی خبر دی تو انھوں نے لکھا کہ:

”تم جانتے ہو کہ میں کس طرح یہاں آیا، وفد کے ساتھ میرا تعلق کہیں نہیں پیدا ہوا، میں اپنے خرچ سے آیا ہوں، اخبار والوں کے ہاتھ میں قلم ہے جو چاہیں لکھیں، تم یہ بھی جانتے ہو کہ اس ہجرت سے میں کس قدر مالی خسارہ میں رہا۔“

ان کے مالی نقصانات واقعی بہت ہوئے، دارالمصنفین کے رہائشی مکان میں ان کا سارا سامان جوں کا توں پڑا تھا، ان کے وطن دیسنہ کے مکان میں ساری چیزیں یوں ہی

رکھی کی رکھی رہ گئیں، وہاں ان کے کئی قطعہ مکانات تھے، مردانہ نشست کا بنگلہ بڑا ہی شاندار، پُرفضا اور کشادہ تھا، اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے، آموں کا ایک باغ بھی تھا جس میں ملیح آباد کے تمام اچھے آموں کے درخت تھے، جائیداد سے گھر بیٹھے ساٹھ ستر من غلہ مل جایا کرتا تھا، مختلف ڈاکخانوں میں روپے بھی جمع تھے، دارالمصنفین کے علاوہ حضور نظام کی طرف سے ماہانہ وظیفہ بھی جاری تھا، بھوپال میں پرودی ڈنٹ فنڈ کی رقم بھی پڑی تھی لیکن ان سب کو بالائے طاق رکھ کر ہجرت کا فیصلہ کر بیٹھے اور مہاجریت کی صعوبتیں بھی برداشت کرتے رہے، جون ۱۹۵۰ء کے اوائل میں کراچی پہنچے تھے، جنوری ۱۹۵۱ء میں سلہٹ، چاٹ گام اور ڈھا کہ کے ایک دورہ کے بعد مجھ کو لکھا کہ:

”یہاں مذہبی قومی کام تو کچھ نہ کچھ انجام پارہے ہیں لیکن معاشی صورت ابھی تک پیدا نہیں ہوئی، اب یہی ارادہ ہے کہ وہی پیشہ قدیم کتب فروشی اختیار کیا جائے۔“

پھر جولائی ۱۹۵۱ء میں لکھا کہ ”مہاجریت کی شان بہت بلند ہے، مہاجر صحابہؓ کی قدر اب معلوم ہوتی ہے“ آئین بنانے کے سلسلہ میں پاکستانی حکومت نے ادارہ تعلیمات اسلام قائم کیا تھا، اس کی صدارت ان کو برابر پیش کی جا رہی تھی لیکن وہ اس کو قبول کرنے سے انکار کرتے رہے، چنانچہ ۱۸ اگست کے ایک مکتوب میں اس عہدہ کا ذکر کرتے ہوئے مجھ کو تحریر فرمایا:

”یہ تو دوسرے پہلے میرے سامنے پیش کیا گیا تھا، مگر میں نے بعض شروط رکھے تھے، وہ اب پورے ہو رہے ہیں، یعنی آئین کے ساتھ قانون رائج کی اصلاح کا کام اب شروع ہوا ہے، تو میں نے ۲ اگست کو قبول کر لیا، تاکہ پورے مسودہ آئین پر رائے دی جاسکے، گو آئین کا کام اب ختم ہو رہا ہے۔“

یہ نہ معلوم ہوسکا کہ اپنے شرائط پر یہ عہدہ قبول کیا تو کتنا الاؤنس لینا پسند فرمایا، اسی اثنا میں ان کو لکھتا رہا کہ اگر وہ ایک بار ہندوستان تشریف لے آئیں تو اپنی جائیداد

فروخت کر کے کم از کم پچیس ہزار روپے حاصل کر سکتے ہیں، کیوں کہ نہرو ولایت پیٹ سے بہار کے مہاجروں کو اپنی جائیداد فروخت کرنے میں کچھ سہولت ہو گئی ہے لیکن انھوں نے جواب دیا کہ میری مردانہ نشست میں لڑکوں اور زنان خانہ میں لڑکیوں کا ایک ایک مدرسہ قائم کر دو اور جائیداد دونوں میں وقف کر دو، میں نے اُن کو پھر لکھا کہ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد اس گاؤں میں اتنی آبادی نہیں رہی کہ وہاں مدرسے قائم ہو سکیں تو انھوں نے جواب دیا کہ جس چیز سے منھ موڑ چکا ہوں اس کی طرف رغبت کرنے کو دل نہیں چاہتا، مارچ ۱۹۵۳ء میں کراچی سے ڈھا کہ پاکستان ہسٹاریکل کانفرنس کی صدارت کے لیے تشریف لے گئے، ڈھا کہ سے ہندوستان بھی آئے اور اپنے منھلے داماد کے یہاں فتح پور ہنسوا آ کر ٹھہرے، ہم لوگوں کو خبر ملی تو اعظم گڑھ سے ہم اور شاہ صاحب ان کی قدم بوسی کے لیے فتح پور روانہ ہوئے، ہم لوگوں کے ساتھ شہر کے حاجی عبدالغفور بھی ہو گئے، جو سید صاحب سے بڑی عقیدت رکھتے تھے، جون پور سے مجھی جناب نیاز احمد صدیقی صاحب پرنسپل محمد حسن انٹر کالج سالار قافلہ بنے اور جب محبت و عقیدت کا سراپا بن کر یہ چھوٹا سا قافلہ سید صاحب کی خدمت میں پہنچا، تو وہ دیکھ کر باغ باغ ہو گئے، ہم لوگ تین دن اُن کے ساتھ رہے، اور یہ تینوں دن بہترین سرمایہ حیات بن کر رہیں گے اور جب انھوں نے یہ فرمایا کہ اس سال رمضان المبارک کے بعد دارالمصنفین میں آ کر ایک مہینہ قیام کرنے کا ارادہ ہے تو ہم لوگ بے حد مسرور ہوئے، یہاں بھی میں نے اُن سے عرض کیا کہ ان کی جائیداد کے بعض حصے محفوظ ہیں لیکن مکان اور جائیداد کے متعلق کسی قسم کی گفتگو کرنی پسند نہیں فرمائی، زیادہ تر دارالمصنفین اور اعظم گڑھ ہی پر گفتگو کرتے رہے، رمضان المبارک کے بعد اپنی خانگی مشکلوں کی بنا پر کراچی سے اعظم گڑھ نہ آ سکے، میں نے اگست ۱۹۵۳ء میں ان کو پھر لکھا کہ اب جائیداد پر قبضہ ہوا ہی چاہتا ہے لیکن انھوں نے اس کا جواب اگست کے آخر میں یہ دیا کہ:

”ہندوستان چھوٹنے پر جائیداد و مکان کی محبت دل سے نکل گئی ہے اور بقول

شاعر:

بلبل نے آشیانہ چمن سے اٹھالیا

اُس کی بلا سے بوم رہے یا ہمارہے

سلوک کی وہ منزل جو تصوف کی راہ سے شاید برسوں میں طے ہو سکتی ہے، اس

مہاجرت میں دم کے دم میں طے ہو گئی۔

ان کا یہ خط آخری تھا، جو انھوں نے مجھ کو اپنے ہاتھ سے لکھا، اس کے بعد بیگم صاحبہ کا خط برابر آتا رہا کہ قلب کے عارضہ میں مبتلا ہو گئے ہیں، تنفس کے ساتھ بخار رہتا ہے، پھر ایک خط سے معلوم ہوا کہ ۳۵ روز تک پیٹھ لگا کر بستر پر سونہ سکے لیکن اس خط میں یہ بھی تھا کہ رو بصحت ہیں۔ دینہ کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ ۱۲ نومبر کو انھوں نے خود اپنے ہاتھ سے ایک خط لکھا جو ۱۹ نومبر کو ملا، اس میں اپنے مرض کی تخفیف پر اطمینان کا اظہار کیا تھا لیکن آہ! یکا یک ریڈیو سے خبر ملی کہ وہ اللہ کو پیارے ہوئے، اُن کی پوری زندگی ایثار و قربانی میں گزری، دارالمصنفین میں پونا کالج کی پروفیسری چھوڑ کر ایک قلیل وظیفہ پر زندگی شروع کی اور بتیس سال کی خدمت کے بعد بھی ۲۵۰ روپے ماہانہ ہی پر قناعت کرنا پسند فرمایا اور پاکستان کی ہجرت کے بعد آبائی مکان و جائداد سے منھ موڑ کر اپنے ایثار و قربانی کی تکمیل کر دی۔

ریڈیو بند کرنے کے بعد بستر پر یہی تمام خیالات دیر تک آتے رہے، صبح اٹھا تو معلوم ہوا کہ محترمی مولانا مسعود علی صاحب ندوی نے فجر کی نماز کے بعد ہی مسجد میں قرآن خوانی شروع کرادی ہے، میں دیر کر کے وہاں پہنچا، یہ قرآن خوانی زیادہ رسی نہیں بنائی گئی تھی صرف دارالمصنفین کے کارکنوں ہی تک محدود تھی، لیکن شبلی کالج کے طلبہ کافی تعداد میں پہنچ گئے، چنانچہ ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد معلوم ہوا کہ کئی ختم ہو چکے ہیں، آخر میں حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی نے حاضرین کے ساتھ دیر تک دعائے مغفرت کی، پھر تمام لوگ مولانا شبلی کے مزار کے قریب آکر غائبانہ جنازہ کی نماز کے لیے کھڑے ہو گئے، پہلو میں وہی جگہ نظر

آ رہی تھی، جو سید صاحب نے ابدی آرام گاہ کے لیے انتخاب کی تھی، جنازہ کی نماز کے بعد تمام لوگ مولانا مسعود علی صاحب ندوی کے ارد گرد کھڑے ہو گئے، انھوں نے شاہ صاحب سے ریڈیو کی خبریں پوچھیں، کراچی میں جنازہ کی تفصیلات سن کر اُن کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں اور فرمایا:

”بس اب دارالمصنفین کو ختم ہی سمجھیے“

رفقائے دارالمصنفین اب کتب خانہ کی طرف چلے، میرے دونوں پاؤں سوسون کے ہو رہے تھے کہ آہ! اب کتب خانہ میں کیا رکھا ہے جو وہاں جا کر بیٹھوں، کتب خانہ کے شمالی برآمدے سے اندر داخل ہوا، تو اس بڑے ہال میں پہنچا، جہاں سید صاحب بیٹھا کرتے تھے، ان کی میز کے پاس آکر کھڑا ہو گیا، انھوں نے اپنی میز جس طرح چھوڑی تھی اسی طرح محفوظ تھی، شاہ صاحب دارالمصنفین کے شعبہ علمی کے ناظم ہوئے تو انھوں نے ہم لوگوں کے اصرار کے باوجود اس میز پر بیٹھنا پسند نہیں کیا، سید صاحب کی میز پر ان کا قلم دان ویسے ہی رکھا ہے، ان کے مسودے کے کاغذات ویسے ہی پڑے ہیں جیسے کہ چھوڑ گئے تھے، ان کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ابھی پھر آکر لکھنا شروع کر دیں گے، میری آنکھوں سے پھر آنسو جاری ہو گئے کہ آہ! یہ وہی میز ہے جس پر سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی چھ جلدیں ترتیب دی گئیں، جن کا جواب دنیا کی کسی زبان میں نہیں، اسی میز پر خطبات مدراس بھی مرتب کیے گئے، جو بالکل ایک نئے طرز کی سیرت ہے، اسی میز پر رحمت عالم بھی بچوں اور عورتوں کے ایمان سنوارنے کے لیے لکھی گئی، اسی میز پر عرب و ہند کے تعلقات بھی قلم بند کی گئی جو اپنی وسعت معلومات، تحقیق و تلاش اور حجت و استدلال کی بنا پر ہندوستان کی ایک ایسی تاریخی کتاب ہے جس کی نظیر نہیں مل سکتی، اسی میز پر خیام بھی سپرد قلم کی گئی، جس کی بدولت علمی دنیا کو معلوم ہوا کہ خیام ایک اعلیٰ قسم کا ریاضی دان، منجم، حکیم، صوفی اور شاعر تھا، اس کے میکدہ سخن میں شراب کی جتنی بوتلیں ہیں، وہ یا تو شراب عاریت ہے یا شراب اخلاص یا شراب حقیقت یا شراب بے خودی ہے، اسی میز پر عربوں کی جہاز

رانی طرح طرح کے ماخذوں کے دریا میں غواصی کر کے لکھی گئی، جس سے یہ معلوم ہوا کہ موجودہ دور میں فنّ جہاز رانی نے جو ترقی کی ہے اس کا ابتدائی خاکہ عربوں ہی نے قائم کیا تھا، اسی میز پر حیاتِ شبلی لکھ کر اپنے استاد کو خراج عقیدت پیش کیا، اسی میز پر بیس سال تک معارف کے شذرات لکھے گئے جو اعجاز و بلاغت کے لحاظ سے واقعی سونے کے ٹکڑے ہوتے تھے، اسی میز پر معارف کے لیے مضامین لکھتے رہے جن کو اگر جمع کیا جائے تو رنگارنگ پھولوں کے بہت سے خوش نما گل دستے بن جائیں، اسی میز پر علمی اور سیاسی کانفرنسوں کے صدارتی خطبے قلم بند کرتے رہے، جن سے علم و سیاست دونوں میں نئی نئی شاہراہیں پیدا ہوتی رہیں، اسی میز پر وفیات بھی لکھتے رہے، جن کو پڑھ کر محترمی جناب عبدالماجد صاحب دریابادی نے ایک موقع پر تحریر فرمایا کہ سید صاحب کا وہ معاصر خوش قسمت ہے جو ان کے سامنے وفات پا جائے اور ان کی ماتم گساری کی دولت اس کے حصے میں آئے۔

اضطراری کیفیت میں میرا ہاتھ ان کی میز کی دراز کی طرف بڑھ گیا، اس کو کھولا تو وہ تمام خطوط نظر آئے، جو ان کے نام سے دنیا کے مختلف مقامات سے آتے رہے، اس میں مدینہ منورہ کے علماء کے بھی خطوط ہیں، قاہرہ کے فضلاء کے بھی، ترکی کے مشاہیر کے بھی، کابل کے شعراء کے بھی، فلسطین اور طرابلس کے ارباب دانش کے بھی، جکارتہ کے طلبہ کے بھی، لندن سے اڈورڈ براؤن، مارگولیتھ، نکلسن، اور اربری کے بھی، پیرس سے ہلوشے، موسیٰ گمنان اور محمد خاں، عبدالوہاب قزوینی کے بھی اور نیویارک سے مین فیلڈ کے بھی اور پھر متحدہ ہندوستان کے ہر قابل ذکر شخص کے متعدد خطوط اس مجموعہ میں ملیں گے، والیان ریاست، وزراء، اعلیٰ حکام کے علاوہ سیاست، مذہب، علم اور ادب کے سب ہی ارباب کمال نے اپنے اپنے خطوط میں ان سے مفید سیاسی، مذہبی، علمی اور ادبی مشورے طلب کیے، ان خطوط کو دیکھ کر خیال آیا کہ سید صاحب نے ایک دور افتادہ شہر میں بیٹھ کر ساری دنیا کو اپنی طرف مائل کر لیا تھا اور ان کی ذات بابرکات کی وجہ سے دارالمصنفین کس قدر بلند

ہو گیا تھا اور پھر یہ سوچ کر دل دھڑکنے لگا کہ وہ جس بلند مقام پر ہم لوگوں کو بٹھا کر گئے ہیں معلوم نہیں ہم لوگ اپنے کو وہاں برقرار بھی رکھ سکیں گے کہ نہیں۔

یکا یک میری نظر کتب خانہ کی تمام الماریوں پر دوڑ گئی، ان میں تقریباً دس ہزار عربی فارسی اُردو اور انگریزی کی کتابیں ہوں گی اور ان میں شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہوگی جس کو سید صاحب نے نہ پڑھا ہو، وہ کوئی کتاب پڑھتے تو اس میں جو بھی مفید باتیں نظر آتیں، ان کو شروع کے سادہ ورق پر نوٹ کر دیتے، جن سے رفقاء دارالمصنفین کو تحقیق و تلاش میں بڑی مدد ملتا کرتی ہے، وہ کتب خانہ میں کوہکن بن کر رہے، اسی لیے علوم کی جوئے شیر ہر طرف بہا دی، پھر خیال آیا کہ اب کتب خانہ وہی ہے، اس کی ساری کتابیں بھی وہی ہیں اور یہاں کے رفقاء بھی وہی ہیں لیکن آہ! سید صاحب کے ساتھ امعانِ نظر، اعجازِ بیان، زورِ قلم، دل پر شور اور سوز و درد بھی رخصت ہوا۔

نظر اٹھی تو دیکھا کہ شاہ صاحب کتب خانہ کے مشرقی برآمدے میں مغموم ٹہل رہے ہیں، ان کے پاس پہنچا تو کہنے لگے آج کام میں مطلق جی نہیں لگ رہا ہے، اب کیا کام کروں، پھر غم زدہ لہجے میں بولے کہ ہم لوگ کتب خانہ میں سید صاحب کی ایک ایک یادگار کو سینے سے لگا کر رکھیں گے، ان کی زندگی میں تو ان سے محبت کے اظہار کی جرأت نہ ہو سکی لیکن اب ان سے سچی محبت کے اظہار کا موقع ملا ہے، معارف کا ایک خاص نمبر نکالیں گے، ان کے تمام مقالات کے مجموعے مرتب کریں گے، ان کے مکاتیب شائع کریں گے اور انشاء اللہ ان کی سوانح عمری ہم سب مل کر لکھیں گے، اس روز کتب خانہ میں ہم لوگ کچھ کام نہ کر سکے، شاہ صاحب کے پاس بیٹھ کر سید صاحب ہی کا ذکر کرتے رہے۔

اسی روز شہر میں تعزیتی جلسہ بھی ہوا، جس میں ہندو اور مسلمان معززین شریک ہوئے، جلسہ کی صدارت مولانا اقبال احمد صاحب سہیل نے کی جو سید صاحب کو اپنا بڑا بھائی سمجھتے تھے، کارروائی کی ابتدا جناب محمد یحییٰ صاحب اعظمی کے ایک نوحہ سے ہوئی، وہ سید صاحب کی ذات پر فخر کرتے ہوئے ان کی زندگی میں کئی نظمیں لکھ چکے تھے، آج وہ ماتم

کر رہے تھے، شبلی کالج کے ایک طالب علم نے ان کا پورا نوحہ دردناک لہجہ میں پڑھا، جو رنج و الم کی کیفیت میں سنا گیا، اس کے بعد شہر کے ہندو مسلمان عمائد نے باری باری تقریریں کر کے اپنے غمناک جذبات کا اظہار کیا، اعظم گڑھ کے لوگ سید صاحب کو یہیں کا باشندہ سمجھتے تھے اور خود سید صاحب کو بھی اعظم گڑھ سے بڑی محبت تھی، چنانچہ یہ برابر معلوم ہوتا رہا کہ کراچی میں اپنے اصلی وطن دینہ سے زیادہ اعظم گڑھ اور ندوہ ہی کی یاد سے زیادہ پریشان اور بے چین رہتے۔

رحلت کے تیسرے دن سے اخبارات آنے لگے تو اُن کو پڑھ پڑھ کر محسوس ہوتا

تھا کہ:

ما تم یہ زمانہ میں پنا تیرے لیے ہے

اخبارات اڈیٹوریل لکھ رہے تھے، علماء صلحاء اور اتقیا اپنے اپنے المناک تاثرات کا اظہار کر رہے تھے، مضامین اور نوے شائع ہو رہے تھے، گویا ملت کے عزادار کے لیے ساری ملت عزادار تھی، امت محمدیہ کے سوگوار کے لیے ساری امت محمدی سوگ کر رہی تھی، اسلام کے سوختہ غم کے لیے سارے پیروان اسلام وقف الم تھے، ہندو پاکستان میں جس طرح ان کا ماتم ہوا کم لوگوں کے لیے ہوا ہوگا اور کیوں نہ ہوتا، یہ ماتم ایک عارف معارف ایمانی کا ماتم تھا، گشن رسالت کے ایک عندلیب خوش نوا کا ماتم تھا، دین مبین کے ایک غم خوار کا ماتم تھا، فضل و کمال کے نادرہ روزگار کا ماتم تھا، ..... صدق و صفا اور خدمت و ایثار کے پیکر کا ماتم تھا۔

عالم اسلام میں تھا ایک وہی روشن دماغ

آہ اس تاریک خانہ کا وہی تھا ایک چراغ (۱)

اب ان اخباروں کے دیکھنے کے بجائے کراچی کے خط کا انتظار تھا کہ معلوم نہیں بیگم صاحب اور بچوں پر کیا گزری، بڑی بے چینی اور بے قراری کی حالت میں رحلت کے

(۱) یہ شعر سید صاحب ہی کا ہے جو انہوں نے مولانا شبلی کی رحلت پر ان کے لئے لکھا تھا۔

دسویں روز عزیزی سلمان سلمہ کا خط ملا، کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کھولا تو اس میں لکھا تھا: ”آہ کس طرح لکھوں، کیا لکھوں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا، آپ کا تار ملا تھا، مگر بے قراری اور بڑھ گئی، اب تک اس صدمے سے جانبر نہیں ہوا ہوں، والدہ صاحبہ اور بہنوں کی حالت دیکھی نہیں جاتی، بڑی غیر متوقع اور اچانک موت تھی، ہم لوگ اس کے لیے تیار نہ تھے، لیکن بس اللہ کی مرضی، انتقال کے دن بڑی مایوسانہ باتیں کی تھیں، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کو اس روز اپنے سفر آخرت کا یقین ہو گیا تھا، اماں سے پوچھا کہ آپ عاصم (بڑے داماد کا نام) کے ساتھ مطمئن ہیں، اماں نے کہا ہاں بالکل مطمئن ہوں، ابّا مرحوم نے کہا بس تو میرا قلب بھی مطمئن ہے، اماں وغیرہ کوئی دن سے ایک جگہ جانا تھا مگر ابّا مرحوم کے خیال سے نہیں جا رہی تھیں لیکن اس دن ابّا مرحوم نے بڑے اصرار سے بھیجا کہ جاؤ، جب جانے لگیں تو کہا دیکھئے ایک گھنٹے میں چلی آئیے گا لیکن افسوس:

کیا خبر تھی انقلابِ آسمان ہو جائے گا

امّاں کے جانے کے بعد سے ان کی وفات تک ان ہی کے پاس تھا، میں نے استنجا کرایا، وضو کرایا، شام کو کھیر کھلائی، پان بنا کر دیا، آخر وقت تک کی خدمت میری قسمت کے لیے تھی، جس کو میں سرمایہ آخرت سمجھتا ہوں، مغرب کی نماز پڑھ کر بیٹھے، میں نے کہا گزشتہ رات کو نیند نہیں آئی تھی، کچھ دیر کے لیے سو جائیے تو لیٹ گئے اور نیند آ گئی، تھوڑی دیر کے بعد اٹھے، شاید رسول اکرم اپنے سیرت نگار سے ملنے کو بے چین تھے، جو اس قدر اچانک اپنے پاس بلا لیا، مغفرت کی دعا کیجئے، ان کے چہرے پر بڑا سکون و اطمینان تھا، یہ پتا بالکل نہیں چلا کہ روح کس وقت عالم بالا کو پرواز کر گئی، میرے ذہن سے ان کے سکون اور اطمینان کا نقشہ نہیں مٹتا۔“

یہ خط پڑھ کر ایک بار پھر میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، لیکن اس خط کو جتنی بار پڑھتا سکون حاصل ہوتا جاتا، دارالمصنفین کی مسجد میں عصر کی نماز کے بعد شاہ صاحب نے اس خط کی تفصیل سب کو سنائی، اس روز حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ العزیز

کے خلیفہ اور سید صاحب کے خواجہ تاش مولانا عبدالغنی صاحب بھی مسجد میں تشریف فرما تھے، ان پر بھی سید صاحب کی عظمت کا بڑا اثر تھا، انھوں نے تفصیل سن کر فرمایا کہ سید صاحب کے وصال کے بعد میرا دل ان کو دیکھنے کے لیے بے چین تھا، چنانچہ میں ایک روز کلام پاک کی تلاوت کر رہا تھا کہ غنودگی آنے لگی اور میں مصلے ہی پر سو گیا، خواب میں دیکھا کہ جمعہ کے روز مسجد میں سید صاحب بہت ہی خوبصورت لباس پہنے ہوئے بیٹھے ہیں، ان کی عبا بھی بہت خوش رنگ ہے، بالکل جوان ہیں اور بڑے حسین و جمیل نظر آرہے ہیں، میں نے ان سے جمعہ کی نماز پڑھانے کو کہا تو انھوں نے مجھ ہی کو امامت کے لیے بڑھادیا، اتنا بیان کرنے کے بعد مولانا نے فرمایا کہ اس خواب کی تعبیر میری سمجھ میں یہ آتی ہے کہ سید صاحب جنت الفردوس میں ہیں، آمین، آمین۔

اے (۱) متاعِ عزتِ پیشین کے پچھلے کارواں  
آہ وہ بھی مٹ گیا باقی جو تھا تیرا نشان  
جس کی اک بات تھی روحِ بلائی کی اذال  
جس کی رگ رگ میں تھیں سوزِ درد کی چنگاریاں  
اب ہمیشہ کے لیے وہ آہ ہم سے چھٹ گیا  
وائے ناکامی ہمارا قافلہ اب لٹ گیا

(۱) یہ اشعار بھی سید صاحب ہی کے ہیں جو انہوں نے اپنے استاد کے نوحہ میں لکھے تھے، جواب ہم خود ان کے لئے اپنے خون دل سے لکھ رہے ہیں۔

## استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی کے سوانح حیات

### ولادت و وطن:

حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت بروز جمعہ بتاریخ ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء مطابق ۲۳ صفر ۱۳۰۲ھ میں دیسہ، ضلع پٹنہ، بہار میں ہوئی، یہ گاؤں پٹنہ کے سب ڈویژن بہار شریف سے مشرق کی جانب آٹھ میل پر واقع ہے، اور ہمیشہ سے بڑا مردم خیز گاؤں رہا ہے، اور یہاں بڑے بڑے اطباء، ڈاکٹر انجینئر اور سرکاری حکام کے علاوہ علماء، فضلاء، صلحاء اور اتقیا پیدا ہوئے۔

### خاندان:

سید صاحب اس گاؤں کے اس خاندان کے لعل بے بہا تھے، جو دینی علوم کے ساتھ دینداری اور تقویٰ میں مدتوں سے ممتاز چلا آتا تھا، نانہال کی طرف سے زیدی اور دھیاں کی طرف سے حسینی سید تھے، ان کے دادا مولوی محمد شیر صاحب المعروف بہ حکیم میر محمدی اپنے زمانے کے مشہور طبیب تھے اور صاحبِ دل صوفی بھی، ان کی ایک کتاب ”نور محمدی“ معارفِ پرلیس اعظم گڑھ میں چھپی ہے جس میں سہروردیہ اور قادریہ سلسلہ کے بزرگوں کے کچھ حالات ہیں، فنِ طب میں انھوں نے دو کتابیں قرا بادین محمدی اور مخزن الحکمة العلویا لکھیں،



ان کی وفات کی تاریخ یہ ہے:

کیا ہوا ثانی بقرط و ارسطاطالیس

۱۳۰۳ھ

سید صاحب کے والد بزرگوار جناب سید ابوالحسن صاحب بھی طبیب حاذق تھے، زہد و تقویٰ و راشت میں ملا تھا، متانت و سنجیدگی، تہذیب و شائستگی اور نفاست و نظافت کے بھی نمونہ تھے، پٹنہ ضلع کے مشہور قصبہ اسلام پور کے رئیس چودھری ظہور الحق اپنے زمانے کے بڑے صاحب ثروت و جاہت رئیس تھے، ان کے گھر کے سب افراد حکیم سید ابوالحسن صاحب کا بے حد احترام کرتے اور ان کے سامنے مؤدب ہو کر بیٹھتے تھے۔

سید صاحب کے بڑے بھائی جناب سید ابوحسب صاحب بھی فن طب میں بڑی مہارت رکھتے تھے، اتباع سنت کا بڑا اہتمام رکھتے تھے، پوری عمر زہد و تقویٰ میں گزری، مجددی سلسلہ میں حضرت شاہ ابوالاحمد صاحب بھوپالی سے بیعت بھی تھے۔

سید صاحب اپنے بڑے بھائی سے اٹھارہ سال چھوٹے تھے، ان کی تاریخ ولادت پر ان کے دادا صاحب نے ایک قطعہ کہا تھا، جس کے دو شعر یہ ہیں:

چو جستیم تاریخ او از خرد یکایک سروشے ز تاریخ و سال  
بگفتا کہ بے داد شد مصرعے شدہ مہر تابان ز برج کمال

۱۳۰۲

یہ تاریخ ایسی نیک ساعت میں کہی گئی تھی کی سید صاحب واقعی برج کمال کا مہر بن کر چمکے، اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ مہر صوبہ بہار کے ایک گاؤں میں ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء کو طلوع ہوا اور اہتر ۲۹ سال کے بعد اسی تاریخ یعنی ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء کو کراچی کے افق میں غروب ہوا۔

ابتدائی تعلیم:

مکتبی تعلیم پہلے اپنے گاؤں کے ایک معلم خلیفہ انور علی اور پھر مولوی مقصود علی

اکھروی سے پائی، اُردو اور فارسی کی ابتدائی کتابیں ختم کرنے کے بعد عربی میں میزان و منشعب اپنے بڑے بھائی مولوی ابوحسب صاحب سے پڑھی، اس زمانے میں ان کے بڑے بھائی کو گاؤں کی مسلمان بی بیوں کو اسلام کی صحیح تعلیم سے آشنا کرنے کی دھن تھی، اور اس کے لیے وہ ہفتہ میں ایک دن ان کے سامنے اس طرح وعظ و تلقین فرماتے تھے کہ سید صاحب بی بیوں کے بیچ میں بیٹھ کر مولانا اسماعیل شہید کی تقویۃ الایمان پڑھتے تھے اور ان کے بڑے بھائی صاحب مرحوم پردہ کے پیچھے سے اس کی تشریح کرتے، اس طرح بھائی جو کچھ کہتے وہ سید صاحب کے دل میں بھی بیٹھتا جاتا، چنانچہ اپنی ایک تحریر میں فرماتے ہیں:

”یہ پہلی کتاب تھی جس نے مجھے دین حق کی باتیں سکھائیں اور ایسی سکھائیں کہ اثنائے تعلیم و مطالعہ میں بیسیوں آندھیاں آئیں اور کتنی دفعہ خیالات کے طوفان اٹھے مگر اس وقت جو باتیں جڑ پکڑ چکی تھیں، ان میں سے ایک بھی اپنی جگہ سے ہل نہ سکی، علم کلام کے مسائل، اشاعرہ و معتزلہ کے نزاعات، غزالی و رازی و ابن رشد کے دلائل یکے بعد دیگرے نگاہوں سے گزرے مگر اسماعیل شہید کی تلقین بہر حال اپنی جگہ پر قائم رہی۔“

بڑے بھائی سے تعلیم پانے کے بعد مزید تعلیم کے لیے اپنے والد بزرگوار کے پاس اسلام پور گئے، وہاں سے ۱۸۹۹ء میں پھلواری شریف پٹنہ آئے، یہاں ایک سال خانقاہ مجیبی میں رہ کر مولانا محی الدین (سجادہ نشین خانقاہ پھلواری شریف) سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، خانقاہ کے بزرگوں کی صحبت میں علم و ادب کا شوق پیدا ہوا، خود سید صاحب اپنی ایک تحریر میں فرماتے ہیں:

”یہاں خانقاہ میں ہر ہفتہ قوالی ہوتی تھی، اس کے اثر سے اس قصبہ میں شعر و سخن کا چرچا تھا، میں نے بھی اس فضا میں سانس لی اور یہیں سب سے پہلے مولوی عبدالحلیم شرر کا ناول منصور موہنا دیکھا، اس کا یہ اثر ہوا کہ جس وقت کتاب ختم کی، پھوٹ پھوٹ کر رویا۔“

یہاں کے قیام کے زمانہ میں شاہ سلیمان صاحب پھلواروی سے منطق کے ابتدائی دو چار سبق بھی پڑھے، پھلواروی سے مدرسہ امدادیہ درجہ تک بھیج دیئے گئے، یہاں چند مہینے رہے اور داخلہ کے پہلے ہی ہفتہ میں وہاں کے طلبہ کی انجمن میں ”تعلیم نسواں“ پر ایک ایسا مضمون پڑھ کر سنایا کہ ہر طرف تحسین و آفریں کا نعرہ بلند ہوا، یہ مضمون پٹنہ کے مشہور اخبار لپنچ میں بھی چھپا۔

ندوہ میں داخلہ:

۱۹۰۱ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے، یہاں سات سال رہ کر تعلیم کی تکمیل کی، طالب علمی کے زمانہ میں بھی متانت و سنجیدگی، تہذیب و شائستگی، مہر و محبت اور خلق و مروت میں ممتاز تھے، یہ اوصاف ان کو اپنے والد بزرگوار سے ورثہ میں ملے تھے، عمر کے ساتھ یہ اوصاف بھی بڑھتے گئے اور ندوہ میں ان کے علمی و ادبی ذوق کی نشوونما اور ترقی ہوتی رہی، دینی علوم کی تحصیل کے ساتھ شعرو سخن کا ذوق بھی ابتدا سے تھا، چنانچہ کم عمری ہی میں اپنے وطن دیسنہ کی انجمن الاصلاح کے سالانہ جلسہ میں ایک طویل ترکیب بند لکھ کر پڑھا جس کا ایک شعر یہ ہے:

سچے کانوں سے نہیں سنتے ہیں ارشادِ نبی

ہیں مسلمان بس اتنے ہی کہ کہلاتے ہیں

اسی زمانے میں امیر مینائی سے زیادہ متاثر تھے، ان کا دیوان مرآۃ الغیب برابر مطالعہ میں رکھتے تھے، دارالعلوم کے مشاعروں میں امیر مینائی ہی کا روپ بھرتے تھے۔

مضمون نگاری کی ابتدا:

ان کا سب سے پہلا مضمون ۱۹۰۳ء میں ”وقت“ کے عنوان سے مخزن لاہور میں چھپا، جس کے ایڈیٹر اس وقت اردو کے مشہور اہل قلم شیخ عبدالقادر تھے، اسی سال سید صاحب نے اپنے وطن کی انجمن الاصلاح کے سالانہ جلسہ میں ”علم اور اسلام“ پر ایک بسیط مضمون

پڑھا، جس کو اہل علم نے پسند کیا اور جو علی گڑھ کے مشہور رسالہ علی گڑھ منٹلی میگزین میں ایڈیٹر کے تعریفی نوٹ کے ساتھ چھپا۔

شاہ سلیمان پھلواروی کی پیشین گوئی:

اس زمانہ میں ندوہ کے معتمد مولانا سید محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا شاہ سلیمان پھلواروی اس کے رکن تھے، یہ دونوں بزرگ سید صاحب کی ذکاوت و ذہانت کی وجہ سے ان پر بے حد شفقت فرماتے تھے، خود سید صاحب بھی مولانا محمد علی مونگیری کی مذہبی اور دینی زندگی سے بہت متاثر ہوئے، غالباً ۱۹۰۳ء میں نواب محسن الملک دارالعلوم ندوہ تشریف لائے اور طلبہ کا امتحان لیا اور ان سے اخبارات پڑھوا کر سنے، اس امتحان میں سید صاحب اول آئے، انھوں نے نواب صاحب کی مدح میں اپنا ایک عربی قصیدہ بھی پڑھ کر سنایا، جس سے نواب صاحب بہت محظوظ ہوئے، اس زمانہ کے اخبارات میں مولانا شاہ سلیمان پھلواروی نے اس قصیدہ کا ذکر کر کے لکھا تھا کہ انشاء اللہ ہر زمانہ میں ایک سلیمان بہار کی سرزمین میں علم اور دین کی خدمت کے لیے موجود رہے گا۔

مولانا شبلی کا سایہ عاطفت:

۱۹۰۵ء میں جب مولانا شبلی دارالعلوم ندوہ کے معتمد تعلیم ہو کر لکھنؤ آئے تو طلبہ نے اس خوشی میں جلسے کیے، تقریریں کیں، نظمیں لکھیں، سید صاحب نے بھی اپنے مسرت کا اظہار ایک فارسی قصیدہ میں کیا جس کا مطلع یہ تھا:

بدہ ساقی مے کو بقلند جلبابِ ظلمانی

خرد را نور بخشد از چراغِ طور ایمانی

یہ پورا قصیدہ حیاتِ شبلی میں درج ہے، مولانا شبلی میں جو ہر شناسی کا خاص مادہ تھا، اس لیے ندوہ میں آتے ہی اس جوہر قابل کو اپنے دامنِ تربیت میں لے لیا، ان کے پاس مصر و شام کے مشہور عربی رسائل اور جدید تالیفات رہتی تھیں، سید صاحب ان کا برابر معاملہ

کرتے رہے، جس سے ان میں جدید عربی ادب کا ذوق پیدا ہوا اور اتنا بڑھا کہ وہ جدید عربی کے بھی اچھے ادیب شمار کیے جانے لگے، ۱۹۰۴ء (جمادی الثانی ۱۳۲۲ھ) میں مولانا شبلیؒ نے ندوۃ العلماء کی طرف سے ”الندوہ“ نکالنا شروع کیا، مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی بھی اس کی ادارت میں شریک تھے، اسی زمانہ میں مولانا شبلیؒ نے سید صاحب سے جرجی زیدان کی کتاب اللغۃ العربیہ کی تلخیص کرائی اور اس کو بہت پسند کیا اور جنوری ۱۹۰۵ء کے ”الندوہ“ میں شائع کیا، سید صاحب نے ”الندوہ“ کے لیے پہلا مضمون ”علم حدیث“ پر لکھا، جس کی داد مولانا حالی نے مولانا شبلیؒ کو دی، مولانا نے سید صاحب کی علمی صلاحیت دیکھ کر ان کی طالب علمی ہی کے زمانہ میں ”الندوہ“ کی دیکھ بھال کا کام ان کے سپرد کر دیا۔

بنائے جامعیت:

مولانا شبلیؒ کی تربیت میں ایک طرف ان کی مضمون نگاری کی مشق جاری رہی، دوسری طرف اپنے استاد مولانا حفیظ اللہ سے علم حدیث اور ہیئت میں علمی شوق کی تشنگی بجھا رہے تھے، اسی زمانہ میں شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کے رسالہ عجالتہ نافعہ کے پڑھنے سے ان کو علم حدیث سے دل چسپی پیدا ہوئی، پھر بستان المحدثین کے مطالعہ نے اس کا شوق اور بھی زیادہ کر دیا اور آخر میں ائمہ محدثین میں سے امام مالک نے ان کے دل پر قبضہ کر لیا اور موطا امام مالک سے بڑی گرویدگی پیدا ہو گئی، پھر حافظ ذہبی کی تذکرۃ الحفاظ اور حافظ ابن حجر کی فتح الباری کے مطالعے سے محدثین کے کارناموں سے زیادہ واقف ہوئے۔

حدیث کے شوق نے رجال کی طرف اور رجال نے تاریخ کی طرف رہنمائی کی اور اس سلسلہ میں ابن ندیم کی کتاب الفہرست، حاجی خلیفہ کی کشف الظنون اور ابن خلکان کی وفیات کا مطالعہ کرتے رہے، اپنی ایک تحریر میں فرماتے ہیں کہ میں نے ابن خلکان کی کتاب اتنی دفعہ پڑھی کہ اس کے حواشی اور حوالوں سے اس کے اول اور آخر کے صفحے بھر گئے ہیں۔

منطق، فلسفہ اور ادب عربی کا ذوق مولانا فاروق چریا کوٹی کے درس میں پیدا ہوا اور جب مولانا شبلیؒ سے دلائل الاعجاز پڑھی، تو اس سے بہت متاثر ہوئے اور اسی سے عربی لکھنے اور بولنے کی مشق پیدا کی، حماسہ اور نقد الشعر کے مطالعہ نے اس ذوق پر اور جلا دی اور ان میں عربی نظم کا بھی ذوق پیدا ہو گیا۔

فقہ مفتی عبداللطیف صاحب سے پڑھی، علم کلام کا شوق تمام تر مولانا شبلیؒ کی تربیت کا نتیجہ تھا، طالب علمی ہی کے زمانہ میں شہرستانی اور ابن حزم کی الملل والنحل، ابن رشد کی کشف الاذلہ اور شاہ ولی اللہ صاحب کی حجتہ اللہ البالغہ کے مطالعہ نے یکے بعد دیگرے اپنا رنگ دکھایا۔

عربی میں مضمون نگاری:

دارالعلوم ندوہ میں مصرو شام سے عربی اخبارات المومند اور اللواء وغیرہ آیا کرتے تھے، سید صاحب ان کو بالاتزام پڑھتے تھے، لکھنؤ کے مشہور اخبار اودھ بیچ کے ادارہ نے ان سے عربی مضامین کے اردو کے ترجمے بھی کرانا شروع کیے، اس زمانہ میں مولانا عبداللہ عمادی صاحب عربی میں ایک رسالہ البیان نکالا کرتے تھے، سید صاحب نے بھی اس میں عربی کے چند مضامین لکھے، اسی زمانہ میں ان کی تحریریں مصر کے اخبار المنار میں بھی شائع ہوئیں۔

خطیبانہ انداز کی پسندیدگی:

۱۹۰۷ء میں ندوہ کے فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی کا پہلا جلسہ رفاه عام لکھنؤ میں ہوا، اس جلسہ کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں جدید و قدیم علوم کے ماہرین دارالعلوم ندوہ کے بلند بانگ دعووں کا امتحان کرنا چاہتے تھے، اس سلسلہ میں سید صاحب نے ”علوم جدید و قدیم“ کے موازنہ پر اردو میں تقریر کی، تقریر کے دوران میں کسی نے اٹھ کر کہا کہ اگر یہ عربی میں تقریر کریں تو ندوہ کی تعلیمی کرامات کا ہم یقین کریں، سید صاحب نے اسی وقت عربی

میں ایسی تقریر کی کہ لوگ حیرت میں آ گئے، مولانا شبلیؒ نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ یہ تقریر پہلے سے تیار کر کے لائے ہیں، اگر کوئی صاحب چاہیں تو اسی وقت موضوع مقرر کر دیں یہ تقریر کریں گے، حاضرین میں سے خواجہ غلام الثقلین نے یہ موضوع دیا کہ ”ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیوں کر ہو“ سید صاحب نے بغیر کسی توقف کے فصیح و صیح عربی میں تقریر شروع کر دی، یہ دیکھ کر پورا جلسہ حیرت ہو گیا اور ہر طرف سے نعرہ ہائے آفریں بلند ہونے لگے، مولانا شبلیؒ نے غایت خوشی میں اپنے سر سے عمامہ اتار کر شاگرد کے سر پر باندھ دیا، یہ ہندوستان کی عربی تعلیم کی تاریخ میں بالکل نیا واقعہ تھا، اس لیے اس کا غلغلہ سارے ملک میں پھیل گیا۔

### الندوہ کی سب ایڈیٹری:

سید صاحب ۱۹۰۷ء میں جب ندوہ سے فارغ ہوئے تو مولانا شبلیؒ نے ان کو ”الندوہ“ کا سب ایڈیٹر مقرر کیا، اسی سال انھوں نے ”علم ہیئت اور مسلمان“ ”عربی زبان کی وسعت“ ”طبقات الارض“ ”برنابا کی انجیل“ ”مسئلہ ارتقاء اور قرآن مجید“ وغیرہ مختلف موضوعوں پر مضامین لکھ کر اپنے جامع الفنون ہونے کا ثبوت دیا، ان مضامین میں ان کے استاد ہی کے تحقیق اور ادبی رنگ کی جھلک تھی، جو رفتہ رفتہ اور بھی نمایاں ہوتی گئی، ”الندوہ“ کے مضامین سے ان کی شہرت علمی حلقے میں بڑھتی گئی اور اب وہ کبھی کبھی مولانا شبلیؒ کے بجائے ”الندوہ“ کے شذرات بھی لکھنے لگے۔

۱۹۰۸ء کے ”الندوہ“ میں انھوں نے جو مضامین لکھے ان میں ایمان بالغیب اور مکررات القرآن کی داد مولانا شبلیؒ نے ایک مکتوب میں لکھ کر دی اور ان کے تصنیفی سلیقہ پر اظہار مسرت کیا۔

### ندوہ کی مدرسی:

۱۹۰۸ء میں وہ ”الندوہ“ میں علم کلام اور عربی ادب کے استاد مقرر ہوئے اور اسی

درس تدریس کے زمانہ میں انھوں نے درس الادب کے نام سے دو عربی ریڈر میں لکھیں جواب تک مقبول ہیں۔

۱۹۰۹ء کے ”الندوہ“ کے مختلف نمبروں میں ان کا مشہور مضمون ”خواتین اسلام کی شجاعت“ شائع ہوا، جو اس قدر پسند کیا گیا کہ اس کو علاحدہ رسالہ کی صورت میں بھی چھاپا گیا، اور اس وقت سے اب تک اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں اور اب اس کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہو گیا ہے، اس زمانہ کے دوسرے مضامین میں ”اسلامی رصد خانے“ کو بھی بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور بعد میں اس کا بھی انگریزی میں ترجمہ ہوا۔

### تدوین لغات جدیدہ:

فروری ۱۹۱۰ء تک ”الندوہ“ کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے، اسی سال ندوہ کے سالانہ اجلاس دہلی میں طے ہوا کہ عربی کے جدید الفاظ کی ایک ڈکشنری ترتیب دی جائے، یہ کام سید صاحب کے سپرد کیا گیا، جس کو انھوں نے دو برس میں پورا کر کے ۱۹۱۲ء کے اجلاس لکھنؤ میں جن کے صدر علامہ سید رشید رضا مصری ایڈیٹر المنار تھے پیش کیا، یہ ڈکشنری لغات جدیدہ کے نام سے چھپ کر شائع ہوئی، جس سے اب بھی عربی مدارس کے طلبہ کو بڑی مدد ملتی ہے۔

### سیرۃ النبی کی تالیف میں شرکت:

۱۹۱۰ء میں جب مولانا شبلیؒ نے سیرۃ النبی کی تدوین و ترتیب کا ایک شعبہ قائم کیا تو سید صاحب اُس کے لٹریری اسسٹنٹ ہوئے اور اس کام میں استاد کی اعانت کے ساتھ ساتھ ”الندوہ“ میں آپ مضامین بھی لکھتے رہے، اگست ۱۹۱۱ء میں ”الندوہ“ کی ادارت کا بار پھر ان پر ڈالا گیا اور وہ یہ خدمت مئی ۱۹۱۲ء تک انجام دیتے رہے، جس کے بعد اس ”الندوہ“ کا خاتمہ ہو گیا، جس کے ایڈیٹر مولانا شبلیؒ اور مولانا حبیب الرحمن خاں شیروائی تھے، اُن کے اس دور کے مضامین میں ”اشتراکیت اور اسلام“ ”اسماء القرآن“ اور ”فنائے

ماڈہ“ کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی، ۱۹۱۱ء کے وسط میں انھوں نے سیالکوٹ کی انجمن شبان المسلمین میں ایک خطبہ دیا، جو ”مذہب اسلام اور عقل“ کے عنوان سے جولائی ۱۹۱۱ء کے ”الندوہ“ میں شائع ہوا۔

### الہلال کی ادارت میں شمولیت:

۱۹۱۱ء میں اٹلی نے جب طرابلس پر حملہ کیا، تو اس سے پورے ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک شور برپا ہو گیا اور ان کی سیاسیات میں اُبال آ گیا، سید صاحب بھی اس سے متاثر ہوئے ان کے استاد مولانا شبلیؒ کی سیاست میں آزادی کے حامی تھے، اور اسلامی سیاست میں اتحاد اسلامی پر ایمان رکھتے تھے، اسی کا اثر ان کے شاگردوں پر بھی ہوا، چنانچہ سید صاحب خالص علمی مشاغل چھوڑ کر سیاست میں آئے، جولائی ۱۹۱۲ء میں سید صاحب الہلال کے اسٹاف میں شامل ہو گئے، یہ وہ زمانہ تھا، جب کہ یورپ کی بڑی سلطنتوں کی شہ پا کر بلقان کی ریاستوں نے ترکی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تھا اور دوسرے اسلامی ممالک کی طرح ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات کا سمندر بھی جوش میں آ گیا تھا، ابھی یہ شور محشر بپا ہی تھا کہ اگست ۱۹۱۳ء میں کانپور کی مسجد کے انہدام کا واقعہ پیش آ گیا، جس میں نہتے مسلمانوں اور ان کے معصوم بچوں پر بے دردی سے گولیاں چلائی گئیں، اس خونیں سانحہ نے تمام ہندوستان کو پر شور بنادیا، سید صاحب نے ۱۲/۱۲/۱۹۱۳ء کے الہلال میں اپنے خون دل سے ”مشہد اکبر“ کے عنوان سے ایک درد انگیز مضمون لکھا جس کی ایک ایک سطر اور ایک ایک جملہ میں اُن کی مذہبی حمیت، ملی غم خواری اور قومی درد کا طوفان اُٹا پڑتا تھا، یہ مضمون الہلال کے جس پرچہ میں شائع ہوا، وہ حکومت نے ضبط کر لیا، الہلال میں انھوں نے اور بھی پر زور مضامین لکھے، اُن کے طرز نگارش میں چوں کہ ابوالکلام ہی کا رنگ تھا اور مضمون نگاروں کے نام شائع نہیں ہوتے تھے، اس لیے بعض مضامین مولانا ابوالکلام کی جانب منسوب ہو گئے، خود سید صاحب نے رسالہ مستقبل

کراچی (اکتوبر ۱۹۳۹ء) میں تحریر فرمایا ہے:

”الہلال میں چوں کہ مضمون نگاروں کے نام نہیں لکھے جاتے تھے اس لیے الہلال کے مضمونوں کے مجموعوں کے شائع کرنے والوں نے بلا تحقیق ہر مضمون کو مولانا ابوالکلام صاحب کی طرف منسوب کر دیا ہے، حالاں کہ یہ صحیح نہیں، الحریۃ فی الاسلام، تذکار نزول قرآن، حبشہ کی تاریخ کا ایک ورق، قصص بنی اسرائیل، مشہد اکبر وغیرہ میرے مضامین ہیں۔“

### دکن کالج پونہ کی پروفیسری:

سیاسی واقعات میں کچھ سکون پیدا ہوا تو سید صاحب پھر مولانا شبلیؒ کے دفتر سیرت میں لکھنؤ آ گئے لیکن جلد ہی ۱۹۱۲ء کے آخر میں مولانا شبلیؒ کے ایما سے بمبئی یونیورسٹی کے ماتحت دکن کالج پونہ میں السنہ مشرقیہ کی معلّیٰ قبول کر لی، اب وہ ملک میں ممتاز اہل علم کی صف میں شمار کیے جانے لگے، اس لیے مذہبی اور تعلیمی جلسوں میں ان کی طلب شروع ہوئی۔

### تدوین ارض القرآن:

ان مشاغل کے ساتھ پونہ کے قیام کے زمانے میں ایک اہم تصنیف ارض القرآن کی تالیف شروع کی، جس میں قدیم عرب کے جغرافیہ، اقوام عرب کی پرانی مذہبی اور تمدنی تاریخ پر محققانہ بحث کی گئی ہے اور قرآن مجید کے بیانات سے اس کی مطابقت دکھائی گئی ہے، جس زمانہ میں وہ دفتر سیرت میں کام کر رہے تھے، اسی وقت سے اس کے لیے مواد کی فراہمی شروع کر دی تھی، پونہ میں اس کی پہلی جلد ترتیب دی اور دوسری جلد کے لیے مواد فراہم کیا اور یہیں بیٹھ کر الہلال کے لیے ”علوم القرآن“ کے عنوان سے ایک مضمون بھی لکھا تھا۔

### رحلت استاد:

پونہ گئے ابھی ڈیڑھ سال بھی نہ ہوا تھا کہ ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو مولانا شبلیؒ جنت کو

سدھارے، مرض الموت میں شفیق استاد نے محبوب شاگرد کو تار دے کر بلوایا اور جب وہ پہنچے تو مولانا نے معاہدہ کے طور پر شاگرد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا: ”سیرت (یعنی سیرۃ النبی) میری تمام عمر کی کمائی ہے، سب کام چھوڑ کر سیرت تیار کرو“ سعادت مند شاگرد نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا ”ضرور ضرور“۔

وہ شفیق استاد اور مربی کی وفات سے بہت متاثر ہوئے اور تاثرات کا اظہار ”نوحہ استاد“ میں کیا ہے جس کا مطلع یہ ہے:

اے متاعِ عزتِ پیشین کے پچھلے کارواں

آہ وہ بھی مٹ گیا باقی جو تھا تیرا نشان

اخباروں میں یہ نوحہ شائع ہوا تو عزیز لکھنوی، مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی اور مولانا حمید الدین فراہی نے سید صاحب کے سخن وری اور سخن سنجی کی داد دی لیکن عماد الملک بلگرامی نے ان کو شعر و سخن کی طرف مائل ہونے سے روکا اور انھوں نے ان کی نصیحت قبول کی، کبھی کبھی اشعار کہہ لیتے تھے لیکن اپنے کو ”غیر فطری شاعر“ کہتے تھے، گو اربابِ نظر نے ان کی شاعری کی بھی داد دی ہے، ڈاکٹر اقبال نے اپنے ایک مکتوب مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۱۶ء میں ان کو لکھا ہے کہ:

”آپ کی غزل لا جواب ہے، بالخصوص یہ شعر مجھے بڑا پسند آیا:

ہزاروں بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں

وہ ایک قطرہٴ خوں جو رگِ گلو میں ہے

مولانا شبلی مرحوم و مغفور نے تاریخی واقعات کو نظم کرنا شروع کیا تھا اور جو چند نظمیں انھوں نے لکھی تھیں، نہایت مقبول ہوئیں، غزل کے ساتھ وہ سلسلہ بھی جاری رکھیے۔“

شاید اسی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے سید صاحب کبھی کبھی اس قسم کی نظمیں کہہ لیا کرتے تھے۔

تاسیس دارالمصنفین:

مولانا شبلی نے اپنی وفات سے پہلے دارالمصنفین کا ایک خاکہ تیار کیا تھا لیکن اس کو عملی جامہ پہنانہ سکے تھے، سید صاحب ان کی رحلت کے بعد پونہ کی ملازمت چھوڑ کر اعظم گڑھ چلے آئے اور مولانا مسعود علی صاحب ندوی کے انتظامی تعاون اور مولانا عبدالسلام صاحب ندوی کے علمی اشتراک سے ۱۹۱۵ء میں دارالمصنفین کی بنیاد ڈالی، یہ گویا بغداد کے دارالحکمت کا تخیل ہندوستان کے ایک شہر اعظم گڑھ کی سرزمین پر نمودار ہوا۔

سید صاحب نے اپنی تصنیف ارض القرآن کی پہلی جلد کی اشاعت سے دارالمصنفین کے تصنیفی کام کی ابتدا کی اور جب وہ اہل علم کے سامنے آئی تو ان کو دارالمصنفین کے علمی کام کی نوعیت اور سید صاحب کی تحقیقات اور ان کے علم و نظر کی وسعت کا اندازہ ہوا۔

انجمن ترقی اردو کی صدارت:

اسی سال انجمن ترقی اردو کا سالانہ اجلاس پونہ میں ہوا، جس کی صدارت سید صاحب نے کی، اس میں انھوں نے جو خطبہ صدارت پڑھا وہ آگے چل کر اردو کی تاریخ پر تحقیق کرنے والوں کے لیے دلیل راہ بنا۔

سیاسی مشاغل:

اس علمی وادبی زندگی کے ساتھ سیاسی مشاغل بھی جاری رہے، ۱۹۱۴ء کے آخر میں جب ٹرکی نے جنگ عظیم میں شرکت کی، تو ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی جوش پیدا ہوا اور ان کے سیاسی لیڈر قید و بند میں ڈال دیئے گئے اس موقع پر جو نیا گروہ ان کی قائم مقامی کے لئے بڑھا اس میں سید صاحب بھی تھے، چنانچہ ۱۹۱۵ء سے لے کر ۱۹۱۶ء تک انھوں نے مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے ساتھ سیاسی تحریکات میں حصہ لیا۔

## رسالہ معارف کا اجرا:

لیکن اب ان کا اصلی مرکز توجہ دارالمصنفین تھا، ابھی تک اس کا کوئی آرگن نہ تھا، اس لیے ۱۹۱۶ء کے رمضان المبارک میں معارف کا پہلا پرچہ ان کی ادارت میں نکلا، اس کا اجرا ایسے مبارک مہینہ میں ہوا کہ اس کی روشنی سے علمی دنیا آج تک منور ہے، معارف کے پہلے نمبر میں اُن کا مقالہ ”روزہ“ پر تھا، شروع کے نمبروں میں بیش تر مضامین ان ہی کے ہیں، رسالہ کی ادارت کے فرائض کے ساتھ استاذ مرحوم کے چھوڑے ہوئے مسودات اور سیرۃ النبی کی ترتیب و تبویب میں بھی مشغول رہتے، رفقاء کے لیے علمی لائحہ عمل تیار کرنے اور دارالمصنفین کے مریبوں اور ہم دردوں کا حلقہ پیدا کرنے کا بار بھی ان ہی پر تھا۔

## دارالمصنفین کے فروغ میں جان کاہ کوشش:

دارالمصنفین کے قیام کے آغاز سے آخر وقت تک ان کا یہ معمول تھا کہ فجر کی نماز کے بعد ناشتہ کر کے کتب خانہ میں آجاتے، ۱۲ بجے تک دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر کام کرتے، پھر کھانا کھا کر کچھ قبولہ فرماتے، ظہر کی نماز کے بعد پھر کتب خانہ میں تشریف لاتے اور عصر تک کام میں مشغول رہتے، عصر کی نماز کے بعد چائے پیتے، اس وقت رفقاء دارالمصنفین سے علمی، مذہبی، سیاسی اور تفریحی باتیں کرتے، مغرب کی نماز کے بعد بھی کام کا سلسلہ جاری رہتا، مگر جب کثرت محنت سے صحت خراب رہنے لگی، تو رات کو کام کرنا چھوڑ دیا تھا لیکن دن بھر محنت شاقہ کرتے، جب علمی، مذہبی اور سیاسی جلسوں میں شرکت کے لیے سفر میں جاتے تو شدید علمی ریاضت سے چھٹکارا اور کچھ آرام مل جاتا۔

دارالمصنفین کے کتب خانہ، پریس اور دفتر کے تمام کارکنوں سے اس طرح مہر و محبت اور لطف و شفقت سے پیش آتے تھے کہ ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ سب سے زیادہ اسی کو محبوب رکھتے ہیں اور وہ ان کی خوشنودی اور رضا مندی کی خاطر بڑی تن دہی اور دل سوزی سے کام کرتا، ان کی زندگی کا اصلی کارنامہ دارالمصنفین ہی ہے، جس کو وہ اپنی اولاد کی طرح

## عزیز رکھتے تھے۔

اُن کے حسن نیت کی وجہ سے دارالمصنفین کا علمی وقار ملک میں جلد ہی قائم ہو گیا، چنانچہ ابھی اس کو قائم ہوئے دو سال بھی نہیں گزرے تھے کہ مہاراجہ بڑودہ کی طرف سے بڑے پیمانہ پر موازنہ مذاہب کا ایک ادارہ ایک فرانسیسی کی نگرانی میں قائم ہوا تو اسلامی علوم و مسائل کی تحقیقات اور رفع شبہات کے لیے دارالمصنفین ہی مرجع قرار پایا۔

## جلسہ علمائے بنگالہ کی صدارت:

۱۹۱۷ء میں علمائے بنگالہ کے کلکتہ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کی، جس میں تمام رہنمایان ہندو شریک تھے، اسی کے ساتھ کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس بھی ان ہی تاریخوں میں تھے، اس لیے مجلس علمائے بنگالہ کا یہ جلسہ بڑا اہم تھا، اس میں سید صاحب نے جو خطبہ پڑھا وہ بنگال میں بڑا اثر انداز ہوا، یہ پہلا خطبہ تھا جس میں جنگ کے ہیبت ناک اثرات کے باوجود مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کا نام جو اس زمانہ میں نظر بند تھے، جرأت کے ساتھ لیا گیا، اس سے لوگوں کے دلوں سے انگریزوں کا رعب اٹھا۔

## ۱۹۱۷ء کے علمی کام:

۱۹۱۷ء کے علمی مضامین میں ”اہل السنّت والجماعت“ بڑا مقبول ہوا، پہلے یہ معارف کے کئی نمبروں میں شائع ہوا تھا، پھر رسالہ کی صورت میں چھپا، اس کا ترجمہ ملیالم، تملگو اور بنگلہ میں بھی ہوا، اسی سال ان کی کتاب ”حیاتِ امام مالک“ شائع ہوئی، ان کو امام مالک سے خاص عقیدت اور ان کی مؤطا، صحیحین سے زیادہ پسند تھی، گو آخر عمر میں جزوی مسائل میں بھی امام ابوحنیفہ کے مسلک کے پابند ہو گئے تھے لیکن امام مالک سے عقیدت قائم رہی، ۱۹۱۷ء کے اندودہ میں ”حیاتِ امام مالک“ کے عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھا تھا جو کئی نمبروں میں شائع ہوا تھا اور تقریباً ۸۵ صفحے پر مشتمل تھا، اس کو اور زیادہ مکمل کرنے کا برابر ارادہ کرتے رہے مگر دوسرے کاموں کی مشغولیت نے اس کا موقع نہ دیا، اس لیے اسی

مضمون کو رسالہ کی صورت میں شائع کر دیا، یہ کچھ ایسا مقبول ہوا کہ اس کی مانگ ابھی تک جاری ہے اور اس کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

### سیرۃ النبی جلد اول کی اشاعت:

۱۹۱۸ء میں اپنے استاذ مرحوم کی سیرۃ النبی جلد اول مرتب کر کے ملک کے سامنے پیش کی جس کے غلغلہ سے ہندوستان کا گوشہ گوشہ گونج رہا تھا، اس کی اشاعت پر سید صاحب نے بجا طور لکھا تھا:

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

### ارض القرآن جلد دوم کی اشاعت:

اسی سال ان کی محققانہ تصنیف ارض القرآن کی دوسری جلد بھی شائع ہوئی، جس میں اقوام عرب کے لسانی، مذہبی، تجارتی اور تمدنی حالات پر بحث ہے، اس سے ان کی علمی شہرت میں اور بھی زیادہ اضافہ ہوا، ۱۹۳۶ء میں مولوی سید مظفر الدین ندوی ایم۔ اے۔ نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا، اور معلومات میں اضافہ کر کے اس میں انگریزی کے لحاظ سے بعض ترمیمیں اور تغیرات کیے۔

۱۹۱۸ء کے معارف میں ان کے جو مضامین شائع ہوئے ان میں ”ہندوؤں کی علمی اور تعلیمی ترقی میں مسلمانوں کی کوششیں“ کی طرف خاص طور پر لوگوں کی نظر اٹھی، اس میں ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے کی کوشش کی گئی ہے، ارباب تحقیق کو اس سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ سید صاحب کی نظر تاریخ ہند پر بھی کتنی گہری ہے، اس مضمون کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

### تحریک خلافت:

۱۹۱۹ء کا سال ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے بڑا پر آشوب تھا، پہلی جنگ عظیم کے بعد اسلامی ممالک خصوصاً ترکی پر سخت وقت آیا، اس کے حصے بخرے کیے جا رہے تھے،

ترکی کا سلطان قسطنطنیہ میں اتحادیوں کے ہاتھوں بے بس ہو رہا تھا، اتحادی فتح کے غرور کے نشے میں خدا کی خدائی کی شکست و ریخت میں مصروف تھے اور ملکوں کی قسمت کا فیصلہ کر رہے تھے، اس وقت ہندوستان کے چند بہادر غیور اور دردمند مسلمان رہنماؤں نے اپنی جانوں پر کھیل کر مجلس خلافت کے نام سے ایک مرکزی مجلس بمبئی میں قائم کی جس کی شاخیں سارے ہندوستان میں پھیل گئیں، اس مجلس میں مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی نے ایسی تنظیمی قوت پیدا کر دی کہ پورا ہندوستان اس کی آواز پر اٹھتا اور بیٹھتا تھا، اس تحریک میں سید صاحب بھی پیش پیش رہے، اس کا پہلا اجلاس لکھنؤ میں ہوا، تو انھوں نے علماء اور ارباب سیاست کے درمیان حلقہ اتصال کا کام دیا اور ایسی پُر درد تقریر کی کہ مسند صدارت سے پائین تک ساری مجلس بزم ماتم بن گئی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور چودھری خلیق الزماں وغیرہ کے سارے اختلافات خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے، اسی سال انھوں نے سید الاحرار سید فضل الحسن حسرت موہانی کی رہائی کی تقریب میں ”نظر بندان اسلام“ کے عنوان سے معارف کے کئی نمبروں میں ایک مضمون لکھا، جو بہت پسند کیا گیا۔

### وفد خلافت میں یورپ کا سفر:

فروری ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی کی سرکردگی میں ترکی کے معاملات میں انصاف طلبی اور مسلمانان ہند کے جذبات کی ترجمانی کے لیے ہندوستان سے جو وفد خلافت یورپ گیا تھا، اس کے تین ممبروں میں ایک ممبر یہ بھی تھے، صدر مولانا محمد علی، ارکان سید حسین اور سید صاحب اور سکریٹری حسن محمد حیات تھے، یہ وفد انڈین نیشنلزم اور پین اسلام ازم کو متحد کر کے ہندوستان کی آزادی کی جنگ لڑنے چلا تھا، جب یہ لوگ پورٹ سعید پہنچے اور سید صاحب جامع عباسی میں نماز مغرب پڑھنے کے لیے گئے، تو وہاں ایک بزرگ فقہ کا درس دے رہے تھے، سید صاحب نے ان سے مل کر وفد خلافت کی نوعیت بتائی تو تمام حلقہ درس جوش مسرت سے لبریز ہو گیا اور سب نے وفد کی کامیابی کے لیے دعا کی اور جب سید صاحب



مسجد سے نکلے، تو لوگوں کا اس قدر ہجوم ہوا کہ وہ بدقت جان چھڑا کر آگے بڑھ سکے، اس وفد کے ارکان اٹلی، فرانس اور انگلستان میں ٹرکی کے حقوق کے لیے زبان و قلم اور دعوت و اشاعت کے ذریعہ لڑتے رہے، لندن میں وزیراعظم لارڈ جانسٹون اور لارڈ فشر اور دوسرے ممتاز لیڈروں سے ملنے کے علاوہ حجاز و شام اور مصر کے وفد سے بھی ملاقات کی، حجاز و شام کے وفدوں کے سرگروہ نوری سعید پاشا اور حداد پاشا تھے، سید صاحب نے اُن سے مل کر خلافت و جزیرۃ العرب کے مسائل اور ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات اور اُن کے مذہبی مطالبات بیان کیے، تو وہ سب بہت متاثر ہوئے اور اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، اسی زمانہ میں سعدزاغلول پاشا بھی مصری وفد کے ساتھ لندن آئے ہوئے تھے، ان سے بھی مل کر سید صاحب نے ہندوستانی مسلمانوں کے نقطہ نظر کی وضاحت کی، سعدزاغلول نے اُن کی عربی سے متاثر ہو کر کہا کہ آپ ہم سے بھی اچھی عربی بولتے ہیں، اس سفر میں آرنلڈ، براؤن، اسٹوری اور ماگولیتھ سے بھی ملاقات رہی، پروفیسر مارگولیتھ اور ایک اطالوی مستشرق سے مسئلہ خلافت پر علمی نبرد آزمائی بھی ہوئی اور اس مسئلہ پر مشہور انگریزی مجلہ ”فارن افیئرز“ میں جو مدلل اور جامع مضمون لکھا، اس کی تعریف مولانا محمد علی نے بار بار کی، وفد کے سیاسی کاموں کے ساتھ انڈیا آفس، برٹش میوزیم اور آکسفورڈ اور کمبرج کے کتب خانے بھی دیکھتے رہے، جس سے ان کا یہ سفر علمی حیثیت سے بھی مفید رہا، لندن سے واپسی کے بعد ڈاکٹر اقبال نے ان کو ایک خط میں تحریر فرمایا:

”مراجعت مع الخیر مبارک، آپ نے بڑا کام کیا، جس کا صلہ قوم کی طرف سے شکرگزاری کی صورت میں مل رہا ہے اور دربارِ نبوی سے نہ معلوم کس صورت میں عطا ہوگا، وزرائے انگلستان کا جواب وہی ہے، جو ان حالات میں ہمیشہ دیا گیا،..... تاہم مجھے یقین ہے کہ ہندی وفد کا سفر یورپ بڑے اہم نتائج پیدا کرے گا۔“

واپسی پر قصبہ بہار شریف ضلع پٹنہ کی خلافت کمیٹی نے ان کا شاندار خیر مقدم کیا،

انھوں نے اس کمیٹی کے بڑے اجلاس کی صدارت بھی کی، اس میں صوبہ کے اکابر علماء اور زعماء کے علاوہ بابوراجندر پرشاد (موجودہ صدر جمہوریہ ہند) بھی تھے، جنھوں نے اپنی تقریر میں سید صاحب کی سیاسی بصیرت کو سراہا۔

### سیرۃ النبی جلد دوم کی اشاعت:

لندن جانے سے پہلے استاذ مرحوم کی سیرۃ النبی کی دوسری جلد چھپنے کے لیے دے دی تھی، اس کا دیباچہ لندن ہی سے لکھ کر بھیجا، پہلی جلد نبوت کے پر آشوب عہد غزوات پر مشتمل تھی، دوسری جلد نبوت کے سہ سالہ امن کی زندگی کی تاریخ ہے۔

### سیرت عائشہؓ:

ابھی وہ لندن ہی میں تھے کہ ان کی کتاب سیرت عائشہ شائع ہوئی، جس کا آغاز طالب علمی کے زمانہ میں کیا تھا، مگر اس کی تکمیل بعد میں کی، اس کی اشاعت پر بیگم صاحبہ بھوپال نے پانچ سو روپے انعام مرحمت فرمایا، ڈاکٹر سراقبال نے یہ کتاب پڑھی تو سید صاحب کو تحریف فرمایا کہ:

”سیرت عائشہ کے لیے سراپا سپاس ہوں، یہ ہدیہ سلیمانی نہیں سرمہ سلیمانی ہے، اس کتاب کو پڑھنے سے میرے علم میں بہت مفید اضافہ ہوا، خدائے تعالیٰ جزائے خیر دے۔“

### ترکِ موالات:

۱۹۲۰ء کے آخر میں یورپ کے سفر سے واپس ہوئے تو ترکِ موالات کی تحریک ہندوستان میں شروع ہو گئی اور مجلسِ خلافت اور کانگریس کے پلیٹ فارم مشترک ہو گئے، سید صاحب نے بھی دوسرے علماء اور زعماء کے ساتھ مل کر ترکِ موالات کی تحریک کی سلسلہ میں ملک کا دورہ کیا، اخبارات میں مضامین لکھے، جا بجا تقریریں کیں، ۱۹۲۱ء میں مجلسِ خلافت کا جو سالانہ اجلاس میرٹھ میں منعقد ہوا تھا، اس کی صدارت کی، اسی سال ”خلافت

عثمانیہ اور دنیاۓ اسلام“ اور ”خلافت اور ہندوستان“ کے عنوان سے دو اہم تاریخی مضامین معارف کے کئی نمبروں میں لکھے، جو علاحدہ علاحدہ رسالوں کی صورت میں بھی شائع ہوئے، ان رسالوں سے تحریک خلافت کو بڑی مدد ملی، ۱۹۲۱ء کی کانگریس احمد آباد میں منعقد ہوئی تو اس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر نامزد کیے گئے اور سال بھر تک خلافت کے ساتھ کانگریس کے کاموں میں شریک رہے، جمعیتہ العلماء کی مجلس عاملہ کے بھی رکن مقرر ہوئے۔

### دارالمصنفین کی شہرت:

۱۹۲۲ء تک دارالمصنفین کی شہرت میں چار چاند لگ چکے تھے، سیرۃ النبی کی دو جلدوں اور سید صاحب کی تصانیف کے علاوہ مولانا عبدالسلام ندوی کی اسوۃ صحابہ اور سیرۃ عمر بن عبدالعزیز، مولوی یونس فرنگی محلی کی روح الاجتماع، مولوی عبدالباری صاحب ندوی کی برکے اور مبادی علم انسانی اور مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی ”مباری فلسفہ“ اور مکالمات برکے، پروفیسر سجاد مرزا کی الاستدلال، تسہیل البلاغت، وغیرہ جیسی سنجیدہ کتابوں اور معارف کے بلند پایہ علمی تحقیقی مضامین نے تمام اصحاب علم و نظر کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا اور اردو زبان کا لٹریچر ایک نئے نہج میں ڈھلنے لگا، ڈاکٹر اقبال نے معارف کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا کہ یہی ایک ایسا سالہ ہے جس کے پڑھنے سے حرارت ایمانی میں ترقی ہوتی ہے، مولانا محمد علی مرحوم کو بھی معارف سے بڑا انس ہو گیا تھا، چنانچہ وہ اپنے ایک مکتوب مورخہ ۴ دسمبر ۱۹۱۹ء میں سید صاحب کو لکھتے ہیں:

”میرے متعدد انگریزی رسالوں کی جلدیں نہیں بندھی ہیں اور ممکن ہے کہ میرے عزیز دوست اور سارق کتب سید جالب صاحب ان میں سے اکثر پر قبضہ بھی کر بیٹھے ہوں، یہ شرف خاص معارف کو حاصل ہوگا کہ مجلدات تیار کرائی جائیں گی۔“

مولانا ابوالکلام آزاد اپنے ایک خط میں سید صاحب کو تحریر فرماتے ہیں:

”معارف کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں، صرف یہی ایک پرچہ ہے اور تو ہر طرف سناٹا ہے، محمد اللہ کی مولانا شبلی مرحوم کی تمنائیں رائگاں نہ گئیں اور صرف آپ کی بدولت ایک ایسی جگہ بن گئی جو صرف خدمتِ علم و تصنیف و تالیف کے لیے وقف ہے۔“

معارف اور دارالمصنفین کی شہرت بیرون ہند میں بھی پھیلتی جا رہی تھی، چنانچہ اسی زمانہ میں ڈاکٹر نکلسن (کمبیرج یونیورسٹی) نے ان کے ناقدانہ مباحث، علمی مقالات، مستشرقانہ معلومات اور مشرقی و مغربی علوم و خیالات کی آمیزش کی داد دی، اور اس حیثیت سے ہندوستان کی ترقی پر اپنی خوشی کا اظہار کیا، پھر فرانس کے مشہور مستشرق موسیو لوز ماسینان نے اپنے ایک لکچر ”اسلام میں پیشہ کی اجتماعی حیثیت“ کے سلسلے میں دارالمصنفین سے تعاون چاہا۔

### بہار خلافت کانفرنس کی صدارت:

۱۹۲۳ء میں صوبہ بہار کی خلافت کانفرنس کی صدارت کی، اس کے خطبہ میں جزیرۃ العرب کی پوری تاریخ کی سرگزشت تھی۔

### سیرۃ النبی جلد سوم کی اشاعت:

۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۳ء تک اپنی تصنیف سیرۃ النبی کی تیسری جلد کی تدوین میں مشغول رہے، جو ۱۹۲۴ء میں چھپ کر مشتاق نگاہوں کے سامنے آئی، اس میں معجزہ کی حقیقت، اس کے امکان و وقوع پر فلسفہ قدیمہ، علم کلام، فلسفہ جدیدہ اور قرآن مجید کے نقطہ ہائے نظر سے مبسوط تبصرہ ہے، اور اس کے بعد مکالمہ الہی، وحی، نزول ملائکہ و عالم رویا، معراج اور شرح صدر کا بیان ہے، اس کی ترتیب، واقعات کی تفتیش و تلاش اور مسائل و نظریات کی بحث و تحقیق میں جو محنت و کاوش اور دیدہ ریزی کی گئی ہے اس سے ان کا علمی پایہ اور بھی بلند ہوا۔

## وفدِ حجاز کی صدارت:

اسی سال یعنی ۱۹۲۴ء میں ہی ابن سعود اور شریف حسین میں جنگ کا آغاز ہوا، دونوں نے مجلسِ خلافت کی طرف ہاتھ بڑھایا، اس وقت مسلمانانِ ہند نے سید صاحب کی قیادت میں ایک وفدِ حجاز کو بھیجا، تاکہ وہ طرفین کے سامنے مجلسِ خلافت کی تجاویز کو پیش کرے، سید صاحب نے دو ماہ جدہ میں رہ کر مفوضہ فرائض انجام دئے اور بڑی دلیری سے شریف حسین اور سلطان ابن سعود کی حکومتوں سے حجاز میں مسلمانوں کی ایک جمہوری حکومت کے قیام کے مسئلہ پر گفتگو اور خط و کتابت کرتے رہے، ایک جلسہ میں ایسی پر جوش تقریر کی کہ شریف حسین کے ایک حبشی سفرتی نے تقریر کے بعد کہا کہ اگر یہ وفدِ انگریزوں کی پناہ میں نہ ہوتا تو ہم صدر وفد کو گولی مار دیتے، جب وفد کے مشن میں سید صاحب کو ناکامی ہوئی تو مصر کا رخ کیا اور وہاں کے علماء و اکابر سے مل کر حجاز کے معاملہ پر گفتگو کی، شیخ ازہر نے ان کی تجاویز سے اپنی رضامندی ظاہر کی، یہ اس وفد کی ایسی کامیابی تھی کہ دنیا کے تمام اخبارات نے اس کو نمایاں سرخیوں سے مشتمل کیا، اس سفر میں سید صاحب نے حجاز کے تعلیمی حالات کا بھی گہرا مطالعہ کیا، جس کو مضمون کی شکل میں معارف (مئی ۱۹۲۵ء) میں شائع کیا۔

## ندوة العلماء کے کام:

یوں تو ندوہ کے معتمد تعلیمات کی حیثیت سے ہمیشہ اس سے دلچسپی لیتے رہے لیکن ۱۹۲۵ء میں اس کی طرف خاص توجہ کی اور فوری میں اس کا سالانہ جلسہ بڑے اہتمام سے کرایا جس میں علماء اور خواص نے بڑی تعداد میں شرکت کی، ندوہ کو ایک دارالاقامہ کی سخت ضرورت تھی، سید صاحب کی تحریک سے اس جلسہ میں یہ قرار پایا کہ ہندوستان کے ہر صوبہ کی طرف سے دس دس کمروں کا ایک بلاک تیار کیا جائے مختلف صوبوں کے اکابر نے اس پر آمادگی ظاہر کی اور اس اجلاس کے بعد سید صاحب نے خود صوبہ بہار کا دورہ کر کے اس مقصد کے لیے ایک گراں قدر رقم جمع کی۔

## خطباتِ مدراس:

اسی سال اکتوبر اور نومبر میں مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن آف موڈرن انڈیا کی دعوت پر سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤں پر آٹھ خطبے دیئے جو بعد میں خطباتِ مدراس کے نام سے شائع ہوئے، ان خطبوں کے خلاصے وہاں کے روزانہ انگریزی اخبار ”ہندو“ اور ”ڈیلی اکسپریس“ میں برابر نکلتے رہے اور بہت دلچسپی سے پڑھے گئے، یہ اپنے مضامین و مباحث، ادب و انشا اور زورِ خطابت کے لحاظ سے اردو لٹریچر کے شاہکار سمجھے جاتے ہیں اسی سفر میں بنگلور، وانمباڑی اور تریپا تورا جا کر بھی مختلف مذہبی عنوانات پر خطبے دیئے۔

## جمعیتہ العلماء کی صدارت:

مارچ ۱۹۲۶ء میں جمعیتہ العلماء کا جو اہم سالانہ اجلاس کلکتہ میں ہوا، اس کے وہ صدر منتخب ہوئے، اس موقع پر انھوں نے جو خطبہ صدارت پڑھا، وہ مسلمانوں کی سیاست میں یادگار ہے۔

## پھر وفدِ حجاز:

اسی سال پھر وفد کے صدر منتخب ہوئے، اس وقت ہندوستان میں شدھی اور سنگٹھن کا زور تھا، اس موقع پر دہلی میں مجلسِ خلافت کا ایک خاص اجلاس ہوا، اور حکیم اجمل خاں مرحوم کی تحریک پر سید صاحب نے اس کی صدارت کی، اس اجلاس میں انھوں نے ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات کی نسبت مسلمانوں کے نقطہ نظر کو بڑی وضاحت سے پیش کیا، اس سے فراغت کے بعد وفدِ خلافت لے کر حجاز گئے، اس کے ممبر مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی اور شعیب قریشی تھے، سلطان ابن سعود نے مسئلہ حجاز کے سلسلہ میں تمام دنیا سے مسلمانوں کی ایک موثر مکہ معظمہ میں طلب کی تھی، جس میں ترکی، مصر، افغانستان، یمن اور دوسرے اسلامی ملکوں کے نمائندے شریک ہوئے، اور چند ہفتوں تک برابر اس کے جلسے ہوتے رہے، موثر کے نمائندوں نے سید صاحب کو موثر کا نائب الرئیس منتخب کیا اور صدر

مؤتمر کی غیر حاضری میں اس کی صدارت بھی کی، اس میں انھوں نے جو عالمانہ اور مبصرانہ تقریریں کیں ان سے ہندوستان کے مسلمانوں کی علمی و دینی عظمت شرکاء کے دلوں میں قائم ہوگئی، حجاز میں وفد کے کاموں کی مشغولیت کے باوجود ان کا قلم بھی رواں دواں رہا، چنانچہ وہاں سے آنے کے بعد ”حجاز کے کتب خانے“ کے عنوان سے معارف کے کئی نمبروں میں ایک طویل مضمون لکھا۔

مارگولیتھ سے علمی معرکہ:

اس وفد سے واپسی کے بعد وہ زیادہ تر علمی، مذہبی اور تعلیمی کاموں میں مشغول رہے، ۱۹۲۵ء میں مانچسٹر گارجین کے ایک عیسائی مضمون نگار نے حضور انور ﷺ سے متعلق نامناسب باتیں مارگولیتھ کی کتاب کے حوالہ سے لکھیں جو خود مارگولیتھ نے واقدی کے جرمن ترجمہ ولہاؤسن کے حوالہ سے لکھی تھیں اس پر واقدی کے معتبر اور غیر معتبر ہونے کی بحث چھڑ گئی، سید صاحب نے ۱۹۲۶ء اور ۱۹۲۷ء کے معارف کے متعدد مضامین میں یہ ثابت کیا کہ واقدی کی حیثیت ایک داستان گو سے زیادہ نہیں ہے اور اس کا شمار معتبر مؤرخین میں نہیں ہے، تاریخ و سیر میں اس کا حوالہ دینا ایسا ہی ہے جیسے ملکہ ایلزبتھ کی سوانح عمری میں رینالڈس کا حوالہ دیا جائے، مارگولیتھ کے علاوہ ڈرہم یونیورسٹی کے عربی کے پروفیسر ڈاکٹر گولیم نے بھی اس بحث میں حصہ لیا تھا، سید صاحب نے دونوں کو اپنے محققانہ اور فاضلانہ مضامین سے خاموش کیا، ان مضامین کا انگریزی ترجمہ اسلامک ریویو و وکنگ میں بھی شائع ہوا اور ایک صاحب نے حجاز میں ان کا ترجمہ عربی میں بھی کیا۔

زہر کا تریاق:

۱۹۲۷ء میں ایک یورپین اہل قلم نے لکھا ہے کہ ”مسلمان ارسطو کی گاڑی کے قفل تھے“ سید صاحب نے اپنے ایک مضمون میں اس کی فاضلانہ تردید کی جس کا انگریزی ترجمہ

حیدر آباد دکن کے رسالہ اسلامک کلچر میں بھی شائع ہوا، اسی سال یہ پروپیگنڈا کیا گیا کہ اسلام کا قانون عورتوں کے لیے حد درجہ تنگ اور سخت گیر ہے، سید صاحب نے ”مسلمان عورتوں کے حقوق“ کے عنوان سے اس کی تردید میں ایک طویل مضمون لکھا اور یہ دکھایا کہ عورتوں کے ساتھ جتنی بے انصافیاں تھیں، ان سب کا خاتمہ آخری ربانی پیغام اور تکمیل دین نے کیا اور ان کے واجبی حقوق دے کر ان کا درجہ بلند کیا۔

انجمن حمایت اسلام لاہور میں تقریر:

اسی سال کے وسط اپریل میں انجمن حمایت اسلام لاہور کی دعوت پر ”عہد رسالت میں اشاعت اسلام“ پر تقریر کی جو بہت پسند کی گئی، اس موقع پر لاہور کے تمام اصحاب علم سے ملاقاتیں رہیں، ڈاکٹر اقبال نے بڑی تواضع سے ملنے میں پیش دستی فرمائی، ان کی قیام گاہ پر آئے اور بڑی گرم جوشی سے ملے اور پھر ان کے اعزاز میں جتنی علمی صحبتیں رہیں، ان میں ڈاکٹر اقبال ہی شمع محفل رہے، چنانچہ سید صاحب نے پنجاب کے سفر سے واپسی پر شذرات میں تحریر فرمایا ”..... انھوں نے (یعنی ڈاکٹر اقبال نے) ”شمع اور شاعر“ لکھا ہے لیکن میں نے تو لاہور میں خود شاعر کو شمع دیکھا اور قدر شناسوں کو اس کا پروانہ پایا، ان کی صحبت لاہور کے نوجوانوں کے دماغی سطح کو بلند کر رہی ہے، ان کے فلسفیانہ نکات، عالمانہ افکار و شاعرانہ خیالات ان کی آس پاس کی دنیا کو ہمیشہ متاثر رکھتے ہیں“ اس ملاقات کے بعد دونوں میں اور زیادہ گہرے تعلقات پیدا ہوئے۔

جنوبی ہند کا سفر:

اسی سال کے اکتوبر میں مجلس العلماء کی صدارت کے لیے ترچنا پل تشریف لے گئے، یہ مجلس تامل زبان میں اسلام کی تبلیغ اور اشاعت تعلیم کا کام انجام دیتی تھی، اس سفر میں ویشارام، آمبور، عمر آباد، بنگلور، میسور اور حیدر آباد دکن میں بھی تقریریں کیں، اس لمبے سفر کا مقصد ندوۃ العلماء کے دارالاقامہ کی تعمیر کے لیے چندے کا حصول تھا، وہاں سے واپسی

کے بعد نومبر میں ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لیے امرت سرگئے، اسی اجلاس میں ندوہ کے لیے نواب صاحب بہاول پور نے پندرہ ہزار کی رقم عطا کی، امرت سر سے وہ جمعیت العلماء کے اجتماع میں شرکت کے لیے پشاور بھی گئے۔

### دارالمصنفین کی روز افزوں شہرت:

۱۹۲۸ء میں خالص علمی کاموں خصوصاً سیرۃ النبی جلد چہارم کی تدوین میں مشغول رہے، دارالمصنفین اب اپنے مذہبی، علمی و ادبی کارناموں کی وجہ سے ہند اور بیرون ہند میں بہت مشہور ہو چکا تھا، فرانس کے علمی رسالہ ”دنیاۓ اسلام“ میں اس کا ذکر کئی بار کیا گیا، مصر کے رسالہ ”الزہراء“ میں اس پر ایک مقالہ بھی شائع ہوا، ایک ترک نوجوان شہاب الدین آفندی نے جو مولانا روم کے خاندان سے تھے، اپنے ہم وطن نادرۃ روزگار مہندس استاذ عیسیٰ اور ان کے رفقاء کے حالات قلم بند کرنے کے سلسلہ میں دارالمصنفین کی طرف رجوع کیا، امریکہ کے رسالہ مسلم ورلڈ اپریل ۱۹۲۸ء کے دو مضامین میں دارالمصنفین کا ذکر خاص طور پر کیا گیا، ٹرکی میں الفاروق اور سیرۃ النبی کے حصہ اول، دوم، سوم۔ سیرت عائشہ اور سیر الصحابہ کی بعض جلدوں کے ترجمے ترکی زبان میں کیے گئے اور وہاں کے علماء اور عام شائقین نے ان کتابوں کو توقع سے زیادہ پسند کیا۔

اس کی علمی شہرت سے ہندوستان کے سیاسی لیڈروں کی نظریں بھی اس کی طرف اٹھیں اور وہ ایسا مرکز بن گیا، جہاں مسلمان اور ہندو لیڈر بڑے فخر سے آتے تھے، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، بی ام امان، مولانا حسین احمد، چودھری خلیق الزماں، ڈاکٹر محمود کے علاوہ گاندھی جی، مالوی جی، سروجنی نائیڈو، پنڈت موتی لال نہرو اور پنڈت جواہر لال نہرو سب ہی یہاں آئے، پنڈت موتی لال نہرو پوربی اضلاع کے دورہ میں جب اعظم گڑھ آئے تو ہمیشہ دارالمصنفین ہی میں ٹھہرتے، شبلی منزل ان کا بے تکلف مہمان خانہ تھا، پنڈت جواہر لال نہرو کا بھی ہمیشہ یہی طریقہ رہا، وہ جب بھی اعظم گڑھ آئے دارالمصنفین میں آکر

ٹھہرے، گاندھی جی جب اپنے دورہ میں آئے تو ان کے قیام کا انتظام اور جگہ تھا، مگر وہ خود شبلی منزل آئے اور ایسے وقت آئے کہ اہل دارالمصنفین ایک کھلی جگہ پر مغرب کی نماز پڑھ رہے تھے، یہ دیکھ کر گاندھی جی نہایت ادب اور خاموشی سے کنارے پر بیٹھ گئے اور ساتھ والوں کو باادب رہنے کے لیے اشارہ کیا، سید صاحب نے لائین کی روشنی میں ان کو کتب خانہ دکھایا، دارالمصنفین کے ایک رفیق نے ان کے سامنے دستخط کے لیے اپنی یادداشت کی کتاب پیش کی تو انھوں نے اُردو میں دستخط کیے۔

۱۹۲۸ء میں سید صاحب نے ”ہندوستان اور علم حدیث“ کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا جو دلچسپی سے پڑھا گیا، اس موضوع پر اردو میں یہ پہلا مضمون تھا، اس کی اشاعت کے بعد دوسرے اہل قلم نے بھی اس موضوع پر مفید معلومات فراہم کیے، اسی سال حیدرآباد کے سفر کے موقع پر حضور نظام نے اُن سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی اور اس کے نتیجے میں ریاست حیدرآباد سے دارالمصنفین کی سالانہ امداد جاری رکھی گئی۔

### ساردا ایکٹ کے خلاف احتجاج:

۱۹۲۸ء و ۱۹۲۹ء میں ساردا ایکٹ یعنی نابالغوں کی شادی پر پابندی کے سلسلہ میں مسلمانوں میں بڑا ہيجان پیدا ہوا، انھوں نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا، لیکن اس قانون کے بعض مسلمان حامیوں نے فقہ اسلامی میں تحریف کرنے کی کوشش کی اور نابالغ لڑکیوں کے نکاح کو ناجائز بتایا اور زور استدلال میں حضرت عائشہؓ کی نابالغی کی عمر نکاح سے بھی انکار کر دیا، سید صاحب نے معارف میں نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر پر محققانہ اور فاضلانہ بحث کر کے ایسے تمام لوگوں کا منہ بند کر دیا اور یہ اعلان کیا کہ نابالغوں کا نکاح تو شرعاً جائز ہے، مگر ہر حال میں مستحسن نہیں، لیکن کسی غیر اسلامی حکومت کو مسلمانوں کے نکاح و طلاق کے سلسلہ میں قانون بنانے کا حق نہیں، غیر اسلامی حکومتوں میں مناسب اصلاحات کو قانوناً نافذ کرنے کی صورت صرف یہ ہے کہ وہ خفی تصریحات کے مطابق

مسلمان والی قاضی کے ذریعہ جاری کی جائیں، اسی سلسلہ میں انھوں نے اس طرف بھی توجہ دلائی کہ سوراج قائم ہونے کے بعد مسلمانوں کے پیش نظر جو معاملات ہیں، اُن میں ایک مطالبہ یہ بھی ہو کہ آئندہ حکومت میں مسلمانوں کے خالص مذہبی اور شخصی قوانین کے تحفظ، ترقی و اصلاح اور استحکام کے لیے ایک علاحدہ نظام ہونا چاہیے اور اس کے لیے ایک قابل عمل خاکہ پیش کیا جائے، اسی طرح کلچرل اٹونومی کی صدا پہلی بار انھوں نے بلند کی اور یہ بھی لکھا کہ اگر آسمان کو دیکھ کر موسم کی انقلاب کی پیشین گوئی کی جاسکتی ہے تو موجودہ حالات کو دیکھ کر مجھ کو یقین ہے کہ اگر اس قسم کی تدبیر نہیں کی گئی، تو مسلمانوں کی ممتاز ہستی اس ملک میں قائم نہیں رہ سکتی۔

### عرب و ہند کے تعلقات پر لکچر:

۱۹۲۹ء کے مارچ میں ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کی دعوت پر ”عرب و ہند کے تعلقات“ پر لکچر دیئے جن میں ہندو مسلمان دونوں کو اُن کا وہ زریں عہد یاد دلایا، جب دونوں گونا گوں تعلقات کے رشتوں میں جکڑے ہوئے تھے، یہ خطبات تلاش و تحقیق، محنت و کاوش اور حجت و استدلال کے اعتبار سے بے مثل سمجھے جاتے ہیں، اُن کا انگریزی ترجمہ جناب سعید الحق صاحب ام۔ اے۔ (فی الحال نیوز ایڈیٹر کراچی) نے کیا تھا، جو اسلامک کلچر حیدر آباد میں کئی سال تک شائع ہوتا رہا۔ (۱)

### ندوة العلماء کے لیے سرمایہ کی فراہمی:

۱۹۳۰ء میں زیادہ تر سیرۃ النبی جلد چہارم کی تدوین میں مشغول رہے، اسی کے ساتھ دارالعلوم ندوة العلماء کی مالی حالت کو درست کرنے کی بھی فکر رہی، چنانچہ اُن کی تحریک پر مدارس کے مشہور مخیر سا ہو کا رسی عبدالحکیم صاحب نے ندوہ کو پانچ ہزار روپے کی رقم عنایت کی۔

(۱) ان سطور کو لکھتے وقت یہ اطلاع ملی کہ یہ انگریزی ترجمہ کتاب کی صورت میں حکومت پاکستان شائع کرنے والی ہے۔

### عربوں کی جہاز رانی:

۱۹۳۱ء کے مارچ میں ”عربوں کی جہاز رانی“ پر بمبئی گورنمنٹ کے شعبہ تعلیم کی سرپرستی میں چار خطبے دیے، جو بڑی دل چسپی سے سنے گئے، ان کے اقتباسات بمبئی کے انگریزی اور اردو اخبارات نے شائع کیے، ان میں یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ موجودہ جہاز رانی کی ترقی میں عربوں کا کتنا حصہ ہے، ان خطبات کا بھی انگریزی ترجمہ اسلامک کلچر حیدر آباد میں شائع ہوا۔

### قلمی جہاد:

ان کا یہ سال زیادہ تر ان دشمن اسلام عناصر کے خلاف قلمی جہاد میں گزرا، جو مسلمانوں کو اپنی تحریروں سے گمراہ کرنے کی کوشش میں تھے، اسی زمانہ میں انگریزی اخبار ”اسٹیس مین“ میں ایک مضمون چھپا تھا، جس میں واقعہ کر بلا کا حال ایسے انداز میں بیان کیا گیا تھا، جو مسلمانوں کے نقطہ نظر سے قابل اعتراض تھا، اس کے خلاف سید صاحب نے سخت احتجاج کیا، اسی طرح پنجاب یونیورسٹی کے نصاب میں ڈاکٹر وائل کی کتاب تاریخ اقوام اسلامیہ اور ڈاکٹر نکلسن کی تاریخ ادبیات عربی داخل ہوئی، تو انھوں نے وہاں کے ارباب علم کو اس طرف توجہ دلائی کہ ان دونوں کتابوں میں اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے متعلق نہایت گمراہ کن نظریات اور لغو اعتراضات ہیں جن کو ایک مسلمان سننا بھی گوارہ نہیں کر سکتا، مسلمانوں کے اخبارات نے بھی احتجاج کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کتابیں پنجاب یونیورسٹی سے خارج کر دی گئیں، اسی طرح جب رسالہ نگار لکھنؤ نے انبیائے کرام علیہم السلام، رسالت مآب ﷺ اور اسلامی عقائد و اعمال کے متعلق دل آزار مضامین لکھے، تو سید صاحب نے اس کے خلاف بھی آواز بلند کی، جس پر عام مسلمانوں نے اتنی مخالفت کی کہ ایڈیٹر نگار کو توبہ نامہ لکھنا پڑا، جو نومبر ۱۹۳۱ء کے معارف میں بھی شائع ہوا۔

## سیرۃ النبی جلد چہارم:

۱۹۳۲ء میں سید صاحب کی مشہور تصنیف سیرۃ النبی کی چوتھی جلد شائع ہوئی، جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ نبوت محمدی نے دنیا میں کس عظیم الشان اصلاح کا فرض انجام دیا، اُس کی اشاعت سے دارالمصنفین کی شہرت میں اور بھی چار چاند لگ گئے۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تقریریں:

مارچ ۱۹۳۳ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی انجمن اُدوئے معلّٰی کی دعوت پر ”ہندوستان میں ہندوستانی“ پر ایک خطبہ دیا یہ جلسہ مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی صدر یار جنگ بہادر کی صدارت میں یونین ہال میں ہوا، جو اس موقع پر بھرا تھا، اس میں سید صاحب نے تاریخی حوالوں سے بتایا کہ اردو کا نام دراصل ہندوستانی تھا، انگریزوں کے آنے سے بہت پہلے دسویں صدی میں یہ زبان اسی نام سے پکاری جاتی تھی، اُن کی دوسری تقریر آفتاب ہوسٹل کے طلبہ کے سامنے ہوئی، جس میں ان پر یہ اچھی طرح واضح کیا کہ ہماری یہ زندگی جو تمام تر دوسری قوم کی نقالی پر مبنی ہے، ہمارے اندر قومی روح کی سرگرمی نہیں پیدا کر سکتی ہے، اُن کی تیسری تقریر طبیبہ کالج کے ہال میں ہوئی، اس میں اسلامی طب کی تاریخ کے ساتھ وہاں کے طلبہ کو نصیحت فرمائی کہ وہ ڈاکٹر بننے کے بجائے طبیب بننے کی کوشش کریں کیوں کہ ہندوستان کی صحت عامہ کا دار و مدار دیسی طب پر ہے، جس کی اکثر دوائیں ہمارے ملک کی پیداوار ہیں، وہ مسلم یونیورسٹی کے کورٹ کے ممبر بھی ۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۷ء تک رہے۔

تاج محل کے معمار کی تحقیق:

اپریل ۱۹۳۳ء میں ادارہ معارف اسلامیہ لاہور کے پہلے سالانہ اجلاس کی شرکت کے لیے لاہور تشریف لے گئے، جس کی صدارت ڈاکٹر سر محمد اقبال نے کی تھی، اس جلسہ میں انھوں نے اپنا ایک مقالہ پیش کیا، جس کا عنوان ”لاہور کا ایک مہندس خاندان جس

نے تاج اور لال قلعہ بنایا“ تھا، اس میں اس خاندان کے ڈیڑھ سو برس کے علمی کارناموں کی سرگذشت نامعلوم گوشوں سے بڑی تلاش و تحقیق سے مرتب کی گئی تھی اور تاریخ میں پہلی دفعہ اس خاندان کے مورث اعلیٰ نادر العصر استاد احمد معمار شاہ جہانی لاہوری کے حالات بتائے گئے، اور نہایت مستند شہادتوں سے یہ ثابت کیا گیا کہ تاج کا معمار درحقیقت یہی استاد احمد معمار شاہ جہانی لاہوری ہے جو ہندسہ، ہیئت اور ریاضیات کا بہت بڑا عالم تھا، اس حقیقت کے ظاہر ہونے کے بعد وہ تمام دعوے جو تاج کے کاریگروں اور معماروں سے متعلق مشہور تھے، بے سرو پا ہو کر رہ گئے۔

مغربی ہند کا سفر:

جولائی ۱۹۳۳ء میں سیرت نبوی پر تقریر کرنے کے لیے بڑودہ تشریف لے گئے اس کا جلسہ ہذا کیلنسی دیوان بہادر کی صدارت میں بڑودہ کالج میں ہوا، بڑودہ سے بھروچ، بھروچ سے راندیر، راندیر سے سورت، سورت سے انگلشور اور وہاں سے ڈابھیل گئے اور ہر جگہ ایک ایک دو دو مذہبی تقریریں کیں۔

ضابطہ جنایات قتل و قصاص کی ترتیب:

اسی سال حکومت حیدرآباد نے دارالمصنفین کو فقہ حنفی کی رو سے ایک ضابطہ جنایات کی ترتیب و تدوین کی خدمت سپرد کی، چنانچہ سابق دولت عثمانیہ کی مجلّٰۃ الاحکام کی طرح یہ قانون جنایات بھی دفعہ وار مرتب کیا گیا اور اس کا مسودہ سید صاحب نے حکومت حیدرآباد کو پیش کیا۔

خیام:

اسی سال ان کی مشہور و معروف تصنیف خیام شائع ہوئی، انھوں نے خیام پر پہلی دفعہ فروری ۱۹۴۲ء کے معارف میں ایک مضمون لکھا تھا جو دراصل پروفیسر اقبال معلم فارسی اور نیٹل کالج لاہور کے اس مقالہ کا جواب تھا، جو انھوں نے ”شعراجم اور عمر خیام“ کے

عنوان سے رسالہ اردو (اورنگ آباد دکن) میں تحریر کیا تھا، اس مضمون کو قلم بند کرتے وقت سید صاحب نے حیات کا ناقدانہ مطالعہ کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دسمبر ۱۹۳۰ء کی اورینٹل کانفرنس منعقدہ پٹنہ میں ایک مقالہ پیش کیا، ارباب نظر نے توقع سے بڑھ کر اس قدر کی، تو یہی مقالہ ایک کتاب کی صورت میں منتقل ہو گیا، اس کتاب کی ترتیب میں انھوں نے سنین کی تحقیق و تطبیق، واقعات کی تلاش و تفتیش، ماخذوں اور سندوں کے حوالوں اور حیات کی فلسفیانہ تصانیف کی جستجو میں جو فکر و کاوش کی ہے، وہ ایک اہم علمی کارنامہ ہے، اس سے حیات ایک بالکل ہی نئے رنگ میں ظاہر ہوتا ہے، اس تصنیف کی داد ہندوستان سے لے کر ایران، کابل اور یورپ تک کے فضلاء نے دی، فردوسی کی ہزار سالہ برسی کے موقع پر افغانستان نے ایران کو جو تحائف دیئے ان میں ایک تحفہ ”حیات“ بھی تھا۔

ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے اس پر پانچ سو روپے کا انعام دیا، ڈاکٹر سراقبال نے اس کتاب کو پڑھ کر سید صاحب کو ایک مکتوب میں لکھا کہ ”عمر خیام“ پر آپ نے جو کچھ لکھ دیا ہے، اس پر اب کوئی مشرقی یا مغربی عالم اضافہ نہ کر سکے گا۔

### سفر افغانستان:

اسی سال نادر خاں شاہ افغانستان کی طرف سے ایک تعلیمی و علمی دعوت ڈاکٹر سراقبال، نواب سر اس مسعود وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی اور سید صاحب کو موصول ہوئی کہ وہ افغانستان آکر کابل یونیورسٹی کی ترتیب اور تنظیم اور وہاں کے تراجم و تالیف کے دائرے کو وسیع کرنے کے سلسلے میں اپنے مفید مشورے دیں، چنانچہ سید صاحب ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو (نکلے) دوسرے رفقاء سفر کے ساتھ نہ ہو سکے اور کابل اُن کے پہنچنے کے بعد پہنچے، سرکاری طور پر وہاں ان معزز مہمانوں کی بڑی پذیرائی ہوئی، علمی انجمنوں نے اُن کو سپاس نامے پیش کیے اور عام لوگوں نے مختلف طریقوں سے اپنی محبت کا اظہار کیا، سید صاحب نادر خاں سے ملے، تو ان سے مسئلہ تعلیم پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ افغانستان کی عربی

و مذہبی تعلیم کا نصاب ایسا ہو کہ طلبہ میں موجودہ زمانے کے لحاظ سے سیاسی و اجتماعی اصلاحات کی طرف میلان بھی ہو، اور اُن میں مذہبی شیفتگی بھی پیدا ہو، شاہ افغانستان نے اس مشورہ کو پسند فرمایا، سید صاحب نے اسی قسم کے مشورے وہاں کے ماہرین تعلیم کو بھی دیئے جو انھوں نے قبول کیے، وہاں کے قیام کے زمانے میں انجمن ادبی کابل نے ہندوستان کے معزز مہمانوں کو ایک سپاس نامہ پیش کیا تو اس موقع پر افغانستان کے مشہور شاعر جناب قاری عبداللہ صاحب نے خیر مقدم کے عنوان سے ایک نظم پڑھی جس میں سید صاحب کے متعلق یہ اشعار تھے:

|                            |                            |
|----------------------------|----------------------------|
| سوم سید کہ از ندوہ است     | زدانش بہ ہندوستان قدوہ است |
| زفیض و مشق تازہ شد جان علم | در اقلیم و دانش سلیمان علم |
| چہ کلکش بمعنی طرازندہ شد   | خیالات شبلی از وزندہ شد    |
| چہ در شاہراہ حقائق شتافت   | معارف از و رونق تازہ یافت  |
| مضامین او جملہ محکم بود    |                            |
| نگارش بکلکش مسلم بود       |                            |

کابل سے چل کر غزنین آئے، جہاں حکیم ثنائی اور محمود غزنوی کے مزار پر حاضری دی، پھر مقرر، قلات، غلزی، قندھار، چمن، کوئٹہ اور ملتان کی سیاحت کرتے ہوئے اعظم گڑھ واپس آ گئے، رخصتانہ میں نادر شاہ نے افغانستان کے بنے ہوئے چار عمدہ قالین، کچھ پشمینے اور اونی کپڑے بھی نذر کیے، اس طویل سفر میں ان کے قلم کا مسافر بھی چلتا رہا، دن اور رات کے مختلف مشاغل کے باوجود سونے سے پہلے وہ سفر کے تمام کوائف قلم بند کر لیتے، چنانچہ آخر میں ایک سفر نامہ مرتب ہو گیا، جو معارف میں شائع ہوا، اور بعد میں ”سفر نامہ افغانستان“ کے نام سے ایک کتاب بھی مرتب ہو گئی، اس سفر میں ڈاکٹر سراقبال ان سے بے حد متاثر ہوئے، چنانچہ ایک موقع پر تحریر فرمایا کہ:

”آج سید سلیمان ندوی ہماری علمی زندگی کے سب سے اونچے زینے پر ہیں، وہ



عالم ہی نہیں امیر العلماء ہیں، مصنف ہی نہیں رئیس المصنفین ہیں، ان کا وجود علم و فضل کا ایک دریا ہے، جس سے سیکڑوں نہریں نکلی ہیں اور ہزاروں سوکھی کھیتیاں سیراب ہوئی ہیں۔“

جامعہ ملیہ کی توسیعی لکچرز کی صدارت:

فروری ۱۹۳۲ء میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی دعوت پر ڈاکٹر مہجت وہی جامعہ ملیہ آئے، یہ حضرت معاذ بن جبلؓ کی اولاد میں سے تھے، مصر کی طبی درس گاہ میں علم تشریح کے استاد رہ چکے تھے، وہاں سے سبکدوش ہونے کے بعد یورپ میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے لگے تھے، ۱۹۲۰ء میں سید صاحب سے طریقہ واقع سوئزرلینڈ میں ملاقات ہوئی تھی، اسلامی احوال و ماہجریات پر ان کا مطالعہ گہرا تھا، جامعہ ملیہ میں آکر چار خطبے دیے، ڈاکٹر انصاری کے اصرار پر ان کے پچھلے دو خطبوں کے جلسوں کی صدارت سید صاحب ہی نے کی۔

سفر رانچی:

جون ۱۹۳۲ء میں صوبہ بہار و اڑیسہ کے وزیر تعلیم آنر بیل جناب سید عبدالعزیز کی دعوت پر عربی مدارس کے ترتیب نصاب کے سلسلے میں رانچی تشریف لے گئے، ان کے ساتھ ان کے عزیز دوست مولانا مناظر احسن گیلانی (صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن) بھی تھے، حکومت بہار نے ان کو کئی بار مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے پرنسپل کے تقرر کے سلسلہ میں پبلک سروس کمیشن کا اسپرٹ ممبر بھی نامزد کیا۔

تاریخ ہند کی تدوین کی اسکیم:

اسی سال کے آخر میں بہت سے ہمدرد اہل علم کے تقاضے اور اصرار پر اسلامی ہند کی مکمل تاریخ کی تدوین و ترتیب کا ایک خاکہ ملک کے سامنے پیش کیا، مسلمانوں نے ہندوستان کو جو سیاسی، قومی، علمی و تمدنی حیثیت سے ترقی دی، اُس کی ایک مکمل اور جامع تاریخ کی ضرورت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی، سید صاحب نے دسمبر ۱۹۳۲ء کے معارف

میں یہ تجویز پیش کی کہ ایسی تاریخ پندرہ جلدوں میں لکھی جانی چاہیے، پورے ملک نے اس تجویز کی تائید کی، چنانچہ دارالمصنفین میں بعض اہل قلم کی خدمات حاصل کر کے اس اہم کام کو شروع کر دیا گیا، جواب تک جاری ہے۔

زنانہ جامعہ لاہور کا خاکہ:

جنوری ۱۹۳۵ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کی دعوت پر اس کی طلانی جو بلی میں شریک ہوئے، انجمن نے اس موقع پر ایک اسلامی زنانہ جامعہ قائم کرنا چاہا تو اس کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی، جس کے ایک ممبر سید صاحب بھی تھے، انھوں نے علامہ اقبال کے ساتھ مل کر ایک خاکہ تیار کیا، اس سفر کے سلسلہ میں لاہور اور لدھیانہ، سہارنپور، دیوبند اور دہلی کے علمی و تعلیمی اداروں اور کتب خانوں کی بھی سیر کی۔

ضابطہ فوجداری حیدرآباد پر نظر ثانی:

اسی سال ریاست حیدرآباد دکن نے شرعی حیثیت سے وہاں کے ضابطہ فوجداری پر نظر ثانی کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی، جس میں ایک سابق جج ہائی کورٹ، مفتی ریاست اور سید صاحب تھے، اس کمیٹی نے ایک مہینہ میں اپنا کام پورا کیا۔

سیرۃ النبی جلد پنجم:

اسی سال ان کی مشہور و معروف تالیف سیرۃ النبی کی پانچویں جلد شائع ہوئی، اس کا موضوع عبادات ہے، سیرۃ النبی کی جلدیں ہند اور بیرون ہند میں بے حد مقبول ہو رہی تھیں، ہندوستان میں اس کی مانگ بڑھتی جا رہی تھی اور ہر جلد کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے، پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ٹرکی میں اس کی تین جلدوں کا ترجمہ ہوا، اور وہاں ان کی مقبولیت کا اندازہ نواب فخر یار جنگ کے حسب ذیل مکتوب سے ہوگا جو انھوں نے سید صاحب کو تحریر فرمایا:

”میں کچھ عرصہ ہوا ترکی گیا تھا، وہاں ایک بڑی جماعت ایسے لوگوں کی ملی، جو

سیرۃ النبی مبارک کی بڑی مداح ہے اور اس کا جو ترجمہ ترکی میں ہو چکا ہے، اس کو وہ بہت شوق سے مطالعہ کرتے ہیں، خود استنبول تو چوں کہ مغرب زدہ ہو چکا ہے، وہاں زیادہ لوگ نہیں ملے لیکن بروصہ میں جو شاہانِ عثمانیہ کا فتح استنبول سے پہلے قریب ڈیڑھ سو سال تک دارالحکومت رہا ہے، بہت سے احباب کو سیرۃ النبی کا ذکر دل چسپی سے کرتے سنا، خدا آپ کی مساعی جلیلہ کو بار آور کرے۔“

فارسی میں بھی سیرۃ النبی کی چند جلدوں کا ترجمہ کابل میں کیا گیا، مکہ معظمہ اور مصر میں اس کے عربی ترجمہ کا خیال پیدا ہوا۔

اُردو ہندی کا جھگڑا:

اکتوبر ۱۹۳۵ء میں مرض ذات الحبب کا شدید حملہ ہوا، کئی مہینے کے بعد شفا ہوئی، تو ڈاکٹروں نے چھ مہینے تک مکمل آرام لینے کی ہدایت کی، تین مہینے دہرہ دون جیسے صحت بخش مقام میں جا کر قیام بھی کیا اور آرام کے بعد اپنے علمی مشاغل پھر شروع کیے، تو اُردو ہندی کے روز افزوں جھگڑوں سے اُن کو بہت دکھ پہنچا، معارف کے شذرات کے ذریعہ اپنے درد مندانہ خیالات کا اظہار کیا کہ ہندی اور اُردو دانوں کے لیے الگ الگ ترقی کی راہیں کھلی رہنی چاہئیں کیوں کہ زمانہ یہ فیصلہ کر چکا ہے کہ نہ اُردو ہندی کو مٹا سکتی ہے، اور نہ ہندی اُردو کو، دونوں اپنی اپنی راہیں چلتی رہیں گی، انھوں نے یہی خیالات علی گڑھ میں آل انڈیا اُردو کانفرنس میں ظاہر کیے جو اکتوبر ۱۹۳۶ء میں ہوئی۔

فلسطین کانفرنس کی صدارت:

یہودیوں اور انگریزوں کی سازش سے فلسطین کا جو نقشہ بننے کو تھا، اس سے ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی بڑا سیاسی ابال اور مذہبی جوش پیدا ہوا، مدت کی سیاسی خاموشی کے بعد سید صاحب نے فلسطین کے مسئلہ میں اپنی آواز بلند کی اور مولانا شوکت علی اور مفتی کفایت اللہ کے اصرار پر ۶ نومبر ۱۹۳۶ء کی آل انڈیا فلسطین کانفرنس دہلی کی

صدارت کی، اس میں جو خطبہ پڑھا وہ دنیائے اسلام میں بڑا مقبول ہوا، مصر اور شام کے اخبارات نے اس کے ترجمے چھاپے، مجلس اعلیٰ فلسطین کے صدر مفتی سید امین الحسینی نے خاص طور پر تار کے ذریعہ ان کا شکریہ ادا کیا۔

ایک ناخوش گوار واقعہ:

وہ فلسطین کانفرنس کی صدارت کر رہے تھے کہ ایک بر خود غلط اہل قلم نے ۷۵ صفحے کا ایک رسالہ ”سید سلیمان ندوی کی قرآنی غلطیاں“ لا کر ان کے ہاتھ میں دیا، جس میں اُن کی تصانیف میں سے گیارہ غلطیاں فراہم کر کے یہ الزام لگایا تھا کہ ان کی تحریروں سے الحاد و اہمال کے جراثیم پیدا ہوتے ہیں، دسمبر ۱۹۳۶ء کے معارف میں ان اعتراضات کا جواب شائع ہوا، تو رسالہ کے مرتب نے مطمئن ہونے کے بجائے سید صاحب کو ایک عدالتی سمن کے ذریعہ دہلی کی عدالت میں طلب کرنے کی کوشش کی، لیکن دہلی کے اس زمانہ کے مشہور وکیل جناب عبدالرٹمن صاحب کی وکالت اور وساطت سے یہ مقدمہ عدالت سے خارج ہو گیا اور سید صاحب کو عدالت میں حاضر ہونے کی نوبت نہیں آئی۔

ہندوستانی اکیڈمی کے جلسہ کی صدارت:

جنوری ۱۹۳۷ء میں لکھنؤ کی نمائش گاہ میں ہندوستانی اکیڈمی کی ایک کانفرنس کے شعبہ اردو کی صدارت کی، اس اکیڈمی کا مقصد ہندوستان کو ادب کی راہ سے ایک کرنا تھا لیکن اس کانفرنس میں اردو اور ہندی کے دو خیمے علاحدہ علاحدہ تھے، ایک کے ادیب نے دوسرے کی صورت تک نہ دیکھی، اس سے سید صاحب کو بڑا دکھ ہوا اور اسی وقت اُن کو یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید ہندو مسلمانوں کے دل ایک دوسرے سے جدا ہو رہے ہیں جیسا کہ انھوں نے فروری ۱۹۳۷ء کے معارف میں اظہار کیا ہے۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی طلائی جوبلی:

مارچ ۱۹۳۷ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی طلائی جوبلی علی گڑھ میں ہوئی، تو اس

کے شعبہ علوم و فنون اسلامی کی صدارت کی، اس میں خطبہ صدارت کے علاوہ اپنا ایک مقالہ ”عرب اور امریکہ“ کے عنوان سے پیش کیا۔ جس میں یہ دکھایا کہ کلمبس سے پہلے عرب جہاز راں امریکہ پہنچ چکے تھے کیوں کہ ان کو زمین کی گولائی اور اس کے تختانی اور فوقانی حصوں کا علم تھا، اسی لیے ماورائے بحرِ ظلمات تک پہنچنے کی کوشش کی۔

سفر مدراس وحید آباد:

اکتوبر ۱۹۳۷ء میں جامعہ دارالسلام عمر آباد مدراس کا خطبہ اسناد دینے کے لئے وہاں تشریف لے گئے، مدراس کو ان سے اور ان کو مدراس سے ذاتی انس ہو گیا تھا، مدراس سے حیدر آباد آئے، وہاں ان کی آمد کی اطلاع اخبار میں حضور نظام کی نظر سے گزری، تو ان کے لیے خاصہ بھیجا اور ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا، اس قیام کے زمانہ میں دائرۃ المعارف حیدر آباد نے ان کے اعزاز میں نواب مہدی یار جنگ کی صدارت میں ایک جلسہ کیا، جس میں انھوں نے اپنا ایک مقالہ عربی زبان میں ”ابو البرکات بغدادی اور اس کی کتاب المعتبر“ کے عنوان سے پڑھا، اسی روز سر مہاراجہ یحییٰ السلاطنت بہادر کشن پرشاد نے اپنے یہاں مدعو کر کے ایک خلعت عطا کیا، اس سفر سے اعظم گڑھ واپس آئے تو حضور نظام نے ان کے لیے سو روپے ماہانہ کا ذاتی وظیفہ مقرر کر کے ان کے علم و فضل سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا۔

وڈیا مندر اور وار دھا اسکیم:

۱۹۳۸ء میں سی پی میں وڈیا مندر کے نام سے جبری تعلیم کی مہم شروع ہوئی، اس میں اردو پڑھانے کا کوئی انتظام نہ تھا، اس لیے مسلمانوں میں ہیجان پیدا ہوا، تو سید صاحب نے بھی اس کے خلاف احتجاج کیا اور معارف کے ذریعے یہ اعلان فرمایا کہ مخالفت اور دشمنی کی اسپرٹ سے نہیں بلکہ اپنے صحیح حق کو حاصل کرنے اور ملک میں اپنی پوزیشن حاصل کرنے کے لیے اردو زبان سے قطع نظر کرنا ہمارے لئے قطعاً محال ہے، پھر مسلمانوں نے جب کانگریسی وزارتوں کی وار دھا اسکیم کی مخالفت شروع کی تو سید صاحب نے ان کو بے جا

جوشِ عمل کے اظہار سے روکنے کی کوشش کی اور یہ مشورہ دیا کہ اسلامی صوبوں کی وزارتیں، دارالقضا اور مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم وغیرہ کی تجویزوں پر غور کریں اور ان کو عمل میں لائیں تاکہ اس باب میں غیر اسلامی صوبے بھی ان کے نقش قدم پر چل سکیں، مگر افسوس کہ اسلامی صوبے اس کام کو اب تک انجام نہ دے سکے ہیں۔

سیرۃ النبی جلد ششم:

۱۹۳۹ء میں ان کی سیرۃ النبی کی چھٹی جلد شائع ہوئی، اس میں اسلام کی اخلاقی تعلیمات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، یہ سیرت کے سلسلہ کی بڑی اہم جلد ہے، یوں تو تمام جلدیں جدید علم کلام کی اساس ہیں۔

نقوش سلیمانی:

اسی سال ان کی کتاب نقوش سلیمانی بھی شائع ہوئی، یہ ان خطبوں، تحریروں اور مقدموں کا مجموعہ ہے جو اردو ادب و زبان سے متعلق ان کے قلم سے نکلے، یہ گویا کچھلی چوتھائی صدی کی تحریکوں کا ایک مرقع ہے، اس لیے یونیورسٹیوں کے نصاب میں جلد داخل ہو گئی۔

سفر دکن:

۱۹۴۰ء کا آغاز ادبی اور علمی سفروں سے کیا، ۲۵ جنوری کو وہ ندوۃ العلماء کے کام سے حیدر آباد دکن گئے، وہاں سے پونہ آئے اور دکن کالج میں ایک تقریر مسلمانوں کے تحفظ پر کی، اس میں مسلمانوں کو خود یہ تجویز کرنے کو کہا کہ اسلامی کلچر کو وہ اپنے ہاتھوں تباہ کر رہے ہیں یا اس کو غیر آباد کر رہے ہیں، پونہ سے بمبئی آئے، وہاں کے اسماعیل کالج کی مسجد میں جمعہ کی نماز کے بعد ایک تقریر کی جس میں فرمایا کہ دنیا کی قوموں نے جب کبھی ترقی کی ہے تو اس کی قوت پرواز کے دو ہی پر ہوتے ہیں، ایمان اور عمل، ہمارے نوجوان دونوں سے بے پروا ہو کر ترقی کی خواب نہیں دیکھ سکتے، اسماعیل کالج کے ہال میں ایک دوسری تقریر دکن اور گجرات میں اردو زبان کی تاریخ پر کی۔

سفر سرحد و پنجاب:

اس سفر سے واپسی کے بعد ابھی مکان بھی دور نہیں ہوئی تھی کہ پشاور، بھاول پور اور لاہور کا سفر کرنا پڑا، اسلامیہ کالج پشاور کے سامنے ایک تجویز یہ تھی کہ اس میں ایک ایسا شعبہ کھولا جائے جس میں بعض پڑھے لکھے نوجوانوں کو مختصر عربی، دینیات اور طب کی تعلیم دی جائے، جو گاؤں میں پھیل کر اپنی روزی بھی کمائیں اور مسلمانوں کی مذہبی خدمت بھی کریں، اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سید صاحب مدعو کیے گئے، وہاں پہنچ کر مجوزہ نصاب کی ترتیب دینے کے علاوہ مختلف عنوانات پر کئی تقریریں کیں جن میں وہاں کے نوجوانوں کو یہ تلقین کی کہ وہ مسلمانوں کی اکثریت کے صوبے میں رہنے والے کی حیثیت سے اپنے کو ایمان و عمل میں اتنا ممتاز بنالیں کہ سارے ہندوستان کے مسلمان ان کے پیچھے چلیں، پشاور سے لاہور آئے، یہاں کے اصحاب علم نے بڑی پذیرائی کی، مختلف دعوتوں میں علمی و قومی مسائل پر تبادلہ خیال کرتے رہے، لاہور سے بھاول پور آ گئے، جہاں کی جامعہ عباسیہ ۱۹۲۵ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ ہی کے طرز پر قائم ہوئی تھی، یہاں کے وزیر تعلیم میجر شمس الدین اس کے نصاب میں مزید اصلاح چاہتے تھے، سید صاحب نے پہنچ کر ضروری اصلاح کی، اس موقع پر وہاں کے صادق ایجرٹن کالج کی تقسیم اسناد کا جلسہ ہوا، تو خطبہ اسناد سید صاحب ہی نے دیا، دوسرے دن رات کو اسی کالج کے ایک بہت بڑے جلسہ میں ”خصائص اسلامی“ پر ڈیڑھ گھنٹہ تک تقریر کی، پھر شہر کی جامع مسجد میں ”فضائل نبوی“ پر ایک وعظ میں مسلمانوں کو نسبت نبوی کے شرف کی بنا پر اشرف الامم ہونے کی حیثیت سے خیر الامم بننے کا شوق دلایا اور اولاد کو اسی رنگ میں تعلیم دینے کا مشورہ دیا۔

رحمتِ عالم:

اسی سال بچوں کے لیے ”رحمتِ عالم“ لکھی جس میں سلیس اور آسان زبان میں رسول اللہ ﷺ کی سیرت پاک ہے، گو یہ بچوں کے لیے لکھی گئی تھی لیکن جوان اور بوڑھے سب ہی اس سے مستفید ہو رہے ہیں۔

مسلم یونیورسٹی کی طرف سے اعزازی ڈگری:

۱۹۳۰ء کے نومبر میں ان کو مسلم یونیورسٹی کی طرف سے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری ملی، یہ گویا مسلم یونیورسٹی کی طرف سے ان کے علمی وادبی کمال کا اعتراف تھا لیکن ان کے علمی فضائل اس رسمی ڈگری سے بہت بلند ہو چکے تھے، اس لیے انھوں نے اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھنا پسند نہیں کیا، فرماتے تھے جس وقت اس قسم کے اعزاز کی تلاش تھی اس وقت یہ ملے نہیں، اب ان کی کوئی خواہش نہیں، اس لیے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھنے سے کیا فائدہ۔

روحانی انقلاب:

اسی سال ان میں ایک بڑا روحانی انقلاب پیدا ہوا، اب وہ اپنی زندگی کی اس منزل میں تھے جب کہ ہندوستان کیا بلکہ عالم اسلام کے ایک متحرک عالم، ایک بلند پایہ مفسر، ایک جلیل القدر متکلم، ایک دقیقہ سنخ فقیہ، ایک بے مثال ادیب، ایک وسیع النظر مورخ، ایک اچھے سیاسی مفکر اور ایک زبان آور خطیب کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے، ان کی نجی زندگی بھی بڑی پاک و صاف رہی اور ان کے نزدیک رہنے والوں کو یہ کہنے میں تامل نہ ہوتا کہ:

مانند حرم پاک ہے تو میری نظر میں

لیکن اپنی دینی عظمت اور علمی جلالت کا لحاظ کیے بغیر حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ العزیز کے آستانہ پر جا کر اپنا سر نیاز جھکا دیا، حضرت مولانا کو بھی علم و فن کے ایک شہباز اور گلستان رسالت کے ایک عندلیب خوشنوا کو اپنے سایہ عاطفت میں لینے میں بڑی مسرت ہوئی، اس تعلق کے بعد سید صاحب کے لیل و نہار ہی بدل گئے، اگرچہ ان کی پوری زندگی دینداری اور پرہیزگاری میں گزری تھی لیکن بادۂ طریقت سے سرشار ہونے کے بعد ان کی دین داری میں تقویٰ و تورع کا اور بھی زیادہ گہرا رنگ پیدا ہو گیا، عبادت و ریاضت بڑھ گئی، ذکر خفی کے ساتھ ذکر جلی بھی کرنے لگے، تقریر و خطابت نے وعظ و پند کی شکل اختیار کر لی، زیادہ وقت علمی مذاکروں کے بجائے رشد و ہدایت میں صرف ہونے لگا،

اس انقلاب کے بعد اپنی تمام پرانی تحریروں پر نظر ثانی کی اور جس میں ذرا بھی جمہور امت سے اختلاف کا شائبہ یا خلاف احتیاط کوئی بات نظر آئی، اس سے رجوع کیا، چنانچہ ”رجوع واعتراف“ کے عنوان سے جنوری ۱۹۴۳ء کے معارف میں ایک تحریر شائع کی جس میں فرماتے ہیں کہ:

”مذہبی مسائل کی تحقیقات میں میرا یہ عمل رہا ہے کہ عقائد میں سلف صالحین رحمہم اللہ تعالیٰ کے مسلک سے علیحدگی نہ ہو، البتہ فقہیات میں کسی ایک مجتہد کی تقلید بتمامہ نہیں ہو سکی، بلکہ اپنی بساط بھر دلائل کی تنقید کے بعد فقہاء کے کسی ایک مسلک کو ترجیح دی ہے، لیکن کبھی کوئی ایسی رائے اختیار نہیں کی جس کی تائید ائمہ حق میں سے کسی ایک نے بھی نہ کی ہو، خصوصیت کے ساتھ مسائل کی تشریح میں حافظ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہم کی تحقیقات پر اکثر اعتماد کیا ہے، ایسا بھی دو چار دفعہ ہوا کہ ایک تحقیق کے بعد دوسری تحقیق سامنے آئی ہے اور اپنی غلطی ظاہر ہوئی تو بعد کے ایڈیشن میں اس کے مطابق تبدیلی کر دی ہے، مثلاً معراج بحالت بیداری و بحکم ہونے پر قرآن پاک سے صحیح استدلال مجھے نہیں مل سکا اور بعد کو اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی توفیق سے صحیح دلیل سمجھا دی تو دوسرے ایڈیشن میں اس کو بڑھا کر مقام کی تصحیح کر دی، اسی طرح فنائے نار کے مسئلہ میں پہلے حافظ ابن تیمیہ اور ابن قیم کی پیروی میں کچھ لکھا گیا، بعد کو جمہور کی رائے کا اضافہ کر کے دونوں کے دلائل کی تشریح کر دی اور اب بحمد اللہ کہ اس باب میں جمہور ہی کے مسلک کا حق ہونا سمجھ میں آ گیا ہے۔“

اسی طرح وہ پہلے تصویروں کے کھنچوانے کو جائز سمجھتے تھے اور زیوروں میں زکوٰۃ کے عدم وجوب کے قائل تھے لیکن اس رجوع کے بعد جمہور علماء کا مسلک اختیار کیا، اس سلسلے میں تحریر فرمایا:

”یہ باتیں کسی معترض کے خوف سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں اپنی ذمہ داری کو محسوس کر کے لکھ رہا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ بار اللہ مجھے صراط مستقیم پر قائم رکھے، اور جب کبھی تقاضائے بشری سے مجھ سے غلطی ہو تو مجھے متنبہ اور معاف فرما، اور مسلمانوں کو اس کے شر سے محفوظ رکھے اور مجھے راہ صواب دکھا۔“

اس رجوع واعتراف کو ان کے مرشد نے بہت پسندیدگی کی نظر سے دیکھا، ان کو مرشد کی طرف سے خلافت بھی عطا ہوئی تھی، جس کے بعد وہ خاص خاص لوگوں کو بیعت بھی کرنے لگے تھے، جولائی ۱۹۴۳ء میں ان کے مرشد کا وصال ہوا تو بڑے سوز، درد اور غم کے ساتھ ”موت العالم موت العالم“ کے عنوان سے ماتم کیا، ان کی رحلت کے بعد ان کی سوانح عمری لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن یہ پورا نہ ہو سکا۔

### اصلاحی کام:

جنوری ۱۹۴۱ء میں نواب صاحب چھتاری کی صدارت میں اسلام کے سیاسی اور اقتصادی نظام کی ترتیب کے لیے ایک مجلس بنائی گئی، جس کا پہلا اجلاس دارالعلوم ندۃ العلماء میں ہوا، اس کے ارکان سید صاحب کے علاوہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا شبیر احمد عثمانی اور ڈاکٹر ذاکر حسین بھی تھے، اس میں یہ طے پایا کہ مستند علماء اور لائق جدید تعلیم یافتہ اہل علم کی باہمی معاونت سے پہلے اسلامی سیاست و اقتصاد پر ایک معتبر کتاب لکھائی جائے اور پھر اس میں اس حصہ کو الگ کیا جائے جو موجودہ زمانہ میں اور نئے ہندوستان میں قابل عمل ہو، اس تجویز کو عمل میں لانے کے لیے سید صاحب نے اپنے ایک ندوی عزیز سے ایک کتاب بھی لکھوائی، آگے چل کر وہ معارف کے ذریعہ اس کی برابر تلقین فرماتے رہے کہ:

”مسلمان کو اپنے اصول حکومت، اصول اقتصاد، اصول معاشرت، معاملات، قانون اور احکام کے متعلق یہ سوچنا نہیں ہے کہ ان کی جگہ پر کیا ہو،

کیوں کہ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ ان کا دین کیا ہو، بلکہ یہ سوچنا ہے کہ ان کو کس طرح رائج کیا جائے اور نئی مشکلوں کے لیے اسلامی اصول کے مطابق کیا فیصلہ کیا جاسکتا ہے (۱)۔

## حیاتِ شبلی:

دارالمصنفین کی تاسیس کے وقت ہی سے وہ اپنے استاد کو مختلف شکلوں میں خراج عقیدت پیش کر رہے تھے، چنانچہ ۱۹۴۲ء تک مولانا شبلیؒ کے مختلف مضامین، خطبات اور مکتوبات کو جمع کر کے گیارہ جلدوں میں شائع کیا، کثرتِ کار کی وجہ سے ان کی صحت خراب رہنے لگی، تو ان پر استاد کی اس وصیت کا خیال غالب رہنے لگا کہ ”جب تم اور دنیا کے کاموں سے فارغ ہونا تو تم ہی میری سوانح عمری لکھ دینا“ چنانچہ ۱۹۴۰ء میں اس کام کو شروع کر دیا اور تین برس کی جانکاہ محنت کے بعد فروری ۱۹۴۳ء میں ۸۴۶ صفحے کی ”حیاتِ شبلی“ لکھ کر اہل علم کے سامنے پیش کی، یہ ضخیم کتاب ایک شخص کی سوانح عمری ہی نہیں بلکہ مسلمانانِ ہند کے پچاس برس کے علمی، ادبی، سیاسی، تعلیمی، مذہبی، اور قومی واقعات کی تاریخ بھی ہے، سید صاحب کی یہ آخری تصنیف ہے، سیرۃ النبیؐ کی ساتویں جلد کے صرف دو ہی باب لکھنے پائے تھے کہ اس جہانِ رنگ و بو سے رخصت ہو گئے، ان کی رحلت کے بعد اردو زبان کے دیرینہ خدمت گزار اور ممتاز ترین ادیب مولانا عبدالمجید صاحب دریابادی مدظلہ العالی نے ان کے علمی و ادبی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے تحریر فرمایا:

”چھوٹی، بڑی، نئی، پرانی، دینی، علمی، ادبی درجنوں کتابوں کے مصنف اور بے شمار مقالات کے راقم کو کوئی اردو خواں بھلانا چاہے تو بھی کیسے بھلا سکتا ہے، اپنی چالیس سالہ تصنیفی زندگی میں ادبِ صالح سے اردو کے ذخیرہ کو جتنا مالا مال اس مرنے والے نے کیا ہے اس سے بڑھ کر اور کون کر سکا ہے۔“

## ہسٹاریکل کانگریس کی صدارت:

۱۹۴۴ء کا زیادہ تر حصہ صحت کی خرابی میں گزرا لیکن اس سال کے آخر میں انڈین ہسٹاریکل کانگریس کی طرف سے شعبہ تاریخ ہند ازمنہ وسطی کی صدارت کا دعوت نامہ پہنچا تو ان کے بعض علمی جذبات ابھر آئے، ان کو عرصہ سے اس بات کا دکھ تھا کہ غیر مسلم اہل قلم ہندوستان کے اسلامی عہد کو بدنام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، چنانچہ اس تلخ حقیقت کے اظہار کے لیے یہ صدارت قبول کر لی، کیوں کہ اس کے اظہار کا اور کوئی بہتر موقع نہیں ہو سکتا تھا، اپنی خرابی صحت کے باوجود مدراس کا لمبا سفر کیا اور اپنے خطبہ میں جس حقیقت کا اظہار کیا، اس کو کانفرنس کے سمجھدار لوگوں نے اچھی طرح سمجھا۔

## تبلیغی تقریریں:

اسی سفر میں مدراس کے دوسرے مقامات میں بھی ان کی تقریریں ہوئیں، میل ویشارم میں تقریر کا عنوان ”ملت محمدیہ کی حقیقت“ اور دارالسلام عمر آباد میں ”عبدیت“ تھا دارالسلام کی مسجد میں دو روز صبح کے وقت قرآن پاک کے درس بھی دیئے، پریم پٹ میں بھی فجر کی نماز کے بعد ایک مسجد میں درس ہوا، مدراس سے بمبئی تشریف لے گئے تو وہاں کی جمعیت العلماء کی دعوت پر سورۃ الحمد کی تفسیر کی ضمن میں مسلمانوں کے حال پر تبصرہ فرمایا، پھر شہر کی انجمن اسلام ہال میں ”اردو“ اور صابو صدیق ہال میں ”ہندوستان میں علوم عربیہ کی خدمت“ اور ایک مخصوص مجمع میں توبہ و انابت کے صحیح طریقے پر تقریریں کیں، بمبئی سے حیدرآباد کا رخ کیا، وہاں ندوۃ العلماء کی مالی امداد کا کام کرتے رہے۔

## سفر وار دھا:

حیدرآباد ہی میں تھے کہ گاندھی جی نے اپنے ہاتھ سے اردو میں سید صاحب کو ایک خط لکھ کر قومی زبان کے مسئلہ میں مشورے کے لیے وار دھا بلایا، چنانچہ حیدرآباد سے

واپسی میں واردھا اتر گئے، اور وہاں جو جلسہ ہوا تو گاندھی جی کے سامنے اپنی تقریر میں ایک ملکی زبان کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے فرمایا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی زبان میں اسی حد تک فرق ہونا چاہیے جس حد تک ان کے مذہبوں اور تمدنوں میں فرق ہے، اس لیے جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کی مذہبی، تمدنی، اصطلاحوں اور لفظوں کا ماخذ عربی، فارسی، اور ترکی ہونے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں اور ایسی ہی اجازت ہندوؤں کو بھی ان کے مذہبی اور تمدنی خصوصیات کے لیے ہونی چاہیے، اس کے بعد لفظوں کی صحت کا مدار لغت کی کتابوں کے بجائے بازار کے چلن اور عوام کے رواج پر ہونا چاہیے اور اس وقت ہماری زبان میں عربی، فارسی اور ہندی سنسکرت اور انگریزی کا جو لفظ جس صورت میں بولا جاتا ہے اسی کو برقرار رکھنا چاہیے، اس قسم کے خیالات وہ ۱۹۳۷ء سے پیش کر رہے تھے، چنانچہ ۱۹۳۷ء کے اگست میں جب راجندر عبدالحق پیکٹ ہوا تھا تو اس میں یہی طے ہوا تھا کہ ہندوستان میں جو سرکاری زبان ہو وہ اردو اور ناگری دونوں رسم الخط میں لکھی جانی چاہیے اور اس زبان میں الفاظ کے انتخاب کا یہ معیار ہو کہ ان کا عام بول چال میں کس حد تک رواج ہے، اسی پیکٹ کے بعد حکومت بہار نے ایک ہندوستانی کمیٹی مقرر کی تھی، جس کے ایک ممبر سید صاحب بھی تھے لیکن بہار اور واردھا دونوں مشترکہ قومی زبان کا مسئلہ حل نہ کر سکے اور یہ سیاست کے سیلاب کے تیز دھارے میں بہہ گیا۔

راندیر اور سورت کا سفر:

سید صاحب کا مدراس، بمبئی، حیدرآباد اور واردھا کا سفر دسمبر ۱۹۴۴ء میں شروع ہوا تھا اور اپریل ۱۹۴۵ء میں ختم ہوا، ان کی صحت برابر گرتی جا رہی تھی پھر بھی ان کے عقیدت مندوں کا اصرار ہر جگہ سے ہوتا کہ وہ اپنے قدم لزوم میمنت سے ان کے علمی جلسوں اور تعلیمی کاشانوں کو شرف بخشیں، ان کو بھی اپنے دینی اور علمی مشن کو جلد از جلد تکمیل کرنے کی دھن ایسی تھی کہ دور دراز مقامات کا سفر کرنے میں اپنی خرابی صحت کا خیال مطلق

نہ کرتے، چنانچہ جولائی ۱۹۴۵ء میں راندیر کے جامعہ حسینیہ اور مدرسہ اشرفیہ کی دعوت پر وہاں تشریف لے گئے اور جامعہ حسینیہ میں ”الحجد والجهاد للعلمی المعاش والمعاد“ کے عنوان سے ایک تقریر کی اور مدرسہ اشرفیہ میں ”خشیت الہی“ پر خطبہ دیا، اسی سفر میں کچھ دنوں بمبئی اور سورت میں بھی مقیم رہے۔

شدید علالت:

اعظم گڑھ واپس آئے تو حوالی قلب میں ریاحی درد کا سخت دورہ پڑا اور حالت بہت ہی نازک ہو گئی، شفا ہوئی تو اطباء نے دماغی اور علمی کام چھوڑ دینے کا مشورہ دیا، لیکن عمر بھر کی لگی ہوئی عادت کا چھوٹ جانا مشکل تھا، اس لیے معارف کے صرف شذرات اور ہلکے پھلکے مضامین ہی لکھنے پر اکتفا کیا، معارف کے شذرات کے ذریعہ مسلمانوں کو دینی اور ملی احیاء کی تلقین فرماتے رہے، اور ان کو ”تہند“ اور ”تفرنج“ کے دونوں کے خطرات سے آگاہ کیا۔

ندوہ میں قیام کی تجویز:

صحت کی خرابی کے بعد ان کا ارادہ تھا کہ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں مستقل قیام کر کے ان کی تعلیمی و مالی حالت درست کریں، وہ تقریباً چالیس سال تک ندوہ کے معتمد تعلیمات رہے اور اعظم گڑھ سے ندوہ برابر آتے جاتے رہتے اور وہاں کے ہر معاملہ کو اپنا ذاتی معاملہ سمجھ کر بیٹھنے کو شش کرتے، کبھی اساتذہ کی باہمی کشمکش کو دور کرتے، کبھی اس کی مالی اصلاح کے لیے طرح طرح کی تجویزوں کو عمل میں لاتے، کبھی معلم بن درس و تدریس کا سلسلہ قائم کرتے، وہاں کے طلبہ کا اعتراف ہے کہ وہ کسی درجے میں صرف ونحو پر باتیں کرتے تو معلوم ہوتا کہ سیبویہ اور زنجیری کی روح بول رہی ہے، ادب عربی کی فصاحت و بلاغت پر کچھ کہتے تو اندازہ ہوتا کہ جاحظ اور جر جانی سامنے ہیں، بوعلی سینا کی مشہور کتاب ”نجات“، کبھی پڑھا دیتے تو طلبہ کی آنکھیں کھل جاتیں، اگر بخاری یا مسلم کے درس میں اپنے نکات بیان فرماتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ ساری عمر اسی فن کی تحصیل میں گزاری ہے، فقہ اور اصول میں بھی بڑی عقدہ کشائی کرتے۔

## قیام بھوپال:

ندوة العلماء میں ان کے مستقل قیام کی صورت ممکن نہ ہو سکی، اسی اثنا میں نواب حمید اللہ خاں والی بھوپال نے ان کو دعوت دی کہ وہ ریاست کے دارالقضاء اور عربی مدارس کو اپنی نگرانی میں لے کر خالص مذہبی اور شرعی رنگ میں کر دیں، ۱۹۳۹ء و ۱۹۴۰ء میں نواب صاحب موصوف نے ریاست کے عربی مدارس کے انحطاط و تنزل سے متاثر ہو کر سید صاحب کی صدارت میں ماہرین تعلیم کی ایک مجلس مقرر کی تھی، جس نے ان مدارس کے لیے ایک نیا نصاب تیار کیا اور ان کی اصلاح اور تنظیم کے لیے ضوابط بنائے، اس خاکہ کو عملی صورت میں لانے کے لیے نواب صاحب سید صاحب کو بھوپال برسوں سے مدعو کر رہے تھے، بقول جناب شعیب صاحب قریشی، ”قاضی ریاست کا عہدہ تو ان کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکا لیکن عربی تعلیم کی اصلاح و ترقی کے موقع کا وہ انکار نہ کر سکے“ چنانچہ جون ۱۹۴۱ء میں وہ بھوپال کے قاضی القضاة اور جامعہ مشرقیہ کے امیر کے عہدہ پر مامور ہوئے لیکن دارالمصنفین اور ندوة العلماء سے تعلقات بدستور سابق قائم رہے، جس مقصد کے لیے بھوپال تشریف لے گئے تھے اس کی تکمیل کے لئے وہاں اکتوبر ۱۹۴۹ء تک قیام کیا لیکن اگست ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد ریاست کے لیل و نہار ہی بدل گئے، اس اثنا میں وہ معارف کے لیے کوئی مستقل مضمون تو نہ لکھ سکے لیکن وفیات کے عنوان سے اپنے معاصرین کی رحلت پر اپنے غم ناک تاثرات کا اظہار کرتے رہے، وفیات لکھنا ان کا خاص فن ہو گیا تھا، چنانچہ ان کے معاصر جناب عبدالماجد صاحب دربابادی مدظلہ نے ایک موقع پر تحریر فرمایا کہ سید صاحب کا وہ معاصر خوش قسمت ہے جو ان کے سامنے وفات پا جائے اور ان کی ماتم گساری کی دولت اس کے حصہ میں آئے، کبھی کبھی معارف میں شذرات بھی لکھ دیتے، ان کے آخری شذرات جون ۱۹۵۰ء کے معارف میں شائع ہوئے، جس آخری ٹکڑا یہ ہے:

”ہم ہندو مسلمانوں کے میل ملاپ اور میل جول پر دل سے یقین رکھتے ہیں

لیکن یہ قطعاً ضروری نہیں سمجھتے کہ اس غرض کو دین دھرم کا فرق مٹا کر ہی حاصل کیا جاسکتا ہے، بلکہ ہندو ہندو اور مسلمان مسلمان رہ کر بھی اس غرض کو حاصل کر سکتے ہیں، جس کی مثالیں انگریزوں کی دی ہوئی تعلیم سے پہلے ہندوستان میں کثرت سے تھیں اور اب بھی ہیں۔“

یہ گویا ہندوستان والوں کے نام ان کا آخری پیام تھا۔

## سفر حج:

۱۹۴۹ء کے اکتوبر میں وہ اپنی اہلیہ اور صاحبزادے سلمان سلمہ کے ساتھ حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے، جس جہاز سے وہ روانہ ہوئے اس کے امیر بنائے گئے اور جاز پہنچ کر شاہ ابن سعود کے مہمان خاص رہے، ابن سعود نے کئی بار ان کو اپنے ساتھ کھانے پر مدعو کیا، حج کے بعد مدینہ منورہ میں ایک مہینہ قیام فرمایا، بارگاہ نبوی میں رسول اکرم کے سوانح نگار نے اپنے درد عشق، عقیدت و محبت، عجز و نیاز، کیف و سرور کا اظہار ایک نعتیہ غزل میں کیا جس کے چند اشعار یہ ہیں:

مکی مدنی ہاشمی و مطلبی ہے      آدم کے لئے فخر یہ عالی نسب ہی ہے  
پاکیزہ تراز عرش و سماء جنت و فردوس      آرام گہہ پاک رسول عربی ہے  
آہستہ قدم، نیچی نگہ، پست ہو آواز      خوابیدہ یہاں روح رسول عربی ہے  
بجھ جائے ترے چھینٹوں سے اے ابرکرم آج      جو آگ مرے سینے میں مدت سے دبی ہے  
مدینہ منورہ میں عالم اسلام کے علماء کا جب کوئی چھوٹا بڑا اجتماع ہوتا تو اس میں وہ بھی مدعو کیے جاتے اور ہندی زائرین حج کا بیان ہے کہ وہ تقریر یا گفتگو کرتے تو سب میں ممتاز نظر آتے۔

حج سے دسمبر ۱۹۴۹ء میں واپس ہوئے تو بمبئی پہنچ کر سخت علیل ہو گئے، وہاں اعظم گڑھ کے سیٹھ عبدالعزیز انصاری صاحب نے بڑے اخلاق و محبت و فیاضی سے ان کی



تیمارداری کی، شفا پائی تو جنوری کے وسط میں بھوپال آئے، وہاں سے اپریل کے آخر میں اپنا تعلق ختم کر دیا، اہل وعیال کو لے کر اپنے منجھلے داماد کے یہاں کانپور آ گئے، وہاں سے لکھنؤ ہوتے ہوئے ممی میں آپ اعظم گڑھ آئے، بھوپال سے کئی بار اعظم گڑھ آتے جاتے رہے لیکن اس مرتبہ کی آمد سے رفقائے دارالمصنفین خوش تھے کہ وہ پھر مستقل قیام کے لیے یہاں آجائیں گے اور وہی اگلی رونق اور چہل پہل قائم ہو جائے گی، اب ان کو مکمل راحت اور سکون کی ضرورت بھی تھی۔

ہجرت:

لیکن کارکنانِ قضا و قدر نے ان کو مسلمانوں کی ایک نوزائیدہ سلطنت کی آخری خدمت کے لیے جون ۱۹۵۰ء میں کراچی پہنچا دیا، وہ کراچی گئے، تو ہندوستان میں اپنی ساری چیزیں اور ساری املاک چھوڑ کر گئے، اس ہجرت سے ان کو شدید مالی نقصانات پہنچے۔

رحمۃ للعالمین کے سیرت نگار کورب العالمین نے سب کچھ عطا فرمایا تھا، ایک ہجرت کی سعادت باقی تھی، وہ بھی پوری ہو گئی، رسول اکرم ﷺ کے سوانح نگار کو اپنے محبوب رسول کی طرح مہاجر ہی بن کر اپنی زندگی کا خاتمہ بالخیر کرنا تھا، وہ پاکستان کے شہری بن گئے، تو ۱۹۵۱ء میں معارف پر سے نہایت دکھ کے ساتھ بعض مجبوریوں کی بنا پر ان کا اسم گرامی ہٹانا پڑا، جو اس کے سرورق پر ڈر آب داری کی طرح ۱۹۱۶ء سے چمکتا رہا تھا لیکن معارف پر ان کا نام رہے یا نہ رہے، یہ ان ہی کی یادگار ہے، اس علمی رسالہ نے ملک کا جو بلند پایہ علمی ذوق بنایا اور مضمون نگاروں کو تحقیق و تلاش اور دقتِ نظر سے مضامین لکھنے کا جو سلیقہ سکھایا، پھر مستشرقین یا گمراہ مسلمان اہل قلم نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جب کبھی زہر اگلا اس کے خلاف اس میں جو تریاق پیش ہو اوہ سب معارف ہی کے فیوض ہیں اگر وہ کوئی اور علمی کام نہ بھی کرتے تو صرف معارف کی ادارت ہی ان کو زندہ جاوید رکھنے کے لیے کافی تھی۔

اب وہ دارالمصنفین کے ناظم بھی نہیں رہ گئے تھے اور یہ اس ادارہ کی زندگی کی سب سے بڑی ٹریجڈی تھی کہ اپنی زندگی ہی میں اس سے علاحدہ ہو گئے گو وہ اس پر خوش تھے کہ اپنی زندگی ہی میں موت کے بعد اس کا نقشہ دیکھ لیا لیکن درحقیقت اس کے جریہ پر ان ہی کا دوام ثابت ہے، سید سلیمان ہی دارالمصنفین ہیں اور دارالمصنفین سید سلیمان ہے، ایک اسم کے دو مسٹمی اور ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں، وہ ہندوستان میں علوم و فنون کا ایک تاج محل بنا کر پاکستان چلے گئے، اُن کے بعد جب کوئی علمی سیاح اس تاج محل کو دیکھنے آتا، تو اس کو دیکھتا تو ضرور لیکن ان کی عدم موجودگی میں اس تاج کو چودھویں رات کی چاندنی میں دیکھنے سے محروم رہتا۔

اہل پاکستان کی مسرت:

جب سید صاحب پاکستان کے باضابطہ شہری بن گئے، تو وہاں کے خواص و عوام کو بڑی خوشی تھی کہ رسول اکرم ﷺ کا سیرت نگار اور عالم اسلام کا ایک متحر عالم ان کی مملکت کا باشندہ ہو گیا ہے، حکومت پاکستان نے دستور بنانے کے سلسلہ میں ادارہ تعلیمات اسلام کے نام سے علماء کا ایک بورڈ قائم کیا تھا، سید صاحب کو اس کی صدارت ڈیڑھ ہزار ماہانہ پر پیش کی گئی لیکن انھوں نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور رضا کارانہ طور پر وہاں کے مذہبی، قومی، تعلیمی اور علمی کاموں میں لگ گئے۔

۱۹۵۰ء کے نومبر میں انجمن ترقی اردو پاکستان نے ان کے اعزاز میں ایک علمی جلسہ کیا جس کی صدارت ڈاکٹر محمود حسین وزیر مرکزی کابینہ نے کی اور سید صاحب نے اپنا ایک مقالہ ”ہندوستان کے نو مسلم حکمران“ پڑھا لیکن ان کے پاکستان جانے کی جو اصلی غایت تھی، اس کو اس عاجز راقم کو ایک مکتوب لکھ کر اس طرح ظاہر فرمایا:

”یہاں اصلی کام دین کی خدمت اور حکومت اور اصحاب اقتدار کو ادھر متوجہ کرنا ہے، مسلمانوں سے اس کی اشاعت اور علوم دین کی حفاظت کا کام مقدم“

ان ہی باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہ ارباب حکومت سے ملتے اور موقع بموقع انکو تلقین کرتے رہے، پھر اسی خیال سے اپنی قیام گاہ کے قریب ہی زیر تعمیر جامع مسجد میں قرآن پاک کا درس دینا شروع کیا، اس جامع مسجد کا نام ان ہی کے نام پر جامع سلیمانی رکھا گیا، اس درس میں شرکاء کی تعداد اتنی بڑھی کہ لاؤڈ اسپیکر لگانے کی ضرورت ہوئی، اس مسجد کے چاروں طرف درس و تبلیغ کے کمرے، ایک کتب خانہ اور ایک علمی ادارہ بھی بنانے کا خیال تھا لیکن ان کی زندگی میں یہ پورا نہ ہو سکا۔

سلہٹ جمعیتہ العلماء کی صدارت:

جمعیتہ العلماء اسلام کی دعوت پر جنوری ۱۹۵۱ء میں ڈھاکہ، چاٹگام اور سلہٹ کا ایک دورہ بھی کیا، سلہٹ کے جمعیتہ العلماء اسلام کے ایک جلسہ میں ایک پر مغز صدارتی خطبہ بھی دیا، جس میں مذہبی اور دینی خدمت کی ترغیب دینے کے علاوہ پاکستان کی اقلیتوں سے فیاضانہ سلوک کرنے کی بھی نصیحت کی، چنانچہ فرماتے ہیں:

”میں نے جب کبھی پاکستان میں غیر مسلم اقلیت پر کسی زیادتی کا حال سنا، تو بحیثیت مسلمان کے اس پر شرمندگی محسوس کی، مسلمانوں کا فرض ہے کہ خواہ کسی دوسرے ملک میں ان کے ہم مذہبوں پر جو کچھ گزرے مگر وہ اپنے ملک کی اقلیت کی پوری پوری حفاظت کریں اور اسی طرح دوسرے ملک میں وہ اپنے بھائیوں کی مدد کر سکتے ہیں، آں حضرت ﷺ نے فرمایا جو کوئی غیر مسلم اقلیت (معاهد) پر ظلم کرے گا تو قیامت کے دن خدا کے سامنے اس کا دامن پکڑوں گا، اور یہ بھی فرمایا کہ جو اس پر ظلم کرے گا وہ جنت کی خوشبو تک نہ سونگھے گا، اس سے اندازہ لگانا چاہیے کہ ایک مسلمان پر غیر مسلم اقلیت کی جان و مال، عزت و آبرو کا کتنا بڑا فرض ہے۔“

تعلیمی و قومی سرگرمیاں:

وہاں سے واپسی کے بعد موتمرا سلامی کا جلسہ تھا، جس میں انھوں نے شرکت

فرمائی، اس کے بعد ہی ٹانڈو میں ایک دینی درس گاہ قائم ہوئی تو اس کی تاسیس میں پورا حصہ لیا اور اس کے سرپرست مقرر ہوئے، اسی سال پنجاب یونیورسٹی کا ایک کمیشن مقرر ہوا تو آپ اس کے ممبر بنائے گئے، نومبر ۱۹۵۱ء میں ملتان میں ایک تبلیغی جلسہ ہوا تو اس میں شرکت کی، پھر قائد اعظم کی یادگار میں ایک مجوزہ دارالعلوم کی جو کمیٹی بنی، اس کے بھی رکن ہوئے اور اس کے لیے لاہور ملتان، اور راولپنڈی کا سفر کیا، دستور ساز اسمبلی کے بنیادی حقوق کی سب کمیٹی کے بھی ممبر مقرر کیے گئے، اس کمیٹی میں ان کا سب سے بڑا کام یہ ہوا کہ اس کے ارکان کو قرآن اور سنت کے اتباع کی اہمیت واضح کر کے بتائی کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے امت کو کتاب و سنت کی جو دو نعمتیں عنایت فرمائی ہیں، ہدایت الہی ان ہی دونوں کے اندر منحصر ہے، اب جو بھی ایک کو چھوڑ کر صرف دوسری پر قناعت کرے گا، وہ یقیناً گمراہ ہوگا اور وہ ضلالت کی خودکشی سے کبھی بچ نہیں سکتا، سید صاحب نے اس نکتہ کی وضاحت بار بار کی، چنانچہ مذکورہ بالا کمیٹی کے ممبروں کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آگئی اور انھوں نے اپنی رپورٹ میں یہ دفعہ رکھی کہ کوئی ایسا قانون نہ بنایا جائے گا، جو قرآن پاک اور سنت کے خلاف ہو۔

فروری ۱۹۵۲ء میں انھوں نے دنیائے اسلام کے تمام علماء کو کراچی میں مدعو کیا، یہ کانفرنس اختفال علماء اسلام کے نام سے منعقد ہوئی اس کی کامیابی کے متعلق اپنے ایک مکتوب میں عاجز راقم کو تحریر فرماتے ہیں:

”اختفال علمائے اسلام کی مشغولیت کے سبب سے جواب نہ دے سکا، اختفال کامیاب رہا، گواہ ہر کے علماء کی شرکت نہ ہو سکی، تاہم مختلف ملکوں کے علماء یکجا ہو گئے، خصوصاً ایران اور نجف کے علماء کی آمد سے سنی اور شیعہ علماء کے درمیان بھراؤ اتفاق پیدا ہوا اور ہم آہنگی ہو گئی۔“

مارچ ۱۹۵۲ء میں لاہور میں پاکستان ہسٹاریکل کانفرنس کے شعبہ اسلامی تاریخ کی صدارت کی اور اس میں مقالہ بھی ”دہیل“ کے عنوان سے پیش کیا، وہاں عربی زبان

وادب کی بھی ایک کانفرنس ہوئی، اس کی بھی صدارت انھوں نے فرمائی، پھر اسی مہینہ پنجاب یونیورسٹی میں ان کا توسیعی لکچر بھی ہوا۔

اسی سال عرب ممالک کی سب سے بڑی علمی اکیڈمی مجمع الفوائد الاول نے ان کو اپنا رکن بنایا، ابوعلی سینا کی ہزار سالہ جوہلی کے موقع پر حکومت عراق نے ان کو اپنے یہاں مدعو کیا لیکن اس میں شرکت نہ فرما سکے۔

اپریل ۱۹۵۲ء کا پورا مہینہ ملتان اور راولپنڈی میں گزارا، یہاں عربی مدارس کے سالانہ جلسے ہوتے رہے، ان کی تنظیم کے لیے مفید مشورے دیئے، ملتان کو قائد اعظم کے مجوزہ دارالعلوم کے لیے پسند فرمایا۔

کراچی یونیورسٹی قائم ہوئی تو اس کے سینٹ کے ممبر نامزد کیے گئے، جناب لیاقت علی خاں مرحوم کی یاد میں حکومت نے پانچ لاکھ کے سرمایہ سے ایک کتب خانہ قائم کرنا چاہا، تو اس کی تاسیس و تشکیل کی خدمت انھی کے سپرد ہوئی، ان کے ذریعہ پاکستان کے مذہبی و قومی کام تو انجام پا رہے تھے لیکن خود ان کے لیے وہاں اب تک کوئی معاشی صورت پیدا نہیں ہوئی تھی، چنانچہ ایک مکتوب میں اس راقم کو تحریر فرمایا کہ معاشی صورت پیدا کرنے کے لیے ارادہ ہے کہ وہی پیشہ قدیم کتب فروشی اختیار کیا جائے، چنانچہ مکتبہ الشرق کے نام سے کتابوں کی ایک دکان کھولی، پاکستان کے آئین کے سلسلے میں وہاں کی حکومت نے ادارہ تعلیمات اسلام قائم کیا تھا، اس کی صدارت براہران کو پیش کی جا رہی تھی لیکن وہ اس کو قبول کرنے سے انکار کرتے رہے لیکن ہجرت کے تقریباً ستائیس مہینے کے بعد یہ عہدہ کچھ شرائط کے ساتھ قبول فرمایا، وہ اپنے ایک مکتوب مورخہ ۱۸/۱۱/۱۹۵۲ء میں اس حقیر کو تحریر فرماتے ہیں کہ:

”یہ (یعنی عہدہ صدارت ادارہ تعلیمات اسلام) دو برس پہلے میرے سامنے

پیش کیا گیا تھا، مگر میں نے بعض شروط رکھے تھے، وہ اب پورے ہو رہے ہیں،

یعنی آئین کے ساتھ قانون رائج کی اصلاح کا کام اب شروع ہوا ہے، تو میں

نے ۲ اگست کو قبول کر لیا، تاکہ پورے مسودہ آئین پر رائے دی جاسکے، گو آئین کا کام اب ختم ہو رہا ہے۔“

یہ نہ معلوم ہوسکا کہ اپنے شرائط پر عہدہ قبول کیا تو کتنا الاؤنس لینا پسند فرمایا۔

۱۹۵۲ء کے آخر میں جمعیتہ العلماء اسلام کے صدر مقرر ہوئے اور اس نے پاکستان کے دستور کو اسلامی بنانے میں جو مساعی کی اس میں ان کا حصہ نمایاں رہا۔

۱۹۵۳ء کے مارچ میں پاکستان ہسٹاریکل کانفرنس کی صدارت کے لیے ڈھا کہ تشریف لے گئے، وہاں خطبہ صدارت میں اردو اور بنگالی کے تنازع کے سلسلے میں اپنے درد مندانہ خیالات کا اظہار کیا جو وہاں کے ناعاقبت اندیش طلبہ کو پسند نہیں آئے، اس لیے جب کانفرنس کا اجلاس دوسرے روز شروع ہوا تو انھوں نے ہنگامہ برپا کرنے کی کوشش کی، جس سے اجلاس کو ملتوی کر دینا پڑا اور جب سید صاحب موٹر پر بیٹھ کر اپنی قیام گاہ کو واپس جانے لگے تو شرارت پسند طلبہ نے ان کی موٹر گھیر لی، ناروا الفاظ استعمال کیے اور تشدد پر آمادہ ہو کر ان کی اہانت پر اتر آئے لیکن وہ ان کی اہانت نہیں کر رہے تھے، بلکہ علم و حکمت، تحقیق و بصیرت، فکر و تدبر، عظمت و جلالت اور متانت و وقار کی تذلیل کر رہے تھے، مشرقی بنگال کے طلبہ کا یہ شرمناک رویہ ان کی قومی زندگی پر ہمیشہ کے لیے ایک بدنما داغ بن کر رہے گا، یہ طوفان بدتمیزی ختم ہوا تو ڈھا کہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے سید صاحب کی قیام گاہ پر آ کر اظہار ندامت کیا اور معافی مانگی لیکن ان کی ذات والا صفات ان رسمی باتوں سے بہت ہی بلند تھی، ڈھا کہ سے کراچی واپس جانے لگے تو ہندوستان میں اپنے منجھلے داماد جناب سید حسین صاحب اڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ فتح پور ہنسوا کے یہاں آ کر ٹھہرے، یہیں دارالمصنفین کا ایک چھوٹا سا قافلہ سراپا محبت بن کر ان کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا، وہ اپنے کفش برداروں کو دیکھ کر بے حد مسرور ہوئے، بڑے لطف و محبت سے پیش آئے اور وعدہ فرمایا کہ اس سال رمضان المبارک کے بعد دو مہینے دارالمصنفین میں آ کر گزاریں گے جس سے دارالمصنفین میں ان کی روحانی اولادیں بہت خوش ہوں گی، اسی سفر میں دارالعلوم

ندوہ کی مقناطیسی قوت نے ان کو اپنی طرف کھینچا اور وہ فتح پور سے کھنچ کر ندوہ چلے گئے، وہاں کے طلبہ اپنے پچھڑے ہوئے باپ سے بڑے والہانہ انداز سے ملے اور وہ بھی مجبور فرزندوں سے مل کر اشک بار ہوئے، ان کے اعزاز میں جمعیتہ الاصلاح کی طرف سے جمالیہ ہال میں ایک جلسہ ہوا تو پورا ہال بھر گیا، جب سید صاحب نے ہال کے زینہ پر قدم رکھا تو عمارت پر حسرت بھری نگاہ ڈالی اور درد بھری آواز میں یہ شعر پڑھا:

میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو

میں اپنے آپ کو مانند مہماں لے کے آیا ہوں

اس کے پڑھنے پر ان کی طرح اور لوگوں کی بھی آنکھیں اشک بار ہو گئیں، جلسہ کی کارروائی تلاوت قرآن پاک سے شروع ہوئی، قاری نے شروع میں:

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ قَالَ أَبُوهُمْ إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلَا أَنَّا  
تُفَنِّدُونَا (یوسف)

”جب قافلہ چلا تو ان کے باپ (یعنی حضرت یعقوب) نے کہا کہ میں یوسف کی خوشبو پارہا ہوں، اگر تم مجھ کو بے وقوف نہ بناؤ۔“

اس کو سن کر تمام حاضرین متاثر ہوئے، خود سید صاحب ضبط نہ فرما سکے، بے اختیار ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا تانتا بندھ گیا، ایک طالب علم نے عربی میں سپاسنامہ پڑھا، جس کے بعد سید صاحب نے بڑے درد بھرے انداز سے اپنی تقریر شروع کی، پوری تقریر سوز و درد کا مرقع تھی اس میں پاکستان کی ہجرت کے اسباب بیان فرمائے، اور آخر میں اپنے عزیز طلبہ کو یہ پیغام دیا:

سبق پھر پڑھ صداقت کا شجاعت کا عدالت کا

لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

ندوہ کے طلبہ کے نام ان کا یہ آخری پیام تھا، جو ان کی مادرِ درس گاہ کے ہر زمانہ کے طلبہ کے لیے باقی و جاری رہے گا، دارالمصنفین کے خدام رمضان المبارک کے بعد

اعظم گڑھ ان کی تشریف آوری کا انتظار کر رہے تھے کہ پہلے ایک خط میں موانع سفر کے اسباب لکھے، پھر اپنی علالت کی اطلاع دی، آخری خط میں ان کے روبصحت ہونے کی بشارت تھی لیکن ۱۲ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ مطابق ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء کو عشا کے بعد یکا یک ریڈیو سے خبر ملی کہ وہ اللہ کو پیارے ہوئے، آہ:

عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

وہ ہم سے رخصت ہو گئے اور زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں:

رفتم واز رفتن من عالمے تاریک شد

من مگر شمعِ چو رفتم بزم برہم ساختم

مگر عالمِ بالا میں ان کو دیکھ کر فرشتے پکار رہے ہوں گے:

جگہ خالی کرو مداح آتا ہے محمدؐ کا

## استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ کے اخلاق و سیرت کے کچھ جلوے

حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ اخلاق و سیرت کے لحاظ سے خلق عظیم کا نمونہ تھے، ان کے حسن اخلاق کے جلوے اتنے گونا گوں ہیں کہ ایک مختصر سے مضمون میں ان کا احاطہ دشوار ہے، ذیل کے سطور میں صرف ان کی ایک یک جھلک دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

### حب وطن:

اپنے وطن دینہ سے بڑی محبت رکھتے، جب گھر آتے اور یہاں سے رخصت ہونے لگتے تو اشک بار ہو جاتے، طالب علمی کے زمانے سے آخر عمر تک اس کے اجتماعی کاموں میں پوری دلچسپی لیتے رہے، وہاں کے باشندوں نے ۱۹۹۸ء میں اپنی معاشرتی و علمی اصلاح و ترقی کے لیے ایک انجمن قائم کی تھی، جس کے ماتحت اردو کا ایک شاندار کتب خانہ بھی ہے، اس کی ترقی میں ہر قسم کی امداد کرتے رہے، انجمن کے سالانہ جلسوں میں کبھی اپنی نظم سناتے، کبھی مقالہ پڑھتے، اور کبھی تقریر کرتے، اس کے بعض جلسوں کی صدارت بھی کی، فرمایا کرتے تھے کہ یوں تو اللہ تبارک تعالیٰ نے بہت سے کافر نفسوں کی صدارت کا شرف عطا کیا لیکن جولذت وطن کی انجمن الاصلاح کی صدارت میں محسوس ہوئی وہ کسی اور میں نہیں ہوئی۔

انجمن کا سالانہ اور بڑا سے بڑا وقتی چندہ پابندی سے ادا کرتے تھے، اپنے جد

بزرگوار کی تصنیف نور محمدی اپنے خرچ سے چھپوائی اور اس کے سارے نسخے انجمن کے کتب خانہ کو دے دیے کہ اس کی فروخت کی آمدنی کتب خانہ کے ضروریات میں خرچ ہو، اسی طرح اپنی تصنیف خطبات مدراس کی پانچ سو جلدیں اس کتب خانہ کو دیں، جن کی قیمت ۵۵۰ روپے تھی۔

قدیم آبائی مکان کے علاوہ ایک پُر فضا مقام پر ایک شاندار بنگلہ بنوایا تھا، اس میں اپنے اہل وطن کے ساتھ بیٹھ کر بڑی راحت محسوس کرتے، زندگی کے آخری دن اسی میں گزارنے کی تمنا ان کو تھی، لیکن مشیت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

اپنے ایک ہم مکتب دوست کو ایک مکتوب مورخہ ۱۶ جون ۱۹۴۸ء میں لکھتے ہیں:

”خلوت خانہ حق کے سوا کہیں آرام نہیں

جز خلوت گاہ حق آرام نیست

دینہ کا اس پیری میں قیام کا خیال ہمیشہ سے تھا، اسی لیے وہاں سب کچھ لگایا مگر افسوس کہ انقلاب زمانہ نے سارے منصوبے خاک میں ملا دیے، اب یہ بھی نہیں معلوم کہ بقیہ ایام عمر کہاں گزریں گے.....“

### اہل وطن سے لگاؤ:

تمام اہل وطن سے بڑا انس رکھتے تھے، ۱۹۱۵ء میں ان کے ایک محبوب ہم وطن مظفر امام محمد وحید ڈپٹی کلکٹر کا انتقال ہوا تو بے حد مغموم ہوئے، ان سے صرف ہم وطنی کا رشتہ تھا لیکن ان کی وفات پر ایک عزیز کو تحریر فرمایا:

”آہ! نہ صرف دینہ کا چراغ بجھ گیا بلکہ ہمارے دلوں کا بھی چراغ گل ہو گیا،

ہماری زندگی کا نشاط جاتا رہا، وطن کی یاد فراموش ہو گئی اور اس کی محبت سرد، خدا

کی قسم میری زندگی میں یہ سب سے بڑی مصیبت ہو گئی، اگر میرے دونوں بچے

مر جاتے تو اتنا غم نہ ہوتا، بس اب ہو چکا:

غریباں را دل از بہر تو خون است  
دل خویشاں نمی دامن کہ چوں است

راقم کے والد جناب سید محی الدین صاحب مرحوم ۱۹۰۹ء میں بی۔ اے۔ کرنے کے بعد ڈپٹی کلکٹری کے لیے نامزد ہو گئے تھے، مگر اس عہدے پر فائز ہونے سے پہلے اللہ کو پیارے ہو گئے، سید صاحب نے ان کی حسرت ناک موت پر ایک پُر درد مرثیہ لکھا، جب اس راقم کو دارالمصنفین بلایا تو میرے والد مرحوم کے سگے پھوپھی زاد اور اپنے ہم درس سگے ماموں زاد بھائی سے کہا کہ اب مجھے موقع ملا ہے کہ محی الدین مرحوم کی دوستی اور محبت کا حق ادا کر سکوں (۱)۔

۱۹۳۳ء میں دیسنہ کی ایک جوان خاتون کی حسرت ناک موت ہوئی، سید صاحب اس وقت وطن ہی میں تھے، مرحومہ سے دور کا رشتہ تھا لیکن ان کا جنازہ اٹھا تو اس کے پیچھے وہ زار و قطار رو رہے تھے اور جب جنازہ کی نماز پڑھانے لگے تو چہرہ آنسوؤں سے بالکل تر ہو گیا۔

جناب سید عبدالحکیم صاحب جواب بھی بقید حیات ہیں (۲) ان کے رشتے کے چچا ہوتے ہیں، عمر میں وہ سید صاحب سے تقریباً بارہ تیرہ برس بڑے ہیں، ان سے تمام عمر اپنے حقیقی چچا سے زیادہ محبت کرتے رہے، ایک خط مورخہ ۲ اکتوبر ۱۹۳۳ء میں ان کو لکھتے ہیں:

”آپ کے دل کو مجھ سے اور مجھے آپ کے دل سے جو لگاؤ ہے، وہ سوال اور

استدلال سے باہر ہے، یقیناً آپ نے اپنے دل کو بہت روک رکھا اور یہاں

بھی ہر روز آپ کو خط نہ لکھنے اور آپ کے خط نہ آنے کا خیال رہا۔“

پھر کراچی سے ۱۵ جنوری ۱۹۵۱ء کو ان کو تحریر فرماتے ہیں:

”آپ کو اس ناکارہ سے جو رابطہ قلبی ہے، اس کا میرے دل پر اثر ہمیشہ رہا ہے

(۱) معارف نمبر ۵ جلد ۸۴

(۲) اب وہ وفات پا چکے ہیں (۱۹۵۸ء میں)

اور وہ اب تک اسی طرح ہے:

ہقہ مہر بدال نام و نشان است کہ بود

.....افسوس ہے کہ وطن کا شیرازہ اور احباب واعزہ ایسے متفرق ہوئے کہ ان کے دیدار سے محرومی رہے گی اور اس کا اپنے قلب پر بڑا اثر پاتا ہوں، یہاں کیا آیا کہ دنیا ہی بدل گئی، ہندوستان بھلانے سے بھی نہیں بھولتا.....خدا جانے چمن پر کیا گزری۔“

سید عبدالحکیم صاحب کو بھی ان سے بڑی فریفتگی رہی، یوں تو وہ عمر میں بڑے ہیں لیکن آخر میں وہ ان سے روحانی استفادہ بھی کرنے لگے تھے، سید صاحب کی طالب علمی کے زمانہ سے ان کے آخری عمر تک دونوں میں برابر خط و کتابت قائم رہی، جس کو سید عبدالحکیم صاحب نے حرز جان بنائے رکھا ہے، یہ خطوط ایسی قیمتی دستاویز ہیں جن سے سید صاحب کی سوانح حیات مرتب کرنے میں بڑی مدد ملے گی۔

آخر زمانہ میں جب کبھی سید صاحب کا قیام وطن میں رہتا تو ان کا معمول تھا کہ روزانہ فجر کی نماز کے بعد مسجد میں کلام پاک کا درس دیتے، جمعہ کے روز وعظ بھی کہتے، اپنے ایک مکتوب میں سید عبدالحکیم صاحب کو لکھتے ہیں کہ ”وطن کی ہر ٹھیکری میرے لیے لعل و گہر سے زیادہ عزیز ہے، حب الوطن من الایمان“، لیکن اس لگاؤ کے باوجود گاؤں کی متنازعہ فیہ باتوں میں پڑنے سے حتی الوسع پرہیز کرتے، فرماتے کہ قیام وطن کے زمانہ میں جذبات میں تین دور آتے ہیں، پہلے دور میں خیال ہوتا ہے، میرے ہم وطن چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھ کر خواہ مخواہ تفسیع اوقات کرتے رہتے ہیں، دوسرے دور میں خود ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو سننے کو جی چاہتا ہے، تیسرے دور میں نفس ان باتوں میں حصہ لینے کو آمادہ کرتا ہے، اس وقت رحت سفر باندھ لیتا ہوں، جب کسی اہل وطن سے کوئی شکایت ہوتی تو درگزر کر کے خاموش ہو جاتے اور فرماتے میرا تو یہ مسلک ہے:

تو خصم باش وز ما دوستی تماشا کن

## اہل و عیال سے محبت:

ان کی خانگی زندگی شفقت و محبت کے مناظر سے معمور ہے، پہلی اہلیہ کے مرض الموت میں بڑی سوزی اور تن دہی سے تیمارداری کی، ان کو اعظم گڑھ سے لکھنؤ علاج کے لئے لے گئے اور قرض لے لے کر علاج کراتے رہے مگر وہ تیرہ سال کی رفاقت کے بعد ۱۹۱۷ء میں جنت کو سدھاریں، رفیقہ حیات کی جدائی پر غیر معمولی اثر ہوا، جس کا اظہار ایک نظم ”فراق یار“ میں کیا، ان کے غم و الم کی خبر اکبر الہ آبادی کو ہوئی تو انھوں نے خطوط میں اشعار لکھ کر ان کو تسلی دی، پہلے خط میں یہ شعر لکھ کر تلقین کی:

اگر چہ تلخ ملا جام عمر فانی کا  
مگر محل نہیں ساقی سے بدگمانی کا  
دوسرے خط میں یہ رباعی لکھ کر دل جوئی کی،

جس سے میری زندگی تھی مر گیا کیوں کر سکا  
چرخ نے مجھ پر ستم یارب کیا کیوں کر سکا  
واقعاتِ جاں گزا کا کیوں ہوا ایسا وقوع  
کیوں نہ میری آہ سے قانونِ فطرت ڈر سکا  
پھر اور دوسرے خطوط میں یہ متفرق اشعار تھے:

صدیوں فلاسفی کی چناں اور چینیں رہی  
لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی  
ساتھی جو تھے رنج و راحت کے اس موت کے ہاتھوں چھوٹ گئے  
اب یاس گرائے دیتی ہے سب دل کے سہارے ٹوٹ گئے  
مرنے والا مر چکا، اور رونے والا رو چکا  
وائے برہستی اگر مقصود ہستی ہو چکا

پہلی اہلیہ نے دوا دلادیں چھوڑی تھیں، سیدہ مرحومہ اور ابو سہیل سلمہ اللہ (کسٹم

آفیسر مشرقی پاکستان) ان ہی سے دل بہلا کر بقیہ زندگی تجرد میں گزار دینے کا تہیہ کیا تھا لیکن اپنے والد بزرگوار کے اصرار پر ۱۹۲۰ء میں دوسرا عقد کیا، یہ اہلیہ بھی مشکل سے ڈیڑھ سال زندہ رہیں، ان کی وفات پر پرانا غم تازہ ہو گیا، وطن اور اہلیہ ثانی کے گھر کو یاد کر کے مغموم اور بے چین رہتے تھے، چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

”دیس نہ اور اس کے مکان کی ایک کوٹھری میرے لیے تاریخی غم کی یادگار بن گئی ہے اور میرے احساس کو صدمہ پہنچتا رہتا ہے۔“

تیسرا نکاح ۷ جنوری ۱۹۲۳ء میں ہوا، ان اہلیہ سے ایک لڑکا عزیز ی سلمان سلمہ اور چار لڑکیاں ہیں، شمیمہ (اہلیہ ابو عاصم صاحب ایڈوکیٹ کراچی) شکیلہ (اہلیہ سید حسن صاحب اڈیشنل کمشنر، بریلی ڈویژن) اور دوا بھی ناکتھا ہیں (۱)۔ اپنے تمام بچوں سے بڑی محبت رکھتے تھے، سب سے چھوٹی اولاد کو برابر اپنی گود میں بٹھائے رکھتے، حتیٰ کہ کبھی کبھی سفر میں بھی اس کو ساتھ لے جاتے، ان سب کو آپ ہی کہہ کر مخاطب کرتے، جب ان سے کسی بات پر ناراض ہوتے، تو ڈانٹتے اور جھڑکنے کے بجائے صرف یہ کہتے کہ یہ طاغوتی حرکت مجھ کو پسند نہیں، کئی بچے بچپن ہی میں فوت ہو گئے، ایک داماد اور ایک لڑکی کی جوانمرگی کا بھی غم اٹھانا پڑا لیکن ان کی اکلوتی اولاد سیدنتی اشرف سلمہ اللہ (اسٹیٹ بینک پاکستان) کو اپنی آغوش شفقت میں لے کر ان دونوں کا غم غلط کرتے رہے۔

## ہم درسوں سے تعلق:

اپنے مکتب اور درس کے ساتھیوں سے ان کو ہمیشہ لگاؤ رہا، ان کے ایک ہم مکتب جناب سید محمد حنیف تھے جو تعلیم حاصل کرنے کے بعد مختار ہوئے لیکن وارستگی مزاج کی بنا پر مختاری چھوڑ دی اور اپنے وطن دیسنہ سے منتقل ہو کر اپنی سسرال گیلانی میں سکونت پذیر ہو گئے، وہ غایتِ سادگی میں کھڑاؤن استعمال کرتے ہیں اور ناس برابر لیتے رہتے ہیں،

(۱) اب وہ صاحب اولاد ہیں اور کراچی میں ہیں۔

ایک بار سید صاحب کو دین سے گیلانی جانے کا اتفاق ہوا، یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ان کی علمی شہرت بہت زیادہ پھیل چکی تھی، گیلانی پہنچ کر دریافت کیا کہ میرے پرانے ساتھی اور بھائی کھڑاؤن الناس کہاں ہیں، ان کو تلاش کر کے بڑے اخلاق، محبت اور بے تکلفی سے ملے، سید محمد حنیف صاحب ۱۹۵۰ء میں حج کے لیے گئے تو مکہ معظمہ میں سید صاحب سے ملاقات ہوئی، اتفاق سے سید محمد حنیف صاحب وہاں سخت علیل ہو گئے، اُن کی علالت کی خبر سید صاحب کو ہوئی تو عیادت کے لیے گئے اور ہر طرح ان کو تسلی دی، سید محمد حنیف صاحب اس واقعہ کو جب یاد کرتے ہیں تو یہ کہہ کر آب دیدہ ہو جاتے ہیں کہ کہاں میں ایک لا اُبالی آدمی جو کس مہر سی میں پڑا ہوا تھا اور کہاں سید صاحب کی ذات والا قدر جن کی تعظیم کے لیے حکومت سعودی کے بڑے بڑے حکام سر و قد کھڑے ہو جاتے تھے، وہ میری عیادت کے لیے آئے اور تسلی و تشفی سے سرفراز کرتے رہے۔

سید صاحب کے ایک دوسرے ہم مکتب مولانا محمد قاسم صاحب دیوبندی تھے، مکتب کی تعلیم ختم کرنے کے بعد کچھ دنوں دارالعلوم ندوہ میں تعلیم پائی، پھر دیوبند میں تکمیل کی مختلف مدرسوں میں ملازمت کرنے کے بعد آخر میں مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں مدرس ہوئے، سید صاحب ندوہ سے اپنی طالب علمی کے زمانہ میں ان کو دیوبند ایک خط میں لکھتے ہیں:

”دوسروں کے نام آپ کے خط آئے اور میں آپ کے خط دیکھنے کو ترسوں، مجھے یاد نہیں کہ آپ نے کبھی خط لکھنے میں سبقت فرمائی، صاحب چاہ مشکل نہیں بناہ مشکل ہے۔“

اور یہ بے تکلفی آخر وقت تک قائم رہی، دارالمصنفین کے دور قیام میں ان کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

اللہ رے ناز حسن کہ بولیں بھی وہ تو یوں

ہاں وہ کہاں ہے درپہ جو میرے پڑا رہا

”بھولے دوست! جیسے میں کبھی نہ یاد آؤں، آپ کو دارالمصنفین کا خیال آیا تو

غیر سے استفسار کیا حاجت تھی، شاید وہ سزاوار خطاب نہ تھا۔“  
ندوہ کے ساتھیوں میں مولوی ضیاء الحسن علوی ندوی مرحوم کو بہت عزیز رکھتے تھے، ان کی وفات پر بے حد ملول ہوئے، چنانچہ معارف کے ایک مضمون میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا:

”افسوس ہے کہ میرے رفیق قدیم اور صدیق حمیم مولوی ضیاء الحسن صاحب علوی ندوی نے ایک مختصر علالت کے بعد ۱۴ جون ۱۹۴۵ء کو الہ آباد میں جہاں وہ عربی مدرسوں کے انسپکٹر اور مشرقی امتحانوں کے رجسٹرار تھے، ستاون برس کی عمر میں وفات پائی، اس حادثہ کی اطلاع مجھے ۱۸ جون کو لکھنؤ میں اسی مدرسہ میں ملی، جہاں میں اور مرحوم مل کر ایک جان اور دو قالب تھے، افسوس کہ ایک قالب خالی ہو گیا اور دوسرا نیم جان موجود ہے، مرحوم مجھ سے عمر میں تقریباً پانچ برس چھوٹے گو تعلیم کے درجہ میں دو ایک سال بڑے تھے، اس لیے بظاہر یہی امید تھی کہ ان ہی کو میری جدائی کا صدمہ برداشت کرنا پڑیگا، مگر تقدیر یہی تھی کہ مجھے ان کے فراق کا غم سہنا پڑے گا، اسی لیے امید غلط ثابت ہوئی، اور تقدیر کا فرمان نافذ ہو کر رہا:

اکنوں چہ توں کرد، تقدیر چنیں بود۔“

مولوی ضیاء الحسن صاحب مرحوم تعلیم میں ان سے ایک سال سینیئر تھے، اس لیے آخر وقت تک سید صاحب کو ”تم“ کہہ کر مخاطب کرتے تھے، ایک بار ضیاء الحسن صاحب مرحوم ان کو اپنی ایک تحریر سنارہے تھے، سید صاحب نے ان کو ایک جگہ ٹوکا، وہ بولے ”سلمان! تم اردو کیا جانو“ اس فقرہ سے سید صاحب بہت محظوظ ہوئے اور کئی بار اپنی نجی صحبتوں میں اس کا ذکر کیا۔

معاصرین سے محبت:

اپنے معاصرین اہل علم میں ڈاکٹر اقبال سے بڑا گہرا لگاؤ رکھتے تھے، نجی مجلسوں



میں کہا کرتے کہ عالم اسلام میں ایک عرصہ کے بعد ڈاکٹر اقبال جیسا مفکر اعظم پیدا ہوا ہے، ان کو موحد خالص، رسول کا شیدائی، دین کامل کا علمبردار، فلسفہ اسلام کا ترجمان اور تجدید ملت کا طلب گار کہا کرتے، جب ان کی رحلت کی خبر ملی تو معارف میں اس کا بڑا دردناک ماتم کیا، جس کے بعض ٹکڑے یہ ہیں:

”صفر کی انیسویں اور اپریل کی اکیسویں کی صبح کو عمر کی اکٹھ بہاریں دیکھ کر اور شاعری کی دنیا میں چالیس برس چھپا کر یہ بلبل ہزار داستان اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا، وہ ہندوستان کی آبرو، مشرق کی عزت اور اسلام کا فخر تھا، آج دنیا ان ساری عزتوں سے محروم ہو گئی اور ایسا عارف فلسفی، عاشق رسول شاعر، فلسفہ اسلام کا ترجمان اور کاروانِ ملت کا حدی خواں صدیوں کے بعد پیدا ہوا تھا، اور شاید صدیوں کے بعد پیدا ہو، اس کے ذہن کا ہر ترانہ بانگ درا، اس کی جانِ حزین کی ہر آواز زبورِ عجم، اس کے دل کی ہر فریادِ پیامِ مشرق، اس کے شعر کا ہر پرواز بالِ جبریل تھا، اس کی فانی عمر گوشت ہو گئی لیکن اس کی زندگی کا ہر کارنامہ جاوید نامہ بن کر انشاء اللہ باقی رہے گا، امید ہے کہ ملت کا یہ غم خوار شاعر اب عرشِ الہی کے سایہ میں ہوگا، اور قبول و مغفرت کے پھول اس پر برسائے جارہے ہوں گے، خداوند! اس کے دل شکستہ کی جو ملت کے غم سے رنجور تھا، غنخواری فرما، اور اپنی ربانی نوازشوں سے اس کے قلبِ حزین کو مسرور کر۔“

سر شیخ عبدالقادر سے بھی بہت متاثر تھے ان کو پہلی دفعہ ۱۹۰۰ء میں پٹنہ میں ندوۃ العلماء کے جلسہ میں دیکھا تھا، اس موقع پر انھوں نے ایسی دل چسپ تقریر کی تھی جس سے حاضرین جلسہ کے ساتھ سید صاحب بھی مجو حیرت ہو گئے، ان کے بیان کے مطابق اس کا یہ اثر ہوا کہ:

”دل میں ایسی ہی تقریر کرنے کا جذبہ پیدا کر دیا، جس کی مشق بعد ہوئی۔“

بعد میں ان سے اچھے خاصے مراسم پیدا ہو گئے تھے اور جب ان کا انتقال ہوا تو ان کی یاد میں لکھا:

”مرحوم کی شخصیت گونا گوں اوصاف کی حامل تھی اور ہر مجلس و محفل میں ان کی یکساں قدر و منزلت تھی، وہ نیک طینت، نرم مزاج، متواضع اور ملنسار تھے، ان کی مختلف النوع خدمات میں میرے نزدیک سب سے بڑی خدمت ان کی ادبی خدمت ہے، اور وہ بھی خاص نوع کی، یعنی لکھنے والے تو بیسیوں ہیں، مگر ان کا کارنامہ ہے کہ انھوں نے بیسیوں کو ادیب، انشا پرداز، اہل قلم، مصنف اور شاعر بنادیا اور حق یہ ہے کہ ان ہی نے ہندوستان کو اقبال بخشا۔“

سیاسی دوستوں میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری سے قلبی تعلق رکھتے تھے، ۱۹۳۶ء میں موسم گرما میں دہرہ دون میں تھے، ۹ مئی کی شام کو وہاں کی ایک سڑک پر دور سے ڈاکٹر انصاری کو موٹر پر جاتے دیکھا، صبح ان کی قیام گاہ کی تلاش کی کوشش کی، معلوم ہوا کہ وہ رات ہی دہلی چلے گئے اور شام کو اطلاع ملی کہ وہ راستہ میں ہی جنت کو سدھار گئے، یہ خبر سن کر سید صاحب کا دل دھڑکنے لگا، آنکھیں اشک بار ہو گئیں، سینہ سے آہوں کے شعلے اٹھنے لگے، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے صبر و تمکین کی ساری متاع جل کر خاکستر ہو رہی ہے، ڈاکٹروں نے ان کو لکھنے پڑھنے کی ممانعت کی تھی لیکن ان کی طبیعت نہ مانی اور ڈاکٹر صاحب کا ماتم لکھنا شروع کیا، جس کا آخری ٹکڑا یہ ہے:

”طرابلس اور بلقان کے ہنگاموں نے ہمارے چند جدید یافتہ نوجوانوں کو دفعۃً سوتے سے بیدار کر دیا تھا، محمد علی مرحوم اس قافلہ کے سالار تھے، اور ڈاکٹر انصاری اس کے سب سے پُر جوش رہبر تھے، افسوس کہ ان دونوں دردمندوں نے دل ہی کے آزار میں وفات پائی، دل کا درد مجاز بن کر نمودار ہوا اور ان کی قومی زندگی کا باعث ہوا، اور وہی حقیقت بن کر ان کی موت کا سبب ہوا، محمد علی نے داغِ مفارقت دیا اور اب:

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی  
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی نموش ہے

صلحاء و علماء کا احترام:

مکتبی تعلیم ختم کرنے کے بعد اپنے وطن دیسنہ سے نکلے تو کچھ دنوں جناب شاہ محی الدین صاحب پھلواڑی کے سامنے بھی زانوئے تلمذتہ کیا تھا، ان کی قدر و منزلت سید صاحب کے دل میں آخر وقت تک قائم رہی، ایک تحریر میں فرماتے ہیں:

”مجھے خانقاہ میں خاص حضرت شاہ محی الدین صاحب مرحوم کے قرب قیام کی، اور ایک ساتھ طعام کی اور زیر درس کتابوں میں شاگردی کی سعادت حاصل ہوئی، مجھے اس نسبت پر فخر اور انھیں اس پر مسرت تھی۔“

جناب شاہ سلیمان صاحب پھلواڑی سے ان کا کوئی رشتہ تو نہ تھا لیکن سید صاحب کے والد مرحوم ان کے پیر بھائی اور ان کے خسر کے مرید تھے، اس لئے سید صاحب ان کو اپنا بزرگ سمجھتے رہے، اور خود شاہ صاحب ان کو اپنے عزیز سے کم نہیں سمجھتے تھے، جب شاہ صاحب کا وصال ہوا تو سید صاحب نے ان کے صاحب زادے مولانا سید شاہ غلام حسین صاحب پھلواڑی کو ایک خط مورخہ ۱۹ اگست ۱۹۳۳ء میں لکھا:

”شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو مجھ ذرہ بے مقدار کے ساتھ جوشفقت تھی وہ مجھے یاد رہی، بنارس کے جلسہ ندوہ میں شاہ صاحب نے مولانا شبلی کی تحریک پر مجھ کو اپنی ایک عبا بطور استھان و انعام دینا منظور فرمایا تھا، میں ہمیشہ اس کا تقاضہ کرتا رہا اور اس تقاضے میں اب بھی اور اس عمر میں بھی مجھے کیا لطف آتا تھا، ایک دفعہ میں نے جب ہنوز عمر کی پختگی اور عقل کی تکمیل نہیں ہوئی تھی ایک عریضہ لکھا، اس میں جدید انشا پردازی کی پیروی میں السلام علیکم نہیں لکھا تھا، اس پر ان کی بزرگانہ ڈانٹ مجھے اب تک یاد ہے۔“

مولانا سید محمد علی مونگیری قدس سرہ العزیز سے بھی بہت متاثر تھے، جس زمانہ میں وہ ندوہ میں تعلیم پاتے تھے، مولانا مرحوم ندوہ کے ناظم تھے، ایک روز انھوں نے سید صاحب کو بلا کر پوچھا کہ تم کس فن سے ذوق ہے، سید صاحب نے جواب دیا ”عربی ادب اور منطق سے“ پھر پوچھا ”کیوں؟“ سید صاحب نے کہا کہ ”اس لیے کہ یہ دونوں اصل مقصود نہیں علوم کے خادم اور ذریعہ ہیں“ مولانا نے فرمایا کہ آخر ان اصل علوم کی طرف کب توجہ ہوگی، سید صاحب نے کہا کہ جب ان میں کمال پیدا ہو جائے گا، یہ سن کر مولانا نے فرمایا تو اسی خادم اور ذریعہ علوم میں تو ہمارے علماء کی پوری عمریں بسر ہو جاتی ہیں اور اصل مقصود کی نوبت نہیں آتی، اس کے بعد انھوں نے یہ حکایت بیان کی کہ ایک صاحب کو تصنیف کا شوق پیدا ہوا تو وہ قلم بنانا کر رکھنے لگے، یہاں تک کہ تمام کمرہ قلموں سے بھر گیا، کسی نے ان سے پوچھا کہ حضرت یہ آپ اتنے قلم بنانا کر کیوں رکھ رہے ہیں، تو متانت سے بولے کہ میرا اردادہ تصنیف کا ہے، پوچھنے والے نے کہا کہ پھر وہ کب شروع ہوگی، جواب دیا کہ جب ان قلموں سے فرصت ملے گی، یہ تمثیل اس بات کی تھی کہ عربی نصاب کا بڑا حصہ دینی علوم کی تمہید اور ذریعہ کے طور پر پڑھایا جاتا ہے، مگر ہوتا یہ ہے کہ یہ ذریعہ تعلیم اصل تعلیم کی جگہ لے لیتا ہے، سید صاحب کا بیان ہے کہ مولانا کی یہ حکایت میرے لیے اس درجہ موثر ہوئی کہ میں نے پھر تمام عمر ذریعہ علوم اور مقصد علوم کے درمیان کبھی مغالطہ نہیں کھایا اور عین وقت پر میری ایسی رہبری ہوئی جس نے میرے خیالات کی دنیا پلٹ دی۔

مولانا حمید الدین فراہی بی۔ اے۔ کا بھی بہت احترام کرتے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں ”ان سے قرآن پاک اور فلسفہ جدید کے سبق تو کم پڑھے مگر صحبت بار بار اٹھائی اور مشکلات میں مشورے بار بار کیے، سیرت کی تیسری جلد میں جو معجزات پر ہے، ان ہی کے فلسفہ کی تقلید کی ہے۔“

مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے اخلاق، جو دو سخا، تواضع و انکسار، ارشاد و ہدایت، وعظ و نصیحت، تلاش و مطالعہ اور قومی درد کے بے حد مداح تھے، سیاسی کاموں میں ایک عرصہ

تک ان کے ساتھ رہے، اور جب ۴۷ سال کی عمر میں ان کی وفات کا دردناک حادثہ پیش آیا تو ان کے اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

”جدید تعلیم یافتوں کی سیاسی جدوجہد کو مذہبی تحریک بنا دینا ان ہی کا کارنامہ شمار کیا جائے گا، اس لیے ان کی یہ غیر متوقع موت صرف فرنگی محل ہی نہیں بلکہ اسلام کا سانحہ ہے اور بنا بریں ان کی جواں مرگی ہمیشہ کے لیے تاریخ اسلام کا ایک اندوہ ناک واقعہ شمار کیا جائے گا۔“

مولانا سجاد نائب امیر شریعت بہار کی رحلت کی خبر پائی تو بے حد ملول رہے، ایک نجی خط میں اپنے ندوی عزیز مولانا مسعود عالم کو لکھتے ہیں:

”ہاں بھائی تمہارے دونوں خطوں میں مولانا سجاد مرحوم کے تاثرات کا عکس تھا: اک تیر تھا جو ہائے کلیجہ کے پار تھا،

۲۰ دسمبر کو خط سے اطلاع ملی وہ دن ہے اور آج کا دن ہے کہ کوئی رات ان کی یاد اور تصور ذہنی سے خالی نہیں، معارف میں ماتم لکھنے بیٹھا تو زبان و قلم نے ساتھ دینے سے انکار کیا، مجبوراً چار سطریں لکھ کر چھوڑ دیں، ہمارا صوبہ خالی ہو گیا اور کیا کہوں:

ایک عالی دماغ تھا نہ رہا۔“

مولانا حسین احمد صاحب مدنی سے بھی بڑی عقیدت رکھتے تھے، جب ان میں تصوف و سلوک کا ذوق پیدا ہوا، تو پہلے مولانا حسین احمد ہی کی جانب ان کا میلان ہوا اور ان ہی سے بیعت کا ارادہ رکھتے تھے لیکن ایک روز خواب میں دیکھا کہ ایک پلنگ پر حضرت مولانا اشرف علی تھانوی تشریف فرما ہیں اور اسی کے پاس ایک دوسرے پلنگ پر وہ خود مولانا حسین احمد صاحب کے ساتھ بیٹھے ہیں، یکا یک مولانا حسین احمد اپنی جگہ سے اٹھے اور سید صاحب کا ہاتھ پکڑ کر مولانا اشرف علی کے سامنے پیش کر کے فرمایا: ”ان کو میری طرف سے قبول فرمالیں، اسی خواب کے بعد وہ مولانا تھانوی کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے۔“

وہ اپنی زندگی کے آخر زمانے میں بقول ان ہی کے ”روح کی الجھن“ میں مبتلا ہو گئے اور اسی سے نجات کے لیے حضرت مولانا اشرف علی کی طرف رجوع فرمایا تھا، اس انقلاب کے بعد ان کے پاس بہت سے خطوط آئے کہ ان کے جیسے فاضل اجل اور محقق کو ایک پرانے طرز کے عالم کے سامنے سر جھکانے کی کیا ضرورت تھی، اس کے جواب میں اکثر نجی صحبتوں میں فرماتے تھے کہ یہ لوگ زبان سے تو مجھ کو فاضل اور محقق کہتے ہیں، مگر درحقیقت مجھ کو بے عقل جانتے ہیں، آخر اس بات پر کیوں نہیں غور کرتے ہیں کہ ان کے خیال کے مطابق اگر واقعی محقق اور علامہ دہر ہوں، تو کیا بلا وجہ میں نے مولانا تھانوی کا دامن تھاما؟ ان لوگوں کو سمجھنا چاہیے کہ میں نے اپنے اندر کوئی تو کمی پائی جس کی تکمیل کے لیے وہاں گیا، اسی سلسلہ میں اپنے ایک نجی خط مورخہ ۳۱ دسمبر ۱۹۴۱ء میں سید عبدالحکیم صاحب کو لکھتے ہیں:

”آپ اپنی محبت سے مجھے سب کچھ سمجھتے ہیں لیکن من آنم کہ من دانم، علماء پر فرائض کا بار عام مسلمانوں سے زیادہ ہے، اس لیے اگر وہ درست نہ ہوں تو ان پر عذاب دوسروں سے زیادہ ہے، معاملہ دماغ کا نہیں قلب سلیم اور قلب منیب کا ہے، نفس کا نہیں روح کا ہے، میری اتنی زندگی بندوں میں گزری، اب کچھ اس زندگی کے لیے بھی کرنا چاہیے، جو باقی ہے، علم اور قوم کی خدمت بہت کچھ ہو چکی..... ابھی میری منزل مقصود بہت دور ہے..... صرف تسبیح اور مراقبہ سے کچھ نہیں ملتا، جب تک دل کا تعلق دل والے سے نہ ہو، ہم تو بندوں کی رضا مندی اور ناراضی میں گرفتار ہیں، مالک کی رضا مندی اور ناراضا مندی کی کس کو فکر ہے، دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے صحیح راستہ پر چلائے۔“

وہ ”فرائض کے پابند“ اور ”بدعات سے نفور“ تو شروع زندگی سے رہے لیکن آخر میں استقامت و خشیت ”رغبت الی الطاعات، صلاح دل اور حصول اخلاص“ کے خواستگار ہو گئے تھے۔

انکسار:

طبیعت میں انتہا درجہ کی متانت و سنجیدگی تھی، اس لیے دور سے دیکھنے والے ان کی خاموشی اور کم آمیزی کو ان کے غرور اور پندارِ علم پر محمول کرتے تھے، ایک بار دہلی کے ایک رسالہ نے ان کے خلاف کچھ لکھنا شروع کیا، اس رسالہ کے ایڈیٹر سے منشی ذکاء اللہ مرحوم کے نامور فرزند جناب عنایت اللہ صاحب (سابق ناظم دارالترجمہ حیدرآباد دکن) کے بھی مراسم تھے، سید صاحب نے عنایت اللہ صاحب کو لکھا کہ رسالہ مذکور کے ایڈیٹر سے دریافت فرمائیں کہ مجھ سے ان کو کیا شکایت ہے جو میرے پیچھے پڑ گئے، عنایت اللہ صاحب نے ایڈیٹر مذکور کو ایک خط لکھا، انھوں نے جواب دیا کہ مولوی سید سلیمان بڑے مغرور آدمی ہیں، ان کے غرور کو توڑنا چاہتا ہوں، عنایت اللہ صاحب نے اپنی طرف سے ان کو جواب دیا کہ میں بھی سید صاحب سے ملتا رہا ہوں، ان کو کسی حال میں مغرور نہیں پایا، البتہ عالم اور بہت بڑے عالم ہیں، اپنے علم کے پندار کو قائم رکھنا چاہتے ہیں، تو یہ تو ان کا بڑا وصف ہے۔ وہ تحریر میں بھی مغرور نہ تھے، معارف کے شذرات لکھتے وقت برابر یہ خیال رکھتے کہ کہیں سے انا کی بونہ آئے، اکثر ایسا ہوا کہ اگر کہیں ”میں“ لکھ جاتے تو اس کو کاٹ کر ایڈیٹر معارف یا خاکسار یا ہچمدان بنا دیتے، اپنے نام کی رعایت سے ہچمدان ہی لکھنا زیادہ پسند کرتے تھے، اپنی تحریر کے مسودے اکثر اپنے شاگردوں کو نظر ثانی کرنے کے لیے بلا تکلف دے دیتے اور ان کے مشوروں کو قبول کرنے میں مطلق تامل نہ کرتے، نجی صحبتوں میں دوستوں اور شاگردوں سے بہت بے تکلف رہتے، اگر ذہن میں کوئی اچھا فقرہ آ جاتا تو بلا تکلف کہہ ڈالتے، بعض اوقات ان فقروں سے ان کے شاگردوں کو آنکھیں نیچی کر لینی پڑتیں۔

ان کے فطری انکسار کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا کہ ایک بار حیدرآباد دکن تشریف لے گئے تو وہاں کے مشہور شاعر جناب امجد صاحب حیدرآبادی سے ملنے ان کے مکان پر

گئے، امجد صاحب نے اس کے شکریہ میں یہ اشعار لکھ کر بھیجے:

کروں شکریہ کس منہ سے تیرا خدایا      سلیمان اعظم میرے گھر میں آیا  
از جلوہ حسن خویش حیراں کردی      کافر دل را مگر مسلمانا کردی  
بنو اختی از قدوم خود امجد را      ایں مور ضعیف را سلیمانا کردی  
توسید صاحب نے اس کے جواب میں یہ رباعی لکھ کر بھیجی:

امجد تو اسیر زلف احساں کردی      و زور سخن عالم درخشاں کردی  
منت بہ غریب شہر چنداں کردی      کاں مور ضعیف را سلیمانا کردی

لینت و مروت:

طبیعت میں لینت و نرمی اور حلم و مروت اس قدر غالب تھی کہ کسی معاملہ میں سختی و درشتی جانتے ہی نہ تھے، حتیٰ کہ گھر کے ملازموں اور بچوں پر بھی سختی نہ کر سکتے تھے، ان کی زبان کبھی کسی درشت کلمہ سے آلودہ نہ ہوتی، ان سے کبھی کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا، اور نہ کسی کی دل شکنی کی، اگر کسی بات پر ان کے شاگردوں کو آزر دگی ہو جاتی تھی تو طرح طرح سے اس کی تلافی کی کوشش کرتے تھے، اس وصف کا یہ نتیجہ تھا کہ جو شخص ان پر حاوی ہو جاتا وہ ان سے جو کام چاہتا لے لیتا تھا، اور بعض اوقات اپنی طبیعت کے خلاف بھی کام کرنے پر مجبور ہو جاتے۔

تحمل اور برداشت کے پہاڑ تھے، دوسروں کی تلخ سے تلخ باتوں کو پی جاتے اور ناگوار سے ناگوار واقعات میں ان کی ابرو پر شکن نہ آتی، اس راہ میں انھوں نے مظلوم بننا گوارہ کر لیا مگر ظالم بننا گوارہ نہ کیا، وہ نسلاً سید تو تھے ہی عملاً بھی سید تھے۔

وہ اپنی سیاسی زندگی میں بھی شرافت اور مروت کے پیکر بن کر ہی کام کرتے رہے، کسی سے سبقت لے جانے کی کوشش کو بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے، چنانچہ ایک مکتوب مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۲۰ء میں ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے سید عبدالحکیم صاحب کو

تحریر فرماتے ہیں:

”میں نے بعد کو مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی دونوں سے الگ کہا کہ مجھے چھوڑ دیجیے، مجھے دوسرے کو دھکا دے کر آگے بڑھنا پسند نہیں لیکن دونوں نے نا منظور کیا۔“

۱۹۲۶ء میں ہندوستان کی طرف سے جو وفد جاز گیا تھا، سید صاحب اس کے صدر، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی اور شعیب قریشی اس کے اراکین تھے، سلطان ابن سعود کی بادشاہت کے بارے میں سید صاحب کی رائے دوسرے اراکین سے مختلف تھی لیکن انھوں نے کھلم کھلا اختلاف کرنے کے بجائے سیاسیات ہی سے کنارہ کشی اختیار کر لی، مولانا محمد علی مرحوم نے اس سلسلہ میں بعض ایسے مضامین لکھے اور بیانات دیئے، جن سے سید صاحب کو اتفاق نہ تھا مولانا محمد علی سے ملاقات ہوئی، سید صاحب نے اثنائے گفتگو میں ان سے کہا آپ چاہے جیسے بھی مضامین لکھیں یا بیانات دیں میں خاموش ہی رہوں گا، مولانا محمد علی کی حاضر جوابی تو مشہور ہے، انھوں نے برجستہ کہا کہ یہ مضامین اور بیانات تو آپ کو خاموش کرنے ہی کے لیے شائع کیے جا رہے ہیں، اس حاضر جوابی سے سید صاحب خود بھی محظوظ ہوئے اور کئی بار اپنی نجی صحبتوں میں اس کو دہرایا، لیکن اختلاف رائے کے باوجود مولانا محمد علی کے بے حد مداح اور بڑے گرویدہ رہے، اور جب ان کے انتقال کی خبر ملی تو دیر تک آبدیدہ رہے اور غایت اضطراب میں ٹہل ٹہل کر سکون پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے، اور معارف میں ان کا بڑا دردا انگیز ماتم کیا، جس کے بعض ٹکڑے یہ ہیں:

”افسوس وہ پُر درد آواز جو ۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۰ء تک اور دنیائے اسلام کے ہر قیامت آفریں سانحہ میں صدائے صور بن کر بلند ہوتی رہے ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی، وہ بے قرار دل جو مسلمانوں کی ہر مصیبت کے وقت بے تاب ہو جاتا تھا اور اوروں کو بے تاب کرتا تھا، دریغا کہ قیامت تک کے لیے ساکن ہو گیا، وہ اشک آلود آنکھیں جو دین و ملت کے ہر ماتم میں آنسوؤں کا دریا بن

جاتی تھیں، حسرتا کہ ان کی روانی ہمیشہ کے لیے بند ہو گئی، وہ مترنم جو ہر بزم میں خوشنوا بلبل بن کر چمکتے تھے، ان کے ترانے اب ہمارے کان نہ سنیں گے، وہ آتشیں زبان جو ہر رزم میں تیغ براں بن کر چمکتی تھی، اس کی تابش اب کسی معرکہ میں ہماری آنکھوں کو نظر نہ آئے گی، وہ پُر جوش سینہ جو ہمارے مصائب کے پہاڑوں کو سیلاب بن کر بہا لے جاتا تھا، اس کا تلاطم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تھم گیا اور وہ پُر زور دست و بازو جو شب و روز کی خدمت گزاری اور نبرد آزمائی میں مصروف تھے، وہ اب ایسے جھکے کہ پھر نہ اٹھیں گے، اور افسوس کہ شکست خوردہ فوج کا وہ آخری سپاہی جو اعداء کے نرغے میں تباہ لڑ رہا تھا، آخر زخموں سے چور ہو کر ایسا گرا کہ پھر کھڑا نہ ہوگا، الوداع والسلام إلى يوم القيامة۔“

پروفیسر محمود شیرانی مرحوم سے برابر علمی چشمک رہی لیکن ان کی وفات پر بھی بہت ملول اور افسردہ ہوئے اور ان پر ایک مستقل مضمون معارف میں شائع کیا اور ان کے اوصاف کا ذکر ان الفاظ میں کیا:

”مرحوم نیک مزاج، کم آمیز، سادگی پسند اور خاموش طبع تھے، ان کی طبیعت میں تلاش، محنت، تحقیق و تدقیق کا مادہ بدرجہ اتم موجود تھا، مرحوم کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کی شاندار روایت کا بڑا اثر تھا، حافظ قرآن تھے، یہ خود ایک بڑی نعمت ہے اور وسیلہ معرفت ہے۔“

وہ کسی کے متعلق بھی بری رائے نہ رکھتے تھے، ان کا قول تھا کہ جب میں کسی سے ملتا ہوں تو اس کو اچھا سمجھتا ہوں اور اس وقت تک اچھا سمجھتا رہتا ہوں جب تک کہ وہ خود اپنے کو برانہ ثابت کر دے، اپنے ایک ندوی عزیز کو ایک مکتوب میں لکھا کہ:

”محبت، اعتماد اور مسامحت میرا دستور العمل ہے، چنانچہ اس وقت تک اس میں کامیابی ہوئی ہے، جس دن یہ بات نہیں رہے گی، میں نہیں رہوں گا۔“

مورخہ ۹ اپریل ۱۹۴۱ء

## اشتعال انگیزی:

البتہ مذہب اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جب کوئی اہل قلم گستاخانہ اور ناروا حملہ کرتا تو ان کے اشتعال اور رنج کی کوئی حد نہ ہوتی، اور اس کے جواب میں ان کی جو تحریر نکلتی وہ بہت ہی زہرناک ہوتی، ایسے مواقع پر فرماتے کہ میرے قلم میں ایسا زہر بھی ہوتا ہے کہ سات سمندر کا پانی بھی اس کے زہریلے اثرات کو دور نہیں کر سکتا۔

## کشادہ دستی:

دارالمصنفین میں ان کی زندگی سو روپے ماہانہ وظیفہ سے شروع ہوئی جو ۳۲ سال کی خدمت کے بعد ۲۵ روپے سے زیادہ نہ بڑھ سکا، آبائی جائیداد سے اخیر عمر میں فائدہ اٹھانے لگے تھے، اس سے ساٹھ ستر من غلہ سالانہ مل جایا کرتا تھا لیکن اس محدود آمدنی میں اللہ تعالیٰ نے اتنی برکت عطا فرمائی تھی کہ بڑی صاف ستھری زندگی بسر کرتے تھے ضرورت کا ہر سامان ان کے پاس موجود تھا، متعلقین کو اچھا کھلاتے اور پہناتے بعض اوقات مصارف کی تنگی تو ضرور محسوس ہوئی لیکن کبھی کسی قسم کی تکلیف اٹھانے کی نوبت نہیں آئی، اعزہ واقرباء کی امداد بھی کرتے رہتے، ان کے ایک عزیز چار سو روپے کے مقروض تھے، قرض دار کا بڑا سخت تقاضہ تھا، انھوں نے اپنی پریشانی کا حال سید صاحب کو لکھا، ان کا خط پڑھ کر بہت متاثر ہوئے اور حسب ذیل جواب دیا:

”آپ کا لفافہ ملا، جس سے آپ کی پریشانیوں کا حال معلوم ہوا، دل مضبوط رکھیے اور خدا پر بھروسہ کیجیے، اس میں امداد کے لیے میں حاضر ہوں، چار سو قرض ہیں، یہ قرض آپ مجھ پر سمجھیں، مجھ سے جہاں تک ہو سکے گا، اس کی صورت نکالوں گا، اگر سو روپے سال وہ لینا منظور کریں تو میں آسانی سے انشاء اللہ دے سکوں گا اور اگر وہ چار سو اسی وقت لینے پر مصر ہیں تو یہ بھی بفضل خدا ہو سکتا ہے، مگر اچھا ہو کہ اکتوبر کی تعطیل تک آپ مہلت لیں، یہ اس لیے کہ ڈاک سے بھیجنے

میں لوگوں کو معلوم ہو جائے گا اور یہ کچھ اچھا نہیں۔“

اور جب یہ قرض ادا ہو گیا تو وہ بے حد مسرور ہوئے، ایک بار ان کے ایک عزیز وطن کے قیام کے زمانہ میں ان سے کچھ قرض لیا اور ایک دوسرے صاحب کو لکھا کہ یہ رقم ان کو ادا کر دی جائے، جب وہ دینے لگے تو فرمایا یہ رقم قرض کے خیال سے دی ہی نہیں گئی تھی، جس کی واپسی کا سوال ہو، اور اس کے لینے سے انکار کر دیا۔

ایک عزیزہ کی لڑکی کی شادی تھی، وہ خرچ کی کمی محسوس کر رہی تھیں، سید صاحب کو معلوم ہوا تو چپکے سے دو سو روپے ان کے پاس بھیجوا دیئے، شادی ہو جانے پر ان عزیزہ نے اپنے بعض اعزہ سے اس رقم کا ذکر کیا، سید صاحب کو معلوم ہوا تو اس سے ان کو بڑی آزر دگی ہوئی۔

قومی چندے پابندی سے ادا کرتے رہے، ایک مکتوب مورخہ ۲ مئی ۱۹۳۰ء میں سید عبدالحکیم صاحب کو تحریر فرماتے ہیں:

”اب میرے سالانہ چندوں کی فہرست سنیے، جو سالانہ ادا ہوتے ہیں اور امسال ہو چکے ہیں، بعد وظائف سالانہ ندوہ سو روپے، مدرسہ سرائے میر دس روپے، مدرسہ اسلامیہ اعظم گڑھ بارہ روپے، انجمن امداد غربا اعظم گڑھ بارہ روپے، رکنیت ندوہ پانچ روپے، رکنیت ایجوکیشنل کانفرنس پانچ روپے، امارت شریعہ دس روپے، انجمن تبلیغ الاسلام امبالہ دس روپے، انجمن تبلیغ صوبہ متحدہ چھ روپے۔“

ان چندوں کے علاوہ وطن کی انجمن الاصلاح کو ۱۲ (بارہ) اور وہاں کی مسجد کو بھی ۱۲ (بارہ) سالانہ مستقل دیتے تھے، اس کے علاوہ عارضی چندے بھی دیتے رہتے تھے۔ دارالمصنفین کی ۳۲ رسال کی خدمت کے بعد جب بھوپال تشریف لے گئے تو ایک ہزار تنخواہ مقرر ہوئی، وہاں تقریباً چار سال رہے لیکن اس زمانہ کی آمدنی کا بڑا حصہ بعض اعزہ کی شادی انجام دینے، متعلقین کی خاص خاص ضروریات پوری کرنے اور اہل و عیال کے ساتھ سفر حج کرنے میں صرف ہوا۔

استغناوے نیازی:

دارالمصنفین کے قیام کے زمانہ میں جب ان کے فضل و کمال کا شہرہ ہوا تو مختلف جگہوں سے بڑی بڑی تنخواہوں کی ملازمتیں ان کے سامنے پیش ہوئیں مگر انھوں نے ہمیشہ ان کے قبول کرنے سے انکار کیا، ۱۹۱۶ء میں ڈاکٹر اقبال نے پنجاب یونیورسٹی میں ایک جگہ پیش کی، اس کو قبول کرنے سے بھی معذوری ظاہر کی، اس پر ڈاکٹر اقبال نے ان کو لکھا کہ:

”مجھے یہ معلوم تھا کہ آپ ملازمت کو قبول نہ کریں گے لیکن سنڈیکیٹ کے بعض ممبروں کی تعمیل ارشاد میں آپ کو لکھنا ضروری تھا، کسی قدر خود غرضی کا شائبہ بھی میرے خط میں تھا اور وہ یہ کہ چاہتا تھا کہ جس طرح پنجاب والوں کو صوبہ متحدہ کے علماء سے بیشتر فائدہ پہنچا ہے اب بھی وہ سلسلہ آپ کے یہاں رہنے سے بدستور جاری رہے۔“

تقسیم ہند کے بعد پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات کی صدر نشینی جس کی تنخواہ ڈیڑھ ہزار ماہ وار تھی پیش ہوئی اس کو بھی قبول نہ کیا اور دوسروں کے لیے سفارش کر دی۔ ایک بار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ دینیات کی پروفیسری قبول کرنے کے لیے اصرار کیا، تو فرمایا کہ پھر دارالمصنفین کو کیا کروں گا، بعض ذمہ دار اشخاص نے تجویز کی کہ یہ ادارہ بھی وہاں منتقل کر دیا جائے، سید صاحب نے جواب دیا کہ ”پھر استاد مرحوم کا مزار کس کے حوالے کروں گا۔“

ایک بار علماء کے ایک اجتماع میں شرکت کے لیے پشاور تشریف لے گئے، نواب زادہ سر عبد القیوم نے تمام علماء کو اپنے یہاں مدعو کیا اور دعوت کے بعد ہر ایک سے علاحدہ علاحدہ ملاقات کی، جب سید صاحب سے مل کر رخصت ہونے لگے تو مصافحہ کرتے وقت سو روپے کا ایک نوٹ ان کے ہاتھ میں دے دیا، مہمان نوازی کا یہ اخلاص سید صاحب کو پسند آیا لیکن مروت میں خاموش رہے اور نوٹ واپس نہ کر سکے، مگر لکھنؤ آ کر یہ رقم دارالعلوم ندوہ

کو دے دی اور اس کی باضابطہ رسید سر عبد القیوم کے پاس بھیجوا دی۔

۱۹۳۵ء میں ذات الحب کے مرض میں مبتلا ہوئے تو کئی مہینے تک علیل رہے، علاج میں آٹھ سو روپے کے مقروض ہو گئے، دارالمصنفین کی طرف سے یہ تجویز پیش ہوئی کہ علاج کے سارے اخراجات ادارہ کی طرف سے ادا کیے جائیں لیکن انھوں نے اس کو گوارا نہ کیا اور خود ہی قرض ادا کیا۔

پاکستان ہجرت کی تو آبائی مکانات، شاندار بنگلہ، باغ، جائداد، گھر کا سارا سامان، حضور نظام کا وظیفہ اور بھوپال کے پرودی ڈنٹ فنڈ کی رقم سب سے منہ موڑ لیا اور مہاجریت کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے، جولائی ۱۹۵۱ء میں اس راقم کو لکھا کہ مہاجریت کی شان بہت بلند ہے، مہاجر صحابہ کی قدر اب معلوم ہوتی ہے۔ نہرو لیاقت پیکٹ سے بہار کے مہاجروں کو بہت کچھ سہولتیں دی گئیں، ان سے فائدہ اٹھانے کے لیے بار بار ان کی خدمت میں گزارش کی گئی لیکن غایت استغناء میں ۱۸ اگست ۱۹۵۲ء کو تحریر فرمایا:

”ہندوستان چھوٹے پر جائداد اور مکان کی محبت دل سے نکل گئی اور بقول شاعر:

بلبل نے آشیانہ چمن سے اٹھالیا اس کی بلا سے بوم رہے یا ہمار ہے

”سلوک کی منزل جو تصوف کی راہ سے شاید برسوں میں طے ہو سکتی ہے، اس

مہاجریت میں دم کی دم میں طے ہو گئی۔“

پاکستان پہنچے تو ادارہ تعلیمات کی صدارت پیش کی گئی، اس عہدہ کی بڑی تنخواہ تھی، یہ ادارہ دستور سازی میں مدد دینے کے لیے قائم کیا گیا، لیکن پورے دو سال تک اس کو یہ کہہ کر قبول کرنے سے انکار کرتے رہے کہ جب تک قوانین مروجہ اسلامی نہ بنائے جائیں تبہ دستور سے کوئی مملکت اسلامی نہیں بن سکتی اور جب ان کو مروجہ قوانین پر نظر ثانی کرنے کی اجازت ملی تو عہدہ قبول فرمایا لیکن اس کی مدت ایک سال سے کچھ ہی زیادہ رہی، اس سے پہلے سو دو سال تک متوکلا نہ زندگی بسر کی، اور معاشی صورت پیدا کرنے کے لیے بقول انہی کے اپنا پیشہ قدیم کتب فروشی اختیار کیا اور اسی لیے مکتبہ الشرق قائم کیا۔

## دارالمصنفین سے لگاؤ:

دارالمصنفین کے لیے انھوں نے جیسی قربانیاں پیش کیں، اس کی مثالیں اس زمانہ میں کم ملیں گی، اگرچہ حالات نے ان کو آخر میں دارالمصنفین سے جدا کر دیا تھا، لیکن اس کے ساتھ ان کی قلبی وابستگی آخر دم تک قائم رہی، اس کی ہر غلش پر بے چین ہو جاتے، اور اس کے ازالہ کی تدبیریں بتاتے اور اس کی فلاح و بہبود کے لیے مفید مشورے دیتے رہتے، وہ ہندوستان میں ہی تھے کہ جون ۱۹۴۷ء میں بھوپال چلے گئے، دارالمصنفین سے ان کا ہٹنا کم اہم واقعہ نہ تھا، مگر بھوپال کے زمانہ قیام میں وہ بدستور دارالمصنفین کے ناظم رہے، وقتاً فوقتاً اس کی دیکھ بھال کے لیے آتے اور ہدایتیں بھیجتے رہتے، جس سے ان کی کمی محسوس نہ ہوتی، لیکن وہاں کے قیام کے دوران میں شاہ معین الدین صاحب ندوی نے دارالمصنفین کے مستقبل کے بارے میں اپنی کسی تشویش کا اظہار کیا تو اس کے جواب میں دسمبر ۱۹۴۸ء میں ارقام فرمایا:

”میں دور ہوں مگر حالات سے قیاس کرتا ہوں کہ دارالمصنفین کا مستقبل خطرہ سے خالی نہیں ہے، معلوم نہیں اس کو کیا پیش آئے، یہ ظاہر ہے کہ اس کی تباہی میری تباہی ہے، اور مجھے اس سے کتنا رنج ہوگا، آپ کا یہ کہنا کہ اگر آپ واپس نہیں آئے تو میرے لیے بھی کہیں فکر کیجیے، مناسب نہیں کیوں کہ دیر بدیر ایک ضعیف العمر کو اس خاک دان فنا کو چھوڑنا ہی ہے اور آپ لوگوں کو بہر حال اس ادارہ کو چلانا ہے، اور یہی عزم ہونا چاہیے۔“

وہ جب کراچی چلے گئے تو وہاں سے اپنے شاگردوں کو تحریر فرمایا کہ ”پہلے دارالمصنفین ایک شخص (مولانا شبلی) کی یادگار تھا اب اس کو دو کی یادگار سمجھ کر زندہ رکھو۔“ پھر علاحدہ علاحدہ خطوط لکھ کر شاگردوں کو تلقین کی کہ ”..... آپ اس کو (یعنی دارالمصنفین) کو اپنی زندگی کا کام بنائیں، ورنہ لاکھوں کا سرمایہ اور عمروں کا حاصل تباہ ہو

جائے گا۔“

اور جب دارالمصنفین کے پرانے نظام میں تبدیلی ہوئی اور جناب شاہ معین الدین صاحب ندوی کو شعبہ علمی کی نظامت سپرد کی گئی تو بڑی مسرت و اطمینان کا اظہار فرمایا، چنانچہ مارچ ۱۹۵۱ء کے ایک مکتوب میں ان کو تحریر فرماتے ہیں کہ:

”دارالمصنفین میں آپ لوگوں نے جو کچھ طے کیا اس پر میں راضی اور درگاہ الہی میں داعی ہوں کہ اس کو دارالمصنفین کے حق میں نافع فرمائے۔“

سپر دم بتو مایہ خویش را

تو دانی حساب کم و بیش را

آپ کے ہونے کو میں اپنا ہی ہونا سمجھتا ہوں اور مجھ کو آپ کی قائم مقامی سے ویسی ہی خوشی اور طمانیت ہے جو کسی روحانی اور جسمانی خلف الصدق کی جانشینی سے ہو سکتی ہے، خدا کا شکر ہے کہ میں نے اپنی زندگی ہی میں اپنی موت کے بعد کا نقشہ دیکھ لیا، اب آپ سے جہاں تک ہو سکے دین و ملت کی خدمت سمجھ کر اس کام کو انجام دیں، اور ساتھ ہی اپنے رفقاء کی تیاری میں مصروف رہیں تاکہ ایک چراغ سے دوسرا چراغ جلتا رہے اور استاد مرحوم کا سلسلہ قائم رہے، الحمد للہ آپ نے معارف اور شذرات کے معیار کو قائم رکھا اور ”س“ اور ”م“ میں شاید ہی کسی کو فرق محسوس ہوتا ہو، واللہ الحمد۔“

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را (۱)



## استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ اور تاریخ ہند

استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے علم و فن میں بڑی بوقلمونی تھی، وہ نہ صرف ایک عالم دین تھے بلکہ سیرت نگار بھی، مفسر بھی، محدث بھی، متکلم بھی، ادیب بھی، شاعر بھی، نقاد بھی اور مورخ بھی تھے، مگر وہ اپنے استاذ علامہ شبلیؒ کے اس قول کو برابر نقل فرماتے رہتے کہ اصلی فن تو تفسیر، حدیث اور علم کلام ہے، ادب و تاریخ تو علمی دسترخوان کی محض چٹنی ہے جو زبان کا ذائقہ بدلنے کے لیے دسترخوان پر ہوتی ہے، اسی طرح ادبی اور تاریخی مضامین محض ذائقہ بدلنے کے لیے لکھے جاتے ہیں، ان کا عمل اسی پر رہا، ان کی عزیز اور بیش قیمت زندگی سیرۃ النبیؐ لکھنے میں صرف ہوئی جس کا شمار اس وقت اسلامی دنیا کی مقبول ترین کتابوں میں ہے، اس شاہکار کو مرتب کرنے میں انھوں نے اس کا اہتمام رکھا کہ اس میں کلام پاک اور حدیث کے علاوہ کسی اور چیز کا حوالہ نہ آئے، چنانچہ انھوں نے اس کتاب کے تقریباً ساڑھے تین ہزار صفحات لکھے ہوں گے لیکن اس کو کلام پاک کی آیتوں اور حدیث کی روایتوں ہی سے مزین کیا ہے، حتیٰ الوسع کسی مصنف اور کسی تصنیف کا سہار نہیں لیا ہے، وہ جب کلام پاک کی آیتوں کی تفسیر بیان فرماتے، یا کسی حدیث کی روایت کرتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ دنیا کی لذیذ ترین نعمتیں ان کے پاس سمٹ کر آگئی ہیں، ان کا محبوب مشغلہ درس قرآن دینا تھا، وہ برابر اس کا درس دیتے رہتے، کبھی ایسی

جگہ ہوتے جہاں درس کا اہتمام نہ ہو سکتا تو کوئی ایک آدمی بھی مل جاتا تو اس کا درس شروع کر دیتے، اس درس کو سنتے وقت احساس ہوتا کہ ان میں علم کی غیر معمولی بصیرت اور بصارت کے ساتھ فکر و نظر کی کتنی بڑی گہرائی، ژرف نگاہی اور باریک بینی بھی ہے، ان کو ڈاکٹر اقبال نے بجا طور پر علوم اسلام کے جوئے شیر کا فرما دیا ہے۔

وہ اپنے اصل موضوع سے ہٹ کر جب کبھی ادب و تاریخ کے کسی پہلو پر قدم اٹھاتے، تو ان کی فکر و نظر کے جلوے اس میں بھی دکھائی دیتے، ان کے ادبی مضامین کا مجموعہ ”نقوش سلیمانی“ ہے، جو بہت مقبول ہوا، ان کی کتاب ”خیام“ ان کی ادبی تحقیقات کا ایک شاہکار ہے، اسی طرح، ”عرب و ہند کے تعلقات“ ان کی تاریخی تحقیقات کا ایک ایسا مایہ ناز سرمایہ ہے جس پر خود فن تحقیق کو ناز ہو سکتا ہے، وہ جب کسی موضوع پر قلم اٹھاتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ وہ اس عالم رنگ و بو سے ہٹ کر کسی اور عالم میں پہنچ گئے ہیں، جہاں ہر طرف صرف تلاش و تجسس، تحقیق و تدقیق اور محنت و ریاضت ہی کی نیرنگیاں کار فرما ہیں اور ان ہی کی بہار آفریں قوس و قزح میں گم ہو کر اپنی تحریر کو قلم بند فرما رہے ہیں، ان کی ہر تصنیف اور ان کا ہر مقالہ اس کی کھلی شہادت ہے، ان کا سنجیدہ اور تحقیقاتی رنگ ان کا اصلی اسلوب بیان ہے جس سے اردو زبان کو بڑا وزن اور وقار حاصل ہوا۔

اگر ان سے پوچھا جاتا کہ کیا تاریخ ان کا محبوب موضوع ہے تو صاف فرماتے ہرگز نہیں، لیکن ارباب نظر ان کو بھی بہت بڑا مورخ سمجھتے رہے، اور جب تک اردو زبان قائم ہے، نہ صرف ان کی مشہور کتاب ”عرب و ہند کے تعلقات“ زندہ جاوید بن کر رہے گی بلکہ ان کے تاریخی مقالات کی اہمیت بھی اپنی نوعیت اور افادیت کے لحاظ سے برابر باقی رہے گی، ان کو مورخانہ فکر و نظر کا جو عطیہ قدرت کی طرف سے ملا تھا اس کی بدولت تاریخ کے علاوہ جو چیز بھی لکھتے اس میں مورخانہ تجسس کے ساتھ مورخانہ تجزیہ کا رنگ خود بخود پیدا ہو جاتا، جس سے ان کی کتابوں اور تحریروں میں ایک امتیازی شان پیدا ہو جاتی، یہی وجہ ہے کہ ان کی کتابیں ہر طبقے میں غور اور شوق سے پڑھی جاتی ہیں اور دارالمصنفین کی

تو وہ اس المال ہیں۔

ان کے تاریخی مقالات میں بھی بڑا تنوع ہے، یہاں پر ہم صرف ان مقالات کا ذکر کریں گے جو ہندوستان کی تاریخ کے کسی پہلو پر وقتاً فوقتاً لکھے گئے، ان میں سے جو بھی مضمون جب لکھا گیا، اس کی حیثیت قطب نما کی ہو گئی تھی، ان کا ایک مضمون ”ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں ہندوؤں کی تعلیمی اور علمی ترقی“ ہے، یہ ۱۹۱۸ء کے معارف میں ایک سال تک مسلسل شائع ہوتا رہا اور بہت شوق سے پڑھا گیا، اس مضمون کی اشاعت کے اکیس سال بعد راقم نے اس کا انگریزی ترجمہ کر کے اسلامک کلچر حیدر آباد دکن بھیجا تو اس رسالہ کے ایڈیٹر نے اس کو بہت پسند کیا اور شکریہ کے ساتھ دو قسطوں (اکتوبر ۱۹۳۸ء و اکتوبر ۱۹۳۹ء) میں شائع کیا، پھر ۴۷ سال کے بعد ۱۹۵۶ء میں اس کا بنگالی ترجمہ مولانا غلام محی الدین ایڈیٹر ”آج“ ڈھاکہ نے کیا، اس موضوع پر اب بہت کچھ تحقیقات ہو چکی ہیں، ڈاکٹر سید عبداللہ اور نیٹل کالج لاہور نے تو ”ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ“ کے نام سے پوری کتاب لکھ کر ڈی لٹ کی ڈگری پائی ہے، انھوں نے اپنی کتاب کے تعارف میں اعتراف کیا ہے کہ:

جب ۱۹۲۸ء میں میرے مخدوم پرنسپل محمد شفیع صاحب اور استاذ محترم پروفیسر محمد اقبال صاحب نے الفرڈ پیٹالہ اسکالر کی حیثیت سے مجھ سے اس مضمون پر کچھ لکھنے کی فرمائش کی، تو میں دینی پرشاد سائل کی کتاب آثار شعرائے ہنود کے سوا کسی ماخذ سے واقف نہ تھا، جب اس سلسلہ میں میں نے جستجو سے کام لیا تو معلوم ہوا مولانا سید سلیمان ندوی صاحب اس موضوع پر ایک طویل سلسلہ مضامین معارف ۱۹۱۸ء میں سپر قلم کر چکے ہیں جنہیں میں نے اپنے لیے ایک مستقل ماخذ کے طور پر استعمال کیا، اس امر کا اعتراف کیا جاتا ہے کہ میں نے ان مضامین سے بے حد مدد لی ہے، جس کے لیے میں جناب سید صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

ان کا ایک مقالہ ”خلافت اور ہندوستان“ اس وقت لکھا گیا، جب ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء میں ہندوستان کے مسلمان بہت ہی پُر آشوب دور سے گزر رہے تھے، پہلی جنگ عظیم کے بعد اسلامی ممالک خصوصاً ترکی پر سخت وقت آیا، اس کے حصے بخرے کیے جا رہے تھے، ترکی کا سلطان قسطنطنیہ میں اتحادیوں کے ہاتھوں بے بس ہو رہا تھا، اتحادی فتح کے غرور اور نشہ میں خدا کی خدائی کی شکست و ریخت میں مصروف تھے، اور ملکوں کی قسمت کا فیصلہ کر رہے تھے، اس وقت ہندوستان کے دردمند مسلمان رہنماؤں نے اپنی جانوں پر کھیل کر ایک خلافت کانفرنس قائم کی، جس میں مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی نے ایسی تنظیمی قوت پیدا کر دی کہ پورا ہندوستان اس کی آواز پر اٹھتا بیٹھتا تھا، اس تحریک میں سید صاحب بھی پیش پیش ہو کر ترکی کی حمایت میں زبان و قلم اور دعوت و اشاعت سے لڑتے رہے، وہ مولانا شوکت علی اور محمد علی کے ساتھ ایک وفد میں لندن بھی گئے اور وہاں خلافت و جزیرۃ العرب کے مسائل اور ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات اور ان کے مذہبی مطالبات کی وضاحت کی۔

پروفیسر مارگولیتھ اور ایک اطالوی مستشرق سے مسئلہ خلافت پر علمی نبرد آزما کی بھی ہوئی، اور اس مسئلہ پر مشہور انگریزی مجلہ ”فاران فیروز“ میں ایک مدلل اور جامع مضمون لکھا، جس کی تعریف مولانا محمد علی نے بار بار کی، وہاں سے واپسی کے بعد ”خلافت عثمانیہ اور دنیائے اسلام“ اور ”خلافت اور ہندوستان“ کے عنوان سے دو اہم مضامین معارف کے کئی نمبروں میں لکھے، جن کو مختلف ناشرین نے علاحدہ علاحدہ رسالوں کی صورت میں بھی شائع کیا، ان سے تحریک خلافت کو بڑی مدد ملی، ہندوستان اور خلافت جس دقت نظر سے لکھا گیا ہے اور اس میں جو تاریخی معلومات ہیں ان سے ناظرین اب بھی مستفید ہو سکتے ہیں ڈاکٹر محمد اقبال کو بھی یہ مضامین پسند آئے تھے، وہ سید صاحب کو لکھتے ہیں:

”خلافت پر جو مضامین آپ نے لکھے، نہایت قابل قدر ہیں، ان سب کو علاحدہ رسالے کی صورت میں شائع ہونا چاہیے۔“ (اقبال نامہ ۱۳۰ مورخہ ۱۲/۱۱/۱۹۲۳ء)

ان کا مضمون ”ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیوں کر ہوئی“ معارف کی کئی قسطوں میں شائع ہوا عیسائیوں اور غیر مسلموں کے اس پروپیگنڈے سے کہ ہندوستان میں اسلام تلوار کے زور سے پھیلا خود مسلمان متاثر ہو چکے تھے لیکن جب حضرت سید صاحب کا یہ مضمون معارف میں شائع ہوا تو مسلمانوں کو ایسا محسوس ہوا کہ ان کی جھکی ہوئی گردنیں یکا یک خوشی بلکہ فخر سے اٹھ گئی ہیں، کیوں کہ اسی مضمون کے ذریعہ سے ان کو معلوم ہوا کہ ہندوستان میں اسلام سلاطین کی تلواروں سے نہیں پھیلا، بلکہ اس کی ترقی ان ہی طریقوں سے ہوئی، جس سے دنیا میں ہر داعی مذہب کی ہوئی ہے، ہوتی ہے اور ہوگی، اس مضمون میں جو کچھ تاریخی صداقتیں پیش کی گئی ہیں ان سے وہ تمام غلط فہمیاں دور ہو گئیں جو معاند مورخوں اور عیسائی مبلغوں نے پھیلا رکھی تھیں، خواجہ حسن نظامی مرحوم نے تو اس مضمون کو رسالہ کی صورت میں شائع کر کے بڑی کثرت سے تقسیم کرایا، جو ہر جگہ شوق سے پڑھا گیا۔

ان کے مقالہ ”لاہور کا ایک فلکی آلات ساز“ میں ہندوستان کے اصطربلاب اور ان کے صنایعوں کی جو تفصیلات پیش کی گئی ہیں، ان سے حضرت سید صاحب کے ذوق کے تنوع کا اندازہ ہوگا، ان کو علم ہیئت سے بھی کچھ دلچسپی تھی، مارچ و جون ۱۹۰۹ء کے رسالہ الندوہ لکھنؤ میں ”اسلامی رصد خانے“ کے عنوان سے جو مضمون نکلا وہ آج بھی اپنی مفید معلوم کی وجہ سے لائق مطالعہ ہے، اسی دلچسپی کی وجہ سے حضرت سید صاحب نے ”لاہور کا ایک فلکی آلات ساز“ میں عہد مغلیہ میں جو اصطربلاب بنائے گئے، ان سے متعلق پر مغز اور دل چسپ معلومات فراہم کی ہیں، اس مضمون سے جرمنی کے ڈاکٹر خان کلیو بر نے بڑی دل چسپی لی اور جب راقم کا کیا ہوا اس کا انگریزی ترجمہ اکتوبر ۱۹۳۵ء کے اسلامک کلچر حیدرآباد دکن میں شائع ہوا تو شکاگو یونیورسٹی کے ایک لائق فاضل نابیا ابابٹ نے اس کو غور سے پڑھا اور جنوری ۱۹۳۷ء کے اسلامک کلچر میں اس پر ایک استدراک لکھا۔

ان کا ایک بہت ہی اہم مقالہ ”تاج محل اور لال قلعہ کے معمار“ ہے جو ۱۹۳۳ء میں لاہور میں ادارہ معارف اسلامیہ کے پہلے اجلاس میں ڈاکٹر اقبال کی صدارت میں

پڑھا گیا، اس میں پہلی دفعہ پوری تحقیق و سند کے ساتھ یہ بتایا گیا کہ تاج محل اور لال قلعہ کا معمار نادر العصر (استاد احمد لاہوری المتوفی ۱۰۵۹ھ) تھا، تاج محل کی تعمیر ۱۹۵۱ھ میں ہوئی، یعنی استاد احمد کی وفات سے نو برس پہلے ختم ہو چکی تھی اور دہلی کا لال قلعہ ۱۰۴۸ھ سے شروع ہو کر احمد کی وفات سے ایک سال پہلے ۱۰۵۸ھ میں تکمیل پایا، لال قلعہ کی تعمیر میں استاد احمد کا بھائی استاد حامد اور اس کا لڑکا لطف اللہ مہندس بھی شریک رہا، اس مضمون میں استاد احمد کے لڑکوں کا بھی ذکر ہے، جو تعمیر، ہندسہ اور ریاضیات میں ماہر تھے، انگریز مورخوں نے یہ غلط فہمی پھیلا رکھی تھی کہ تاج محل کو ایک اطالوی معمار نے تیار کیا لیکن اس مقالہ کے بعد یہ غلط فہمی جاتی رہی، ۱۹۵۱ء دہلی کے ایک مشہور اخبار اسٹیمس مین کے کچھ انگریز کالم نویسوں نے پھر بحث چھیڑ دی کہ تاج محل کے معمار ہندوستان کے نہیں، بلکہ یورپ کے تھے، راقم نے حضرت سید صاحب کے اس محققانہ مضمون کا حوالہ دے کر انگریز کالم نویسوں کی رائے کی تردید کی تو حکومت ہند کے آثار قدیمہ کے ڈائریکٹر نے بھی تائید کی کہ تاج محل کا معمار ہندوستانی مہندس نادر العصر استاد احمد لاہوری تھا، راقم نے اس مضمون کے بھی انگریزی میں ترجمہ کرنے کی عزت حاصل کی، جو جرنل آف دی بہار ریسرچ سوسائٹی جلد ۳۴ حصہ اول و دوم ۱۹۴۸ء میں چھپا، گو اس کے ایڈیٹر نے فارسی ٹائپ کے نہ ہونے کی وجہ سے اس کی فارسی عبارتوں کو حذف کر دیا، جس سے اصل کی شان باقی نہیں رہی، اردو کا یہ مضمون تمام مورخوں کے لیے قیمتی ماخذ بن گیا ہے۔

ان کے مقالہ ”قنوج“ میں یہ دکھایا گیا ہے کہ عرب جغرافیہ نویس اور سیاح سندھ میں جس قنوج کا ذکر کرتے ہیں، وہ کوئی علاحدہ قنوج نہ تھا بلکہ وہی قنوج ہے جو موجودہ فرخ آباد کے ضلع میں واقع ہے اور جو کسی زمانہ میں ہندوستان کی سب سے بڑی راجدھانی تھی، عربوں نے سندھ کی سمت میں جس قنوج کا ذکر کیا ہے اس سے مقصود سلطنت قنوج کا آخری سرحدی مقام تھا، اس کو ثابت کرنے کے لیے حضرت سید صاحب نے جس غیر معمولی تلاش و تفتیش کا ثبوت دیا ہے وہ مقالہ کے مطالعہ سے اندازہ ہوگا، یہ ادارہ معارف

اسلامیہ کے تیسرے اجلاس دہلی میں پڑھنے کے لیے لکھا گیا تھا، لیکن حضرت سید صاحب اس میں شرکت نہ کر سکے اس لیے وہاں پڑھانہ گیا، تو معارف میں شائع کر دیا گیا، اس کا انگریزی ترجمہ جناب سید ابو عاصم ایم۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی۔ نے کیا جو اکتوبر ۱۹۴۳ء کے اسلامک کلچر حیدرآباد میں شائع ہوا۔

ان کے مقالہ ”ہندی الاصل اور ہندوی النسل مسلمان سلاطین“ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن کے ایک توسیعی لکچر کے لیے لکھا گیا تھا لیکن وہاں پڑھانہ جاسکا، یہ کراچی میں انجمن ترقی اردو کے ایک جلسہ میں ڈاکٹر محمد حسین کی صدارت میں پڑھا گیا، جو اس وقت حکومت پاکستان کے وزیر تھے، اس میں دہلی، سندھ، ملتان، کشمیر، گجرات اور دکن کے ایسے سلاطین کا ذکر ہے، جو یا تو ایک طرف سے بیرونی اور دوسری طرف سے ہندی ہیں، یا جو باپ اور ماں دونوں طرف سے ہندی ہیں، اس مقالہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہندوستان کے ایسے فرماں رواؤں نے دوسرے بادشاہوں کے مقابلہ میں ہندوستان کی کسی طرح کم خدمت نہیں کی، اس کی تفصیلات ناظرین کے لیے دلچسپ بھی ہیں، اور پر از معلومات بھی۔

حضرت سید صاحب کا معمول تھا کہ جب کہیں جاتے تو وہاں کے قابل ذکر تاریخی مقامات اور کتب خانے کی سیر ضرور کرتے اور وہاں جو ہری بن کراچی جو ہر شناسی کا ثبوت دیتے۔

۱۹۱۸ء میں سرنگا پٹم تشریف لے گئے تو ان کے قلم سے ”سلطان ٹیپو کی چند باتیں“ کے عنوان سے کچھ سطریں نکل پڑیں، جن میں ان کے کچھ چشم دید مشاہدات اور کچھ تاریخی حقائق ہیں، اسی طرح ۱۹۳۵ء میں بہار کے مشہور تاریخی مقام نالندہ (ضلع پٹنہ) کی سیر کی تو اپنے مضمون ”نالندہ کی سیر“ میں اس کی تاریخ کے ساتھ بودھ زمانہ کے تمام آثار، مثلاً اس کی آٹھ خانقاہوں، سگی مندر، رصد خانہ، اور عجائب خانہ سے متعلق مفید معلومات فراہم کیں، اور اسی مختصر مضمون میں یہ بتایا ہے کہ عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ نالندہ کی خانقاہ مسلمانوں کے زمانے میں مسلمانوں کے ہاتھوں تباہ ہوئی لیکن یہ صحیح نہیں ہے، کیوں کہ کھدائی سے جو

عمارتیں نکلی ہیں، وہ برباد کی ہوئی نہیں ہیں، البتہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ محمد بختیار خلجی کے حملہ بہار کے وقت نالندہ کی حالت ایسی منتشر اور پراگندہ ہوئی کہ پھر اس کا شیرازہ نہ بندھ سکا۔

حضرت سید صاحب نے جب جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے کتب خانہ کی سیر کی تو ان کی جو ہر شناس نگاہیں کچھ ایسی کتابوں پر پڑیں، جن سے انھوں نے قیمتی تاریخی معلومات حاصل کیں، جیسا کہ ان دو چھوٹے مضامین ”ہندو کش عالمگیر کے عہد کی دو عجیب کتابیں“ اور ”سند معانی جزئیہ“ سے ظاہر ہوگا۔

ہندوستان کی عمومی تاریخ کی تدوین و ترتیب کے متعلق حضرت سید صاحب کا خاص نقطہ نظر ان کے اس خطبہ صدارت سے ظاہر ہوگا، جو انھوں نے دسمبر ۱۹۴۴ء میں آل انڈیا ہسٹری کانگریس کے شعبہ تاریخ ہند از منہ وسطی (۱۲۰۶ء تا ۱۵۲۶ء) میں دیا، اس میں حضرت سید صاحب نے بڑے دکھ کے ساتھ فرمایا ہے، کہ پائلکس کے کھیل سے اس ملک کا علم تاریخ بھی بچا ہوا نہیں، انگریزوں نے مسلمانوں کی تاریخ الٹ پلٹ کر کچھ ایسی سمجھائی اور پڑھائی کہ جودل ان سے ٹوٹے وہ اب تک نہ جڑ سکے، اور پھر اسی دکھ اور درد کے ساتھ فرمایا کہ اب گو نہ وہ فاتح رہے اور نہ وہ مفتوح، مگر زمانہ کے تپاؤں سے ان کے زمانہ کے پیدا شدہ جذبات کے سوکھ جانے والے درخت کو پانی دے دے کر ہر ایک جاتا رہا ہے، اسی لئے اس کانگریس کے مورخوں کو مخاطب کر کے فرمایا:

”مجھے یہ کہنا تھا کہ تاریخ کے فن کو قوموں کے پھوٹ اور میل میں بہت کچھ دخل ہے اور لیے وہ لوگ جن کی نظر میں اس ملک کا مستقبل ہے، اور جن کے ہاتھوں میں اس کے مستقبل کا بنانا یا گڑنا ہے ان کو اپنی ذمہ داری کو سمجھنا چاہئے اور اس حالت میں جب کہ ہم سب کو معلوم ہے کہ ہم کو اب اسی ملک میں جینا اور مرنا ہے، تو عداوت اور نفرت کی کچھلی باتوں کو اس طرح دہراتے رہنا، جس سے یہ جذبہ اس طرح پلتا اور پھلتا اور پھولتا رہے، اپنے ملک کے ساتھ بڑی بے وفائی ہے۔

ہندوستان کی جو تاریخ لکھی جائے اس کا مقصد ہندوستان کے متفرق اجزاء کو

باہم جوڑنا ہو، توڑنا نہ ہو، حال کو ماضی کی ناگواری کی تلخی کو بڑھا کر کیوں برباد کیا جائے، اور کیوں مستقبل کے لئے یہ کوشش جاری رہے کہ وہ کبھی خوش آئند نہ ہو سکے۔“

حضرت سید صاحب کے حکم سے راقم نے اس خطبہ کا انگریزی ترجمہ کیا، جو اجلاس میں پڑھا گیا، پھر اس کا نگریس کی روداد میں شامل کیا گیا، یہ خطبہ اسی زمانہ میں مدارس کے اخبارات ہندو اور دکن ٹائمز، پھر کلکتہ کے اسٹار آف انڈیا اور مارنگ نیوز میں بھی شائع ہوا، دارالمصنفین میں ہندوستان کی تدوین و ترتیب کا جو سلسلہ جاری ہے، اس کے لیے یہ مشعل راہ بنا ہوا ہے۔

اس خطبہ کے دینے سے پہلے بھی حضرت سید صاحب کو برابر اس کا دکھ رہا کہ اسکولوں، کالجوں میں تاریخ ہند کی تعلیم سے فوائد کے بجائے نقصانات پہنچ رہے ہیں، اگست ۱۹۳۲ء کے معارف کے شذرات میں تحریر فرمایا:

”سرکاری مدارس میں تاریخ ہند کی تعلیم کا اضافہ بظاہر علم کے ضافہ کے لیے ہے مگر درحقیقت یہ اقوام ہند کے قدیم اختلافات و نزاعات کے اضافہ کرنے کے لیے کیا گیا ہے، حالاں کہ ہندوستان کو آگے چلنا ہے تو پیچھے مڑ کر دیکھنا نہیں چاہیے، آج اس بحث سے کہ سلطان محمود کا حملہ ہندوستان پر جائز تھا یا ناجائز اور شہاب الدین غوری نے کتنے مندر غارت کیے، اور عالمگیر نے ہندوؤں پر کیا کیا ظلم کیے، سوراج کی منزل میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتا، کیا ہمارے ہم وطن اس نکتہ کو سمجھنے کی کوشش کریں گے؟“

اسی شذرات میں یہ بھی فرمایا:

”ہماری یونیورسٹیوں کی تاریخ ہند کی کتابوں میں ڈھونڈ کر ایسی ہی باتیں جمع کی جاتی ہیں، جن سے ان دونوں قوموں (مراد ہندو مسلمان) کے جذبات میں مزید اشتعال پیدا ہو، اور اس کا اتفاق آئندہ مشکل سے بڑھ کر محال ہو جائے،

حالاں کہ اس ملک کی تاریخ میں ایسے واقعات کی بھی کمی نہیں، جن کے پڑھنے سے ان دونوں قوموں کے درمیان اختلاف و محبت کے جذبات پیدا ہوں، مگر بازاری قدر دانی کے تابع مصنف اور کتب فروش اپنی ذاتی عارضی کامیابی کے مقابلہ ملکی اور قومی بھلائی کی قیمت کی پروا نہیں کرتے۔“

معارف کے ان شذرات کو پڑھ کر پونہ سے حضرت سید صاحب کے ایک دوست پروفیسر شیخ عبدالقادر نے ان کو لکھا کہ ان تلخیوں کو دور کرنے کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمانان ہند کی صحیح اور اصلی تاریخ کا حلقہ معاصرین اور متاخرین کے لیے درست کریں، مئے کہن سے نئی بوتلیں بھریں، شراب طہور کو جدید کاسوں (مِزَاجُہَا کَافُورًا) میں انڈیلیں (۱)۔

حضرت سید صاحب نے اس کے جواب میں معارف کی اسی اشاعت میں تحریر فرمایا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کی ایک محقق تاریخ لکھنا آج مسلمانوں کا سب سے بڑا فرض ہے، دارالمصنفین اس کے لیے اپنے مقدور بھر سب کچھ کرنے کو تیار ہے لیکن ضرورت ہے کہ دوسرے دردمند اہل علم ہمارے کاموں میں حصہ لیں اور اپنی سعی و تحقیق سے ممنون فرمائیں، اور پھر ایک بزم تاریخ ہند کی تشکیل کی اور اس میں شرکت کرنے کے لیے پروفیسر شیخ عبدالقادر پونہ، پروفیسر محمد حبیب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، پروفیسر ہارون خاں شیروانی حیدر آباد دکن، پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی اسماعیل کالج بمبئی، مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی مؤلف تاریخ گجرات، احمد آباد، ڈاکٹر محمد ناظم محکمہ آثار قدیمہ دکن، پروفیسر سید عبدالقادر اسلامیہ کالج لاہور، حکیم سید شمس اللہ قاری حیدر آباد دکن، مولوی سید ہاشمی فرید آبادی، مولوی سید مقبول احمد صاحب صدانی مؤلف حیات جلیل، مولوی اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی مؤلف آئینہ حقیقت، علامہ عبداللہ علی یوسف، ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ لاہوری سے اپیل کی۔

یہ اپیل بڑی گرم جوشی کے ساتھ سنی گئی اور مختلف سمتوں سے خطوط آئے کہ یہ کام ضرور شروع کیا جائے لیکن اس کے شروع کرنے میں جو دقتیں تھیں ان کی طرف حضرت سید صاحب نے دسمبر ۱۹۳۴ء کے معارف میں تو یہ لکھ کر توجہ دلائی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور سلاطین اسلام کی بادشاہی و حکومت اور مسلمانوں نے اس ملک کو جو ترقی دی اور یہاں جو تمدن پیدا کیا، ان سب کی ایک مفصل اور مکمل تاریخ کی ضرورت، تاریخی، علمی، قومی، سیاسی، ہر حیثیت سے روز بروز بڑھتی جاتی ہے، لیکن یہ کام اس قدر اہم ہے کہ اس کو صرف شخصی ہمت سے انجام دینا مشکل ہے، ارباب نظر کی نگاہیں اس کے لیے برابر دارالمصنفین پر پڑ رہی ہیں، دارالمصنفین نے اب تک اس خدمت کے انجام دینے سے اس لیے پہلو تہی کی کہ اس کے لیے گراں قدر مصارف کی ضرورت ہے، جس کے لیے دارالمصنفین کا موجودہ سرمایہ کافی نہیں، حضرت سید صاحب نے اس کام کے سلسلہ میں بتایا کہ تاریخ ہند کے غیر مطبوعہ قلمی نسخے حاصل کئے جائیں، تاریخ ہند پر انگریزی میں جتنی کتابیں لکھی جا چکی ہیں وہ خریدی جائیں، جن قلمی نسخوں کا حاصل کرنا ممکن نہ ہو، ان کے مطالعہ کے لیے مصنفین سفر کریں، پھر کتاب کی ترتیب و تدوین کے لیے لائق اشخاص کی خدمات مناسب معاوضہ پر حاصل کی جائیں۔

ان کا خیال تھا کہ تاریخ ہند کی تدوین پندرہ حصوں میں کی جائے، جن میں عربوں، غزنویوں، غوریوں، خلجیوں، لودیوں، مغلوں کے علاوہ دکن، گجرات، مالوہ، خاندیس، کشمیر، ملتان، جوینپور، بنگال، حیدرآباد، مرشدآباد، عظیم آباد، اودھ، روہیل کھنڈ، میسور اور اراکٹ وغیرہ کے مسلمان فرماواؤں کی تاریخ قلم بند کی جائے، لیکن انھوں نے زیادہ تر علمی، ثقافتی اور تمدنی تاریخ لکھے جانے پر زور دیا۔

۱۹۳۴ء کی ارزانی کے زمانہ میں حضرت سید صاحب کا خیال تھا کہ یہ کام سترہ ہزار میں پورا ہو جائے گا، اس اپیل پر نواب صدربار جنگ مولانا حبیب الرحمان خاں شیروانی نے ایک سال تک پچاس روپے ماہ وار دینے کا وعدہ فرمایا اور خان بہادر مولوی محمد

حسین خاں صاحب سابق ڈپٹی اکاؤنٹنٹ آف انڈیا و سابق فنانس منسٹر رام پور نے پانچ سو ایک مشمت عطا کیا، اسی قلیل رقم سے حضرت سید صاحب نے کام شروع کر دیا، اور جن اصحاب سے حضرت سید صاحب نے قلمی اعانت کی اپیل کی تھی، انھوں نے خاموشی اختیار کر لی، تو مولانا ابو ظفر صاحب ندوی کو احمد آباد سے دارالمصنفین بلایا گیا کہ یہ کام جاری ہو جائے اور مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم کو ہندوستان کی تمدنی تاریخ لکھنے کو کہا گیا۔

راقم اس زمانہ یعنی ۱۹۳۴ء میں علی گڑھ سے تعلیم سے فارغ ہو کر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں پروفیسر محمد مجیب کی نگرانی میں تاریخ ہند پر کچھ کام کرنے چلا گیا تھا، ۱۲ دسمبر ۱۹۳۴ء میں حضرت سید صاحب نے ایک مکتوب میں کچھ اور باتوں کے علاوہ یہ تحریر فرمایا:

”دارالمصنفین میں تاریخ کا کام شروع کر دیا گیا ہے، تم کو تاریخ ہند سے دلچسپی رہی ہے، اور یہ ذوق تم نے اپنے والد مرحوم سے وراثت میں پایا ہے، ان سے مجھ کو بڑا لگاؤ تھا، ان کی جوانی کی موت بھلائی نہیں جاتی اس لگاؤ کی بنا پر تمہاری طرف میری نظر برابر اٹھتی رہی، دارالمصنفین پیسے کمانے کی جگہ نہیں، اس لیے یہاں تم کو بلانے میں تامل رہا، کیوں کہ اور نو جوانوں کی طرح تم کو بھی اچھی ملازمت حاصل کرنے کا حوصلہ ہوگا، لیکن تم پسند کرو تو یہاں آ جاؤ، اور تاریخ ہندو کے کاموں میں حصہ لو، ابھی بلا شرط آؤ، میری طرف سے کوئی شرط نہیں، تم یہاں آ کر کچھ دنوں رہو، یہاں کے کاموں میں تمہارا جی لگے، اور تم یہاں رہنے پر رضا مند ہو جاؤ تو دارالمصنفین اپنی بساط کے مطابق تمہاری کچھ مالی خدمت بھی کر دے گا، لیکن جو زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکتا ہے اس کا اندازہ تم کو پہلے سے ہے“ (۱)۔

اس مکتوب نے میری زندگی کا رخ بدل دیا، حضرت سید صاحب کا شاگرد بننے کی

(۱) حضرت سید صاحب نے اس خط میں ہر جگہ آپ لکھا تھا لیکن راقم نے اس کو تمنا بنا دیا ہے۔

بڑی آرزو تھی، یہ آرزو پوری ہوتی نظر آئی، اس لیے جنوری ۱۹۳۵ء میں جامعہ ملیہ دہلی سے دارالمصنفین چلا آیا، اس سے پہلے بھی یہاں کئی بار آچکا تھا لیکن اس مرتبہ اس کی سرزمین جنت ارضی اور اس کی ہر چیز زندگی سے معمور نظر آئی، شاید اس لیے کہ یہاں پوری زندگی گزارنی تھی، حضرت سید صاحب بھی میرے آجانے سے خوش تھے۔

دوسرے دن ان کی میز کے قریب جا کر بیٹھا تو انھوں نے تاریخ ہند کی اسکیم بتا کر فرمایا کہ تم ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے فوجی نظام پر مواد جمع کرو، عرض کیا کہ یہ میرے لیے دشوار اور خشک موضوع ہے، فرمایا کہ دشوار گزار راہیں طے کرنے کے بعد ہی تحقیق کے رموز سے واقف ہو سکو گے، حکم تھا اس لیے تعمیل میں لگ گیا لیکن میرے کام کی رفتار بہت سست رہی اور سچ تو یہ ہے کہ چار پانچ سال تک حضرت سید صاحب کی نگرانی میں قلم پکڑنا سیکھتا رہا اور جب کچھ کام کرنا سیکھا تو ۱۹۴۱ء میں یکا یک صحت خراب ہو گئی، اور کئی سال تک پریشان رہا، میری علالت کی داستان دکھ بھری ہے، اور یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ حضرت سید صاحب کی دعاؤں کی بدولت صحت ہو گئی، انھوں نے بہت سی دعائیں ورد کرنے کے لیے لکھ بھیجیں اور ایک بار یہ بھی تحریر فرما کر دل بڑھایا کہ:

”تم ہر وقت یاد آتے ہو، تم کو اللہ تبارک تعالیٰ دارالمصنفین ضرور واپس بھیجے گا،

ابھی تم سے بہت کچھ کام لینا ہے، میں تمہارے لیے برابر دعائیں کرتا رہتا ہوں

”عَجَلَ اللَّهُ شِفَاءَکُمْ“، ہاں بھائی مولانا (یعنی اشرف علی تھانویؒ) نے بھی

تمہارے لیے دعا کی ہے، یہ بھی پوچھا کہ کیا بیمار ہیں، پھر دعا فرمائی، مولانا

عبدالماجد نے تمہارے لیے تعویذ بھیجا ہے جو بھیج رہا ہوں.....“۔

اسی خط میں لکھا ہے کہ:

”تم جب سے گئے ہو تاریخ ہند کا کام بالکل رکا ہوا ہے، تم آؤ تو پھر یہ کام

شروع ہو“۔

حضرت سید صاحب کے اس قسم کے شفقت آمیز خطوط دوا اور علاج سے زیادہ

موثر ثابت ہوئے، تاریخ ہند کا کام رک جانے کی وجہ یہ ہوئی کہ مولانا ابوظفر ندوی مرحوم تاریخ سندھ اور پھر غزنویوں اور غوریوں پر ایک جلد لکھ کر احمد آباد چلے گئے مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم نے ہندوستان کی تمدنی تاریخ پر کچھ ابواب بہت اچھے لکھے تھے، لیکن پھر ان کا اشہب قلم دوسرے میدان کی طرف چل نکلا تو اس طرف متوجہ نہیں ہوئے، ملک کے جن اصحاب قلم سے اس اسکیم میں شرکت کرنے کی امید تھی انھوں نے پہلو تہی کی، صرف دارالمصنفین کے اندر ہی یہ کام محدود ہو گیا، اور رفقاء دوسرے کاموں میں لگے ہوئے تھے، اس لیے یہ راقم ہی تاریخ ہند پر کچھ خامہ فرسائی کرتا رہا۔

۱۹۴۴ء تک آتے آتے اپنی صحت کی خرابی کے باوجود ہندوستان کے ”عہد وسطیٰ کا فوجی نظام“ پر کام کسی طرح ختم کیا، حضرت سید صاحب نے اگست ۱۹۴۴ء کے معارف کے شذرات میں یہ لکھ کر میری ہمت افزائی کی کہ:

”دارالمصنفین کی مجوزہ تاریخ ہند کے متعدد حصے تکمیل پا چکے ہیں، اس سلسلہ

تاریخ کا اہم مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے ان تمدنی صنعتی، علمی اور فنی کارناموں

کو دکھایا جائے جن سے یہ معلوم ہو کہ ہندوستان کی تعمیر میں ان کی کوششوں کو

کہاں تک دخل ہے، اس ضمن میں ایک پوری جلد ہندوستان میں مسلمانوں کی

فوجی عسکری تنظیم پر ہے جس کو ہمارے رفیق سید صباح الدین عبدالرحمن ام۔

اے نے کئی سال کی تلاش و محنت میں ترتیب دیا ہے، یہ کتاب ابھی ان کے قلم

سے پوری ہو کر ختم ہوئی ہے“۔

یہ کتاب ۱۹۴۴ء میں ختم ہونے کو تو ہو گئی تھی، پھر بھی اس کے بعض ابواب میں اضافہ کی ضرورت تھی، اس لیے اس کی طباعت و اشاعت میں عجلت نہیں کی، اسی اثنا میں میری پہلی اہلیہ کی اچانک وفات، گھر کے بزرگوں اور سرپرستوں کی المناک موت سے میری صحت اور بھی زیادہ بگڑ گئی اور دنیا میرے لیے تنگ اور تاریک ہو گئی، تاریخ ہند کا کام بھی بالکل رک گیا، دارالمصنفین ۱۹۴۷ء تک اس سلسلہ میں مولانا ابوظفر ندوی صاحب

مرحوم کی صرف ایک کتاب تاریخِ سندھ شائع کر سکا، جو بہت پسند کی گئی، مولانا ابوظفر ندوی صاحب نے غزنویوں اور غوریوں کی جلد کی طباعت رکوادی، کہ اس میں وہ مزید اضافہ کرنا چاہتے تھے۔

علاج کے مختلف مراحل طے کر کے ۱۹۴۷ء کے اگست میں دارالمصنفین لوٹا تو حضرت سید صاحب اس وقت بھوپال میں تشریف فرما تھے، انھوں نے ایک مکتوب میں مورخہ ۲۸/رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ میں تحریر فرمایا:

”میں بہت خوشی سے تمہارا احاطہ دارالمصنفین میں خیر مقدم کرتا ہوں، میرے ساتھ دارالمصنفین کے تمہارے احباب بھی بے چینی سے تمہارے منتظر تھے، بے شبہ تمہارے علاج میں بہت روپیہ خرچ ہوا، لیکن:

قیمتِ خود ہر دو عالم گفتم

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

”اللہ تعالیٰ تم کو صحت و عافیت کے ساتھ تادیر دارالمصنفین کی خدمت کا موقع دے، اب تم سے اور برادر شاہ معین الدین ہی سے ساری امیدیں وابستہ ہیں، تم لوگوں کو دارالمصنفین کے چراغ کو ہر طرح روشن رکھنا ہے اور ہاں بھائی، اب پورے عزائم کے ساتھ ساتھ تاریخِ ہند کے سلسلہ کو بھی جاری رکھو، اللہ تبارک تعالیٰ پورا فرمائیں، آمین۔“

اس محبت نامہ نے حوصلہ بڑھایا، اور تاریخِ ہند کے کاموں میں منہمک ہو گیا، حضرت سید صاحب کے حکم سے ۱۹۴۸ء میں راقم کی کتاب بزمِ تیموریہ اور ۱۹۴۹ء میں بزمِ صوفیہ شائع ہوئیں، ان میں حضرت سید صاحب کو بزمِ صوفیہ زیادہ پسند تھی، اور یہی پسندیدگی میری محنت کا اصلی صلہ تھا، انھوں نے اس پر ایک مقدمہ بھی لکھنے کی خوش خبری دی تھی لیکن وہ حج کے لیے تشریف لے گئے اور وہاں سے آکر بمبئی میں علیل ہو گئے تو ان ہی کے حکم سے اس کی اشاعت میں تاخیر نہ کی گئی، اور شائع کر دی گئی، بزمِ تیموریہ میں حضرت

سید صاحب کا ایک دیباچہ بھی ہے لیکن اس کی اشاعت کے بعد ایک گرامی نامہ مورخہ ۳۰/ستمبر ۱۹۴۸ء میں تحریر فرمایا:

”خوشی ہوئی کہ تمہاری کامیاب تصنیف بزمِ تیموریہ اہل ذوق کو پسند آرہی ہے، مجھ کو پہلے بزمِ تیموریہ پسند نہیں تھی، کیوں کہ ان کو عیش و تنعم کا دلدادہ، شراب و کباب کا متوالا، حسن و عشق کا پرستار، نقش و تصویر اور سرود و ساز کا دم ساز ہی سمجھتا رہا لیکن جو تصویر تم نے کھینچی ہے وہ نہایت عمدہ ہے، اور مصور کے کمالات تشریف کے مستحق ہیں۔“

اور جب بزمِ صوفیہ چھپ کر ان کے پاس پہنچی تو انھوں نے یہ تحریر فرما کر محض اپنی شفقت و محبت کا اظہار کیا:

”تمہاری یہ کتاب انشاء اللہ مفید ثابت ہوگی کیوں کہ اس کا انداز اصلاحی ہے اور بابرکت بھی ہے، مصنف کے لیے باعثِ خیر اور موجبِ اجر ہوگی، انشاء اللہ تعالیٰ۔“

تاریخِ ہند کے سلسلہ کی تکمیل کے لیے جس سرمایہ کی ضرورت تھی وہ اب تک کہیں سے نہیں ملا، اور نہ کسی گوشہ سے قلمی اعانت حاصل ہوئی، ۱۹۴۹ء میں حضرت سید صاحب بھوپال سے اپنے وطن دیسہ تشریف لائے، تو ان کے ساتھ کافی دنوں تک رہنے کا موقع ملا، وہ تاریخِ ہند کے کاموں کی سست رفتار سے بد دل تھے، لیکن ان کو تمام مجبوریوں اور مشکلوں کا بھی احساس رہا، ایک روز فرمانے لگے:

”میں تو چراغِ سحری ہوں، شاہ معین الدین صاحب دارالمصنفین کے اور کاموں میں لگیں گے، اب تم ہی کو تاریخِ ہند کے سلسلہ کو مکمل کر کے ان کو چھپوانے کا بھی انتظام کرنا ہے۔“

ان فقرات کے بار سے دب کر رہ گیا، اسی سلسلہ میں انھوں نے فرمایا کہ اب سیاسی واقعات کی کھتونی کے بجائے مسلمانوں کے دور کی تمدنی ثقافتی، علمی، معاشرتی، اقتصادی وغیرہ حالات پر لکھنے کی زیادہ کی ضرورت ہے، اسی دوران گفتگو میں یہ سوال آ گیا



کہ ہندوستان کے سلاطین اسلام کے نمائندے تھے؟ حضرت سید صاحب نے فرمایا کہ نمائندے نہ تھے اور دلائل میں وہی باتیں کہیں جو انھوں نے آل انڈیا ہسٹری کانگریس کے شعبہ تاریخ ہند از منہ وسطی کے خطبہ صدارت میں کہی تھیں، یعنی یہ ہے کہ ان کی حکمرانی کا طرز اور فرمانروائی کا اصول خالصہ اسلامی نہ تھا اور نہ ان کی سپہ سالار اور فاتح اپنے مفتوحہ علاقوں کے ساتھ اسلامی طریقہ کا پورا پورا برتاؤ کرتے تھے، ان کی صلح و جنگ، فتح و غنیمت اور محاصل و مدخل کے اصول بھی اسلامی نہ تھے.... الخ الخ، راقم نے مؤدبانہ طور پر عرض کیا کہ یہ صحیح ہے کہ وہ اسلام کے نمائندے نہ تھے، لیکن غیر مسلم ان ہی کی تاریخ کو اسلامی تاریخ سمجھتے ہیں، ہمارے صوفیاء، علماء اور صلحاء کے کارناموں کو وہ ہماری مذہبی سرگرمیاں سمجھ کر پڑھنے کے لیے تیار نہیں، اس کے علاوہ یہ سلاطین اسلام کے نمائندے تو نہ تھے لیکن ان ہی کی وجہ سے یہاں علماء، صلحاء اور مشائخ کو قدم جمائے کا موقع ملا، اور گوان کے درباروں کی فضا اسلامی نہیں رہی لیکن ان ہی کے سہارے اس سرزمین میں اسلام پھل پھول سکا، اور وہ گوانھوں نے تبلیغ اسلام کی کوئی کوشش نہیں کی لیکن ان ہی کی بدولت مبلغین اسلام کی کوششیں بار آور ہوتی گئیں، اور گو وہ اوامر و نواہی کے زیادہ پابند نہیں رہے، لیکن جہاں حمیت اسلام کا سوال پیدا ہوتا ہے وہاں ان کی دینی غیرت ضرور بروئے کار آ جاتی، حضرت سید صاحب نے مجھ کو روکتے ہوئے فرمایا جو کچھ کہتے ہو صحیح ہے، اس سے اختلاف نہیں، ایک زمانہ تھا کہ میں بھی شاہان اسلام کو اسلام کا نمائندہ اور اس کی شان و شوکت کا حامل سمجھتا تھا اور ان کی مدح و ستائش کیا کرتا تھا، اب جب سے یہ نکتہ حل ہوا کہ اکثریت ان میں ان کی ہے جن پر بدنام کنندہ گونا گے چند کی مثل پوری ہوتی ہے، تو ان کو اسلام کا نمائندہ سمجھنے سے دل ہٹ گیا لیکن یہ دینی جذبہ ہے اور ذوقی بات ہے، ذوق بھی یکساں ہمیشہ نہیں رہتا، یہ بھی بچہ، جوان اور بوڑھا ہوتا ہے، میں نے بچپن میں ناول بہت پڑھے، مگر مشغلہ علمی کے بعد یہ حال ہو گیا کہ ان کو پڑھنے کو جی نہیں چاہتا، اس کے یہ معنی نہیں کہ اب افسانے اور ناول نہ لکھے جائیں، لکھے جائیں گے اور وہ پڑھے جائیں، اور لکھنے والوں کو مبارک باد بھی

ملے گی، یہی حال اب سلاطین کی تاریخ کا ہے وہ ضرور لکھی جائے، اور آخر میں مجھ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ انشاء اللہ تم بھی بوڑھے ہو گے، تو تمہارا ذوق جوان ہوگا۔

حضرت سید صاحب کی یہ گفتگو برابر یاد آتی ہے، اسی زمانہ میں انھوں نے اصرار کر کے میری دوسری شادی کردی تاکہ میری زندگی میں میری تنہائی کی وجہ سے جو غمناکیاں اور تلخیاں ہیں وہ دور ہو جائیں، میری اس نئی زندگی کے لیے انھوں نے جو دعائیں فرمائیں، وہ میری زندگی کا بہت ہی بیش بہا سرمایہ ہیں۔

جون ۱۹۵۰ء میں حضرت سید صاحب بھوپال سے دارالمصنفین تشریف لائے تو وہ اس وقت کچھ ایسی ذہنی پریشانیوں میں مبتلا ہو گئے، جس سے نہ صرف ان کی بلکہ دارالمصنفین کی زندگی کا بھی رخ بدل گیا، اس مرتبہ دارالمصنفین آکر یہاں سے جو تشریف لے گئے تو دارالمصنفین کے علمی تاج کو پھر کسی نے چاندنی رات میں نہیں دیکھا۔

مارچ ۱۹۵۳ء میں حضرت سید صاحب پاکستان ہسٹاریکل کانگریس کی صدارت کے بعد ڈھاکہ سے کراچی جاتے ہوئے ہندوستان بھی آئے، اور اپنے داماد سید حسین صاحب قائم مقام کلکٹر فتح پور (یوپی) کے یہاں ٹھہرے، دارالمصنفین سے ایک مختصر قافلہ ان سے ملنے گیا، یہ راقم بھی ساتھ تھا، یہ ہم لوگوں کی آخری ملاقات تھی، جہاں دارالمصنفین کے اور تمام کاموں کی تفصیل پوچھی، وہاں تاریخ ہند کے سلسلہ کا بھی ذکر آیا، کام کچھ آگے نہ بڑھا تھا، پھر بھی حوصلہ افزائی کی خاطر مجھ سے فرمایا کہ اب یہ کام تو تم ہی کو انجام دینا ہے، اسی زمانہ میں معارف میں ”ہندوستان کے عہد وسطی کی ایک ایک جھلک“ کے عنوان سے میرا ایک سلسلہ مضمون جاری تھا، فرمایا کہ یہ دلچسپ چیز ہے، اس کو کتاب کی شکل میں شائع کر دینا، آج کل ایسی چیزوں کی ضرورت ہے، یہ ہمت افزا فقرے میرے محنت کے اصلی ثمر تھے۔

۲۳ نومبر ۱۹۵۳ء کو حضرت سید صاحب کی رحلت کی خبر ملی تو ایسا معلوم ہوا کہ اب میری علمی زندگی کا بھی خاتمہ ہو گیا، کیوں کہ وہ دارالمصنفین سے دور بھی رہے تو بھی

دارالمصنفین میں چلتے پھرتے اور ہمارے کاموں کی نگرانی کرتے نظر آتے، اور ہم جو بھی تحریر لکھتے خیال چھایا رہتا کہ اس پر ان کی نظر احتساب ضرور پڑے گی، وہ خامیوں کی گرفت کریں گے اور خوبیوں کو دیکھ کر حوصلہ بڑھائیں گے، ان کے وصال سے ایسا معلوم ہوا کہ علم و فضل و کمال کا سایہ ہم پر سے جاتا رہا، حوصلے پست ہو گئے، قلم کی رفتار رک گئی، لیکن جب ان کی وصیت کا خیال آتا تو از سر نو حوصلہ پیدا ہوتا۔

۱۹۵۴ء میں راقم کی ایک کتاب بزمِ مملوکیہ شائع ہوئی، جس سے اس سلسلہ کا کام کچھ تو آگے بڑھا لیکن یہ خاطر خواہ نہ تھا۔ ”ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کا فوجی نظام“ ختم تو ہو چکی تھی، لیکن پھر بھی اس کو طبع کرانے میں تاثر تھا، کیوں کی اس کی بعض باتیں اب بھی تشہہ تھیں، اس اثناء میں مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی اپنے خطوط میں اس سلسلہ کی تکمیل کے لیے ہر طرح کی ہمت دلاتے رہے، اور ایک جلد ”گجرات کے سلاطین کی تمدنی تاریخ“ لکھ کر بھیجی، لیکن مئی ۱۹۵۸ء میں ان کا ایک انتقال ہو گیا، تو میری بڑھی ہوئی ہمت پھر چھوٹ گئی، ان سے مفید مشورے ملتے رہتے اور ان سے قلمی اعانت کی بھی امید رہتی، انھوں نے غزنویوں اور غوریوں پر جو جلد لکھی تھی اس پر نظر ثانی بھی نہ کر سکے۔

۱۹۵۸ء میں میری ایک اور کتاب ”ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی ایک ایک جھلک“ شائع کی گئی، جس سے کچھ تھوڑا کام اور آگے بڑھا، ڈاکٹر سید محمود صدر مجلس انتظامیہ دارالمصنفین سابق وزیر امور خارجہ حکومتِ ہند کو تاریخِ ہند سے شغف رہا، میری درخواست پر انھوں نے دارالمصنفین کے اس سلسلہ تدوین میں دلچسپی لی، اور اس کی دس جلدوں کی جلد از جلد اشاعت کا ایک پروگرام بنوایا، اور مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیمات حکومتِ ہند کے سامنے پیش کیا گیا، اس کو دیکھ کر انھوں نے پسند فرمایا تو ان سے مالی امداد کی بھی درخواست کی گئی، اس وقت حکومتِ ہند کے وزارتِ تعلیمات کے سکریٹری جناب غلام خواجہ السیدین تھے، انھوں نے مفید مشورے دیئے لیکن مولانا ابوالکلام آزاد کی وزارت کی طرف سے ابھی مالی امداد کی منظوری ہونے نہیں پائی تھی کہ وہ رحلت فرما گئے، ان کے بعد

ان کی وزارت کے جانشین جناب ہمایوں کبیر صاحب نے اس پروگرام سے دلچسپی لی، اور اپنی علم دوستی سے اپنی وزارت کی طرف سے مالی امداد دلائی، جن سے ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۲ء تک حسب ذیل چھ کتابیں شائع ہو سکیں (۱) ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کا فوجی نظام (۲-۳) ہندوستان عربوں کی نظر میں جلد اول و دوم (۴) گجرات کی تمدنی تاریخ مسلمانوں کے عہد میں (۵) ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے (۶) ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی کارنامے۔ ان میں ”ہندوستان عربوں کی نظر میں“ جناب شاہ معین الدین صاحب ندوی ناظم دارالمصنفین نے اپنی نگرانی میں رفقائے دارالمصنفین مولوی ضیاء الدین اصلاحی اور حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی سے تیار کرائی، اور اس کے مسودہ کی نظر ثانی کرنے میں اپنا کافی وقت صرف کیا، ان کو بھی اب لگن پیدا ہو گئی ہے کہ اس سلسلہ کا کام خاطر خواہ طور پر آگے بڑھے ان کے کام کا دائرہ الگ ہے لیکن ناظم دارالمصنفین کی حیثیت سے وہ میری ہمت بڑھاتے رہتے ہیں، ”ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی کارنامے“ میں ایک باب خطاطی پر لکھ کر اس جلد کی تکمیل میں مدد بھی پہنچائی ہے۔

ان جلدوں کی تدوین کے سلسلے میں مختلف یونیورسٹیوں کے پروفیسروں کے پاس پہنچ کر ان سے قلمی اعانت کا خواستگار ہوا، لیکن پروفیسر محمد مجیب جامعہ ملیہ کے علاوہ کہیں سے تعاون حاصل نہ ہو سکا، البتہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نائب صدر جمہوریہ ہند سے جب جب ملنے کا موقع ملا تو اس کام کو جاری رکھنے کی ہمت برابر بڑھاتے رہے، اور اپنے ایک گرامی نامہ میں تحریر فرمایا:

وائس پریسیڈنٹ، انڈیا

نئی دہلی

مورخہ ۱۶ دسمبر ۱۹۶۳ء

”السلام علیکم“

”مطبوعات دارالمصنفین کی دو جلدیں (ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے اور ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی کارنامے) مجھے ملیں،

جستہ جستہ دیکھ رہا ہوں، بہت خوب کام ہے، اس عہد کی تمدنی تاریخ پر بہت اچھی اور تفصیلی معلومات کا ذخیرہ ہے، یہ دونوں کتابیں، آپ جس مستعدی اور یک سوئی سے اپنے استاد مرحوم کے تفویض کردہ کام کی تکمیل کر رہے ہیں، اس پر بے ساختہ دل سے صدائے آفریں نکلتی ہے، مبارک ہو۔

والسلام

مخلص : ”ذاکر حسین“

اس گرامی نامہ کے سرنوشت میں ڈاکٹر صاحب نے مجھ کو جن الفاظ سے یاد کیا تھا وہ میرے درجہ سے زیادہ ہیں، اس لیے ان کو حذف کر دیا ہے۔

فروری ۱۹۶۵ء میں دارالمصنفین کی طلائی جبلی کے موقع پر جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے حکومت ہند کی وزارت تعلیمات کی طرف سے پچاس ہزار کی گرانٹ کا اعلان فرمایا، اس کے ساتھ شرط یہ تھی کہ یہ گرانٹ اس وقت مل سکے گی، جب دارالمصنفین اتنی ہی رقم اپنی علمی سرگرمیوں میں صرف کرنے پر تیار ہوگا، دارالمصنفین اس کے لئے تیار ہو گیا، اس میں سے پندرہ ہزار کی جو پہلی قسط ملی، تو اس سے دارالمصنفین کی اور کتابوں، دین رحمت اور صاحب مرآۃ المثنوی کے ساتھ تاریخ ہند کی حسب ذیل جلدوں کی طباعت و اشاعت ممکن ہو سکی (۱) مقالات سلیمان (۲) ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں (۳) تاریخ سلاطین کشمیر (۴) عہد مغلیہ ہند و مسلمان مورخین کی نظر میں جلد اول۔

ان جلدوں کی اشاعت کے بعد یہ خوشی ہوئی کہ دارالمصنفین میں حضرت سید صاحب نے بزم تاریخ ہند میں جو شمع جلائی تھی، وہ اگر بہت فروزاں اور روشن نہ ہو سکی تو مدہم بھی نہ رہی اور اگر اس کے سرمایہ میں علامہ شبلی کی بیش بہا کتاب مضامین عالمگیر اور ان کے وہ قیمتی مضامین مثلاً ہمایوں نامہ، تزک جہانگیری، مآثر رحیمی، زیب النساء، ہندوستان میں اسلامی تمدن کے اثرات، بھاشا زبان اور مسلمانوں کی علمی بے تقصی، اور تحفۃ الہند وغیرہ بھی شامل کر لیے جائیں، جو دارالمصنفین کی طرف سے مقالات شبلی میں شائع

ہو چکے ہیں، تو یہ سرمایہ خاطر خواہ کہا جاسکتا ہے، مضامین کو چھوڑ کر اس کی پوری فہرست ناظرین کے ملا خطہ کے لیے اس وقت قلم سے خود بخود نکل رہی ہے۔

- (۱) مضامین عالمگیر از علامہ شبلی نعمانی
- (۲) عرب و ہند کے تعلقات از مولانا سید سلیمان ندوی
- (۳) مقالات سلیمان جو اس وقت ناظرین کے ہاتھ میں ہے
- (۴) ہندوستان کی اسلامی درسگاہیں از مولانا ابوالحسنات ندوی مرحوم
- (۵) رقعات عالمگیر از سید نجیب اشرف ندوی
- (۶) مقدمہ رقعات عالمگیر از سید نجیب اشرف ندوی
- (۷) تاریخ سندھ از مولانا سید ابوظفر ندوی
- (۸) گجرات کی تمدنی تاریخ مسلمانوں کے عہد میں از مولانا سید ابوظفر ندوی
- (۹) مختصر تاریخ ہند از مولانا ابوظفر ندوی
- (۱۰) ہندوستان کی کہانی، از مولانا عبدالسلام قدوائی
- (۱۱-۱۲) ہندوستان عربوں کی نظر میں جلد اول و دوم
- (۱۳) ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی کارنامے
- (۱۴) تاریخ سلاطین کشمیر از ڈاکٹر محبت الحسن مترجم علی حماد عباسی ام۔ اے۔ راقم نے حسب ذیل کتابیں لکھیں:
- (۱۵) بزم تیموریہ
- (۱۶) بزم صوفیہ
- (۱۷) بزم مملوکیہ
- (۱۸) ہندوستان کے عہد وسطی کی ایک ایک جھلک
- (۱۹) ہندوستان کے عہد وسطی کا فوجی نظام
- (۲۰) ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے

(۲۱) ہندوستان کے سلاطین علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر

(۲۲) ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں

(۲۳) عہد مغلیہ ہندو مسلمان مؤرخین کی نظر میں جلد اول

(۲۴) ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

(۲۵-۲۶) ہندوستان کی بزم رفتہ کی سچی کہانیاں، جلد اول و دوم

## افاداتِ سید صاحب<sup>۲</sup>

۱۹۳۵ء کی دسمبر میں غیر معمولی سردی پڑی، سید صاحب اس کے اواخر میں دہلی گئے ہوئے تھے، وہاں سے واپس ہوئے تو ذاتِ الجذب کے سخت مرض میں مبتلا ہو گئے۔ حالت نازک ہوتی چلی گئی، دارالمصنفین کے تمام لوگ بے حد متردد ہوئے، مولوی مسعود علی ندوی مینیجر دارالمصنفین نے بہتر سے بہتر علاج کا سامان کیا، ان کے مشوروں میں جناب شاہ معین الدین صاحب ندوی بھی شریک رہے جو برابر سید صاحب کے بسترِ علالت کے پاس بیٹھتے رہتے، ان کے لیے اپنی نمازوں میں دعا کرتے، میں تیمارداری کی خدمت انجام دینے لگا، سید صاحب کی بیگم صاحب اس وقت تک مجھ سے پردہ کرتی تھیں، مگر جب ان کے ساتھ تیمارداری کرنے لگا تو یہ پردہ جاتا رہا، مجھ سے جو کچھ بن پڑا دن رات خدمت میں لگا رہا، معالج ڈاکٹر کیدار ناتھ تھے، جنھوں نے بعد میں لندن جا کر ڈگریاں حاصل کیں، پھر بنارس، کانپور اور آگرہ کے میڈیکل کالجوں میں میڈیسن کے پروفیسر ہو کر بڑی شہرت حاصل کی، انھوں نے سید صاحب کا علاج بڑی محنت سے کیا، اب تک دارالمصنفین والوں سے ان کے اچھے تعلقات ہیں، خدا خدا کر کے سید صاحب کو شفا ہوئی، مولوی مسعود علی ندوی اور شاہ صاحب نے خوشی میں شہر کے لوگوں کو ایک دعوت میں بلا کر ایک جشن منایا، جس میں اقبال سہیل اور سخی اعظمی نے نظمیں لکھ کر اپنی مسرت کا اظہار کیا، جناب اقبال سہیل نے ”نذرِ خلاص“ کے عنوان سے جو یہ نظم لکھی اس کے چند اشعار یہ ہیں:

سزا وار جن و پری سجدہ شکرانہ کنند

کا ندریں بزم دگر بار سلیمان آمد

ان میں سے حضرت سید صاحب نے عرب و ہند کے تعلقات ہندوستانی اکیڈمی کے لئے لکھی، لیکن وہ دارالمصنفین میں ہی لکھی گئی، اس لئے وہ دراصل اسی کا کارنامہ ہے، پھر اپنے مقالات کے علاوہ ہندوستان کی اسلامی درسگاہیں، رقعات عالمگیر، مقدمہ رقعات عالمگیر، تاریخ سندھ، مختصر تاریخ ہند، بزم تیموریہ، بزم صوفیہ، ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام، ہندوستان کی کہانی اور ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی کارناموں کے بیشتر ابواب اپنی خاص نگرانی میں لکھوائے، ان کی رحلت کے بعد تاریخ ہند پر راقم نے جو کچھ لکھا ہے وہ انہیں کی جوتیوں کا صدقہ ہے اور اب جب کہ اتنی جلدیں شائع ہو چکی ہیں، تو جو جلدیں اب تک نہ لکھی جاسکی ہیں، ان کے لکھنے اور لکھوانے کی فکر دامن گیر ہے، اور ہر قسم کی مجبوریوں اور دشواریوں کے باوجود حوصلہ کم ہونے کے بجائے بڑھا ہوا ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ حضرت سید صاحب کی وصیت کو پورا کرنے کی توفیق اور برکت عطا فرمائیں کیوں کہ یہی اپنی حقیر زندگی کا مشن بن گیا ہے۔ (۱)

دیدہ از جلوہ دیدار سعادت اندوخت  
 سینہ چوں عالم انوار چراغاں آمد  
 کیست در بند کفون جز تو کہ در بزم کمال  
 کاشف عقدہ اسرار بد بیناں آمد  
 نوک کلک تو از بس لعل و گہری پاشد  
 ہند را برزن و بازار بدخشاں آمد  
 مرجع علم و ادب ہستی و ہموارہ تر  
 کرم داوار داوار نگہباں آمد  
 اینک از مرقد استاد (۱) صدای آید  
 کہ بہار آمد و بسیار بہ سماں آمد  
 جناب عظمیٰ کی نظم کے دو شعر یہ ہیں:

رہے تا دیر قائم اے خدا ظل سلیمانی  
 زبان خامہ پر اب یہ دعا بے اختیار آئی  
 یہی ہیں در حقیقت باغبان گلشن شبلی  
 ابھی آئی ہے ان سے نہایت پیرا ہن شبلی

صحت کے بعد سید صاحب کو دہرہ دون جا کر آرام کرنے کا طبی مشورہ دیا گیا، وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ وہاں جانے لگے تو مجھ کو بھی ساتھ لیتے گئے کیوں کہ اب میں ان کے گھر کا ادنیٰ فرد ہو گیا تھا، بیگم صاحبہ کو اپنی ماں اور وہ مجھ کو اپنا بیٹا سمجھنے لگی تھیں، ان سطروں کے لکھتے وقت ان کی اس شفقت کی یاد آ رہی ہے اور اس پر فخر کرتا ہوں۔

دہرہ دون میں سید صاحب کے ساتھ کئی مہینے رہنے کا اتفاق ہوا، تو اس فرصت میں ان سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کا موقع ملا، اس زمانہ میں اردو میں ایم۔ اے۔ کرنے

کا ارادہ، تھا اس نصاب میں عام یونیورسٹیوں کے برخلاف جہاں شعر و ادب کے پرچے تھے، الکلام، مقدمہ ابن خلدون، فلسفہ اجتماع، فلسفہ جذبات اور تاریخ اخلاق یورپ وغیرہ جیسی کتابیں بھی داخل تھیں۔

اس میں انیس و دہرہ کے مراثن بھی تھے، مولانا شبلی کی موازنہ انیس و دہرہ کا بہت ہی گہرا مطالعہ کیا اس کو پڑھ کر دماغ میں شعر و ادب کی کرنیں پھوٹی نظر آئیں، فصاحت، بلاغت، واقعہ نگاری، منظر نگاری، محاکات اور پھر صنائع بدائع میں ترصیع، حسن تعلیل، مراعات النظر، استخدام، تضاد، مبالغہ، تشبیہات، استعارات وغیرہ کے مباحث سے سید صاحب کی رہنمائی میں اچھی طرح واقف ہوا، جس کے بعد انیس کے مراثن پڑھنے میں لطف آنے لگا، مولانا شبلی نے دہرہ کے مقابلہ میں انیس کو بڑھا دیا ہے، اس کے جواب میں المیزان بھی لکھی گئی مگر سید صاحب فرماتے ہیں کہ اس کی قلمی کھتونی مولانا شبلی کی نکتہ پروری اور دیدہ وری کے مقابلے میں دب کر رہ گئی اور یہ صحیح ہے، میرے دارالمصنفین کے قیام کے زمانہ میں لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک طالب علم آئے وہ اردو کے کسی مرثیہ نگار پر پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کرنا چاہتے تھے میں نے ان کو دہرہ پر مقالہ لکھنے کی رائے دی تو کہنے لگے مولانا شبلی کی نوک قلم سے دہرہ کو جو زخم پہنچ چکا ہے ہو اس کو کسی طرح دھونیں سکتا، خواہ کتنے ہی میرے نگران استاد مجھ سے محنت کرائیں۔

میں نے سودا اور ذوق کے بعض مشکل قصائد سید صاحب سے پڑھے، ان کو درس دینے میں بڑی لذت ملتی تھی، دہرہ دون کی فرصت میں اس درس سے ان کا بھی اچھا وقت گزر جاتا تھا اور میرے لیے تو یہ نعمت غیر مترقبہ ہی تھی، ان کو علم عروض پر بڑی قدرت تھی، اس لیے عروض بھی بتاتے جاتے، مگر مجھ کو اس علم سے کبھی دلچسپی نہیں پیدا ہوئی اس لیے اس فن میں کو راہی رہا، سودا نے جو نعمت اور منقبت لکھی ہے یا ذوق نے بہادر شاہ ظفر کے لیے جو قصائد لکھے ہیں، ان کا درس میں نے سید صاحب ہی سے لیا، سودا نے اپنی قصیدہ نگاری میں اردو شاعری کو جو رنگ، ڈھنگ، سنگ اور آہنگ دی ہے اس کو سید صاحب نے اچھی

طرح سمجھایا، سید صاحب فرماتے کہ سودا کی بہاریہ تشبیہ اردو کی قصیدہ نگاری میں بے مثال ہے، اس کی نقل کسی اور سے نہیں ہو سکی ہے ان کے قصیدہ میں جو دھوم دھام ہے، جو طغنه ہے، جو وقار ہے وہ ذوق کے قصیدوں میں نہ پاسکا، وہ سودا کی طرح اپنی دقت نظر کا اظہار کرنا چاہتے ہیں مگر ان کی نقل ہو نہیں پائی، ان کی کوشش رہی کہ وہ ہمہ داں عالم بن کر قصیدہ نگاری کریں مگر ان کی ہمہ دانی نے قصیدہ کی شعریت کو مجروح کر دیا ہے۔

مولانا شبلیؒ نے الکلام میں مذہب کے فطری ہونے کے جو دلائل دیئے ہیں یا وجود باری، توحید، نبوت، خرق عادت، معاد، عذاب و ثواب، حقوق انسانی، ملائکہ، وحی، اسلام، تمدن اور ترقی اور پھر علم کلام میں توحید فی الصفات و فی العبادات، روحانیات، مذہب اور عقل پر جو بحثیں کیں ہیں وہ سید صاحب ہی سے سمجھیں، ان کی بعض عبارتوں سے عام طور پر جو غلط فہمی ہوئی ہے، اس کو بھی سید صاحب نے اچھی طرح سمجھایا، اس موضوع پر اردو میں یہ پہلی کتاب تھی اور اس سے بہتر اب تک کوئی اور کتاب لکھی نہیں گئی تھی، اتفاق سے انھی دنوں مولانا عبدالغنی پھول پوری نے سرائے میر ضلع اعظم گڑھ میں ایک اجتماع کر کے الکلام کی بعض عبارتوں کی غلط تاویل کر کے مولانا شبلیؒ پر کفر کا فتویٰ دے دیا اور ان کے ساتھ کلام مجید کے مشہور مفسر مولانا حمید الدین فراہی کو بھی کافر بنایا، سید صاحب اس خبر کو سن کر بے چین ہو گئے اور فرمایا کہ کی یہ علماء ایک دوسرے کی تکفیر و تفسیق کا مشغلہ جاری رکھنے سے باز نہ آئیں گے۔ پھر اگست ۱۹۳۶ء کے معارف کے شذرات میں تحریر فرمایا کہ کافر گری کا حربہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کی تباہی کے لیے استعمال کی گیا ہے، تھانہ بھون، سہارنپور، دہلی، بمبئی اور دیوبند کے علماء کو مولانا شبلیؒ اور مولانا حمید الدین فراہیؒ کی چند بے محل عبارتیں دکھا کر دونوں کی تکفیر کا فتویٰ لے آئے جس پر اکتالیس علماء کرام کی تصدیقی مہریں ثبت ہیں، پھر دہلی، میرٹھ اور بدایوں وغیرہ سے ایک درجن ایسے علماء بلا کر لے آئے جو اپنے مخالفوں کو بہتر سے بہتر مذہبی اور اخلاقی گالیاں دے سکیں، آخر میں لکھتے ہیں کہ دشمنوں نے اپنے ترکش کا آخری تیر بھی چھوڑ دیا اور انہیں معلوم ہو گیا

کہ ان بازوؤں میں زور اور ہمارے سینوں میں مضبوطی کتنی ہے، اب وہ بھی آرام سے رہیں اور ہم بھی آرام پائیں گے۔

مقدمہ ابن خلدون کے بعض حصے کو بھی سید صاحب سے ہی سمجھا، انھوں نے وقتاً فوقتاً جو کچھ ابن خلدون (م ۸۰۸ھ) سے متعلق فرمایا، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ تونس نژاد مؤرخ اپنے وقت کا عبقری تھا، اس نے قرآن مجید ساتوں قرأتوں کے ساتھ حفظ کیا، مؤطا امام مالک، صحیح مسلم اور صحیح بخاری کی تعلیم کے ساتھ مالکی مذہب کی مشہور کتاب مدونہ، نحو و لغت میں تسہیل، علم منطق اور علم کلام کو پڑھا، دیوان حماسہ اور دور عباسی کی بہت سی نظمیں اس کو از بر یاد تھیں، اغانی کی ایک جلد کو بھی زبانی یاد کر لیا تھا، وہ اپنی ملازمت کے سلسلہ میں مختلف جگہوں مثلاً فارس، غرناطہ، بخارا، قاہرہ اور دمشق وغیرہ میں بھی مشغول رہا لیکن اس کے علم کی شادابی میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوئی، اس کی تصانیف میں جو ذہانت، علم کی جو وسعت اور رائے کی جو حدت موجود ہے اس پر نہ صرف عربی علوم و فنون بلکہ دنیا کے علوم و فنون کو فخر ہونا چاہیے، اس نے فلسفہ اجتماعیہ کو قالب میں ڈھالا، اس کی تصانیف میں کوئی خاص انشاء پردازانہ اسلوب نہیں لیکن ان میں فکر ہے، اس کی قوت بیان اس کی قوت فکر یہ کے نیچے دب گئی ہے، لیکن اس کے اظہار بیان میں تنوع ہے، اس کی تاریخ ابن خلدون تین حصوں میں منقسم ہے، پہلے حصہ میں تو مقدمہ ہے، جس میں بہت سی اجتماعی باتیں فلسفیانہ انداز میں پیش کی گئی ہیں، دوسرے حصہ میں آغاز آفرینش سے آٹھویں صدی تک عرب اور دوسری قوموں کی تاریخ ہے، تیسرے حصہ میں بربر کی تاریخ ہے۔

مقدمہ ابن خلدون میں بدویت، حضریت اور عصبیت پر جو مباحث ہیں ان کے پیچیدہ حصہ کو سید صاحب سے سمجھنے کی کوشش کی، پھر اس میں عروج و زوال کے اسباب پر جو نکتہ آرائیاں ہیں ان سے بھی سید صاحب ہی کی مدد سے روشناس ہوا، جواب تک میرے ذہن میں اسی طرح منقوش ہیں۔

ابن خلدون نے عصبیت پر بڑا زور دیا ہے، اس کا خیال ہے کہ اس سے قوت

مدافعت اور حق طلبی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، علاحدہ علاحدہ عصیتیں بھی ہوتی ہیں، مگر ان میں ایک ایسی عصیت کا بھی ہونا ضروری ہے جو تمام عصیتوں میں قوی، سب پر غالب، اور سب کو اپنے میں ضم کر لینے والی ہو گویا اس کا شمار ایک بڑی عصیت میں ہو، جس کو ملک و حکومت کی عصیت کہا جائے، اگر یہ نہ ہو تو لوگ اختلاف و نزاع میں مٹ مٹا جاتے ہیں، جب عصیت انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو اقتدار بھی غیر معمولی بڑھ جاتا ہے، جب عصیت انتہا تک نہیں پہنچتی ہے اور بہت سے موانع اس کے سنگ راہ بن جاتے ہیں تو عصیت کے ساتھ اقتدار بھی ختم ہو جاتا ہے، اور حکومت کی فلاح اس میں ہے کہ عصیت اور اقتدار میں توازن ہو، عصیت کے بعد جو اقتدار آتا ہے اس میں تعیش کا پیدا ہونا ضروری ہے، مال و دولت ملنے سے تن آسانیاں دوبالا ہو جاتی ہیں، عادتیں کچھ سے کچھ ہو جاتی ہیں، تعیشتاں ضروریات زندگی میں شمار ہونے لگتے ہیں، امیرانہ ٹھاٹھ کھانے پینے، لباس و پوشاک، فرش و فرش، ظرف و ظروف میں دکھائی دینے لگتا ہے، اور جب یہ تعیشتاں آخری حد تک پہنچ جاتے ہیں تو زوال کے سارے اسباب جمع ہو جاتے ہیں۔

میں نے ابن خلدون کے ان خیالات کو پڑھا تو سید صاحب سے عرض کیا کہ ہندوستان میں مغل بادشاہوں کے زوال کا تجزیہ اس روشنی میں کیا جاسکتا ہے، فرمانے لگے کہ بادشاہوں کی حکومت کے زوال کا تجزیہ کرنے کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کے انحطاط اور زوال کے اسباب کے تجزیے کی بھی ضرورت ہے، مقدمہ ابن خلدون میں جو باتیں لکھی گئیں ہیں ان سے اس تجزیہ میں مدد مل سکتی ہے، یہ نصیحت برابر ذہن میں کام کرتی رہی اور مقدمہ ابن خلدون کا مطالعہ بھی برابر جاری رکھا۔

ایک روز مقدمہ ابن خلدون کے اس حصہ پر نظر پڑی جس میں یہ کہا گیا ہے کہ علماء سیاست سے نا آشنا اور نابلد ہوتے ہیں اس کے وجوہ یہ بتائے گئے ہیں:

”علماء نظر و فکر اور معانی میں غور و خوض اور محسوسات سے ان کے انتزاع میں مشغول و مصروف رہتے ہیں اور ذہن میں ان کو مجرد کر کے امور کلیہ عامہ ان سے

اخذ کرتے ہیں اور پھر ان پر احکام عامہ لگاتے ہیں، ان کو مخصوص مادہ، خاص شخص و قوم یا کسی مخصوص صنف انسانی سے بحث نہیں ہوتی، بلکہ اخذ کردہ کلیات کو خارجیات پر منطبق کرتے ہیں، قیاسات فقہیہ میں مشغول رہ کر وہ امور کو اشباہ و نظائر پر قیاس کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں، بہر حال ان کے احکام و نظریات ہی ہوتے ہیں، اور جب ذہنی بحث و نظر سے ان کو فراغت ملتی ہے تو مطابقت علی الخارج کی طرف رخ کرتے ہیں، خلاصہ کلام یہ کہ علماء امور ذہنیہ میں ہی نظر و فکر کرنے کے عادی ہوتے ہیں، اور اس کے سوا کچھ نہیں جانتے۔“

(باب ششم فصل ۳۵)

میں نے یہ عبارت سید صاحب کو دکھائی تو وہ مسکرائے اور فرمایا یہ صحیح بھی ہے اور غلط بھی، پھر مجھ سے کہا تم اس بحث میں کیوں پڑو، سید صاحب ہی نے بتایا کہ ابن خلدون کی وفات قاہرہ میں ہوئی لیکن اس کی قبر کا کہیں پتا نہیں جو ایک بڑا المیہ ہے۔ ایک روز میں لیکن کی مشہور کتاب ہسٹری آف یورپین مارلس کا وہ اردو ترجمہ پڑھ رہا تھا جس کا اردو ترجمہ مولانا عبدالمجید دریابادی نے ”تاریخ اخلاق یورپ“ کے نام سے کیا ہے، سید صاحب میری میز کے پاس آ کر بیٹھ گئے، کتاب الٹی تو اس میں پڑھا:

”رومیوں کے قلوب پر شقاوت و قساوت مسلط ہو گئی تھی اور انہیں سفاکیوں، بے دردیوں اور خون آشامیوں میں وہی مزا آنے لگا تھا جو شاید افریقہ کے وحشیوں کو آتا ہو تو آتا ہو ورنہ اور تو کسی انسان کو نہیں آتا، یہ اسی طبیعت کا نتیجہ تھا کہ مسیحی لوہے کے سرخ انگارا کرسیوں پر بٹھلائے جاتے تھے اور ان کے بنے ہوئے گوشت سے دھواں اٹھتا تھا، ان کا گوشت لوہے کے کانٹوں کی مدد سے ان کی ہڈیوں سے کھرچا جاتا تھا، ان کے گرجاؤں کی کنواریاں سبافون کی شہوت پرستیوں کی نظر کردی جاتیں یا کسی ناکہ کے حوالہ کردی جاتی تھیں، جیسی جیسی آگ میں وہ گھنٹوں اسی طرح بھونے جاتے تھے کہ اس عذاب کے مقابلہ میں

اک بارگی انھیں قتل کر ڈالنا ان پر رحم کرنا تھا، ایک ایک عضو دوسرے سے کاٹ کر الگ کیا جاتا تھا اور اس میں جلتا ہوا سیسہ پلایا جاتا تھا، ان زخموں پر نمک، مرچ اور سرکہ ڈالا جاتا تھا، یہ عذاب سارے سارے دن رکھے جاتے تھے، اور ایک مرتبہ تو یہاں تک ہوا کہ ۲۲ آدمی اس حالت میں باہر نکالے گئے کہ ان میں سے ہر شخص کی ایک ایک آنکھ اپنے صدقہ سے باہر نکال لی گئی ہے اور ایک ایک پیر سے ایک گوشت کا ٹوٹھرا سرخ انگارالو ہے سے کاٹ لیا گیا ہے، یہ دردناک عذاب جن کے سننے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں نازل کئے جاتے اور مرد و عورتیں بلکہ کمزور و نازک لڑکیاں تک انھیں برداشت کرتی تھیں۔

اس کے ساتھ مسیحیوں کے مظالم کا بھی کچھ ذکر تھا:

”مسیحیوں کے زمانے میں اسپین کے حکمہ احتساب کے حکم سے اکیلے ٹور کمینڈا کی زیر صدارت دو ہزار نفوس زندہ جلا دیے گئے اور سترہ ہزار اشخاص، جنھوں نے مختلف شدائد کے بعد اپنے عقائد سے توبہ کر لی ان کا ذکر نہیں، چارلس پنجم کے عہد میں شہدا کا شمار تقریباً پچاس ہزار تک تھا۔“

تاریخ اخلاق یورپ کو سید صاحب نے بند کر کے فرمایا کہ ایسی وحشیانہ سفایاں اسلام کی تاریخ میں نہیں ملیں گی، پھر فرمایا کہ یہودیوں نے مسیحیوں اور مسیحیوں نے یہودیوں، اور ان دونوں نے مسلمانوں پر جو مظالم کیے ہیں ان کی مفصل تاریخ لکھی جائے تو اس کے مقابلہ میں مسلمان حکمرانوں کے مظالم بالکل ماند پڑ جائیں گے گو ان مسلمان حکمرانوں نے جو کچھ کیا وہ اسلام سے منسوب نہیں کیا جاسکتا ہے مگر بد باطن مؤرخ ہی ایسا کرتے رہتے ہیں۔

سید صاحب کی درس و تدریس سے استفادہ کرنے کے ساتھ ہی ان کی پر کیف باتوں سے بھی معلومات میں اضافہ ہوتا رہا، ایک روز سیر النبی پر گفتگو آ گئی، فرمایا کہ اس کی پہلی دو جلدوں میں تو یہ ہے کہ ہمارے رسول اللہ ﷺ کیا تھے، بقیہ جلدوں میں یہ دکھانے کی

کوشش کی جا رہی ہے کہ آپ کیا لائے، آپ کیا تھے، یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں اسی سے آپ کی حیات طیبہ کا صحیح اندازہ ہو سکے گا، پھر فرمایا کہ ان جلدوں کی تدوین میں یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ ماخذ صرف کلام پاک اور حدیث ہو کسی اور تصنیف اور مصنف کا سہارا نہ لیا جائے۔

ایک روز طرز تحقیق پر ذکر آ گیا فرمایا کہ مولانا شبلی کہا کرتے کہ چیونٹیوں کے منہ سے شکر کے دانے چن چن کر مٹھایاں تیار کرنے سے کم مشکل کام تحقیق کرنا نہیں ہے، پھر فرمایا کہ مولانا شبلی ادب کو کوئی فن نہیں سمجھتے تھے، اس کو علمی دسترخوان کی چٹنی قرار دیتے رہے، کہتے کہ جس طرح سنگین کھانوں کے ساتھ زبان کا ذائقہ بدلنے کے لیے چٹنی کے چٹخارے لے لیے جاتے ہیں اسی طرح علم کی سنگینی میں ادب چٹخارے کا کام دیتا ہے، اس سلسلہ میں فرمایا کہ مولانا شبلی مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں کے قائل تھے کہتے کہ وہ خود تو ایجاز کے بادشاہ ہیں اور مولانا ابوالکلام آزاد اطناب کے بادشاہ ہیں یعنی وہ تو پھیلی ہوئی چیز کو اچھی طرح سمیٹ کر لکھ دیتے ہیں لیکن مولانا ابوالکلام آزاد سٹی ہوئی چیزوں کو پھیلا نا خوب جانتے ہیں۔

اسی سلسلہ میں یہ بھی فرمایا کہ جب مولانا شبلی الندوہ کے ایڈیٹر تھے تو انھوں نے ایک موضوع ان کو لکھنے کے لیے دیا، شاید علم کلام کا کوئی موضوع تھا، انھوں نے بڑی محنت سے تیار کیا، جب مولانا کو دکھایا تو ان کو یہ تحریر پسند نہ آئی اور انھوں نے کہا کہ اگر یہ چیز ابوالکلام کو لکھنے کے لیے دی جاتی تو وہ اس کو کچھ اور ہی انداز میں لکھتے، اس کے بعد اس موضوع پر مولانا ابوالکلام آزاد کو بلا کر لکھنے کے لیے کہا، مولانا ابوالکلام آزاد مولانا شبلی کے یہاں سے اٹھ کر ان کے پاس چلے آئے اور پوچھا کہ ان کی کون سی تحریر تھی جو مولانا کو پسند نہیں آئی، انھوں نے یہ تحریر ان کو دکھا دی اس پر ایک نظر ڈالی، پھر اسی کے مواد کو ذہن میں رکھ کر ایسی تحریر لکھ دی جس کو مولانا پڑھ کر خوش ہو گئے، یہ خوشی صرف ان کے اسلوب بیان پر تھی۔

پھر فرمایا کہ ندوۃ العلماء کا ایک اہم جلسہ تھا مولانا شبلی نے مولانا ابوالکلام آزاد کی



ایک تقریر بھی اس میں قصداً رکھی تھی، ان کا ارادہ تھا کہ ان سے تقریر اس وقت کرائی جائے، جب جلسہ کا سارا کام ان کے حسب خواہ ہو جائے، مگر رات زیادہ گزر گئی، کام ختم نہیں ہو رہا تھا لوگ کچھ بور ہو رہے تھے، تو مولانا شبلیؒ نے مولانا ابوالکلام آزاد کو بولنے کے لیے کھڑا کر دیا، ان کی زبان سے یہ پہلا جملہ نکلا ہی تھا کہ ”اب جبکہ لیلائے شب کی زلفیں دراز ہو رہی ہیں“ پورا مجمع یہ سن کر جاگ اٹھا اور جلسہ میں جان پڑ گئی۔

ایک روز مولانا شبلی کی وفات کا ذکر آگیا تو فرمایا کہ ان کی وفات پر انھوں نے ایک نوحہ لکھا تھا جو اخباروں میں چھپا تو اس کی تعریف میں ان کے پاس خطوط آنے لگے، اس زمانہ میں عزیز لکھنوی کی بڑی شہرت تھی انھوں نے بھی اس نوحہ کو پسند کیا، اس کے ایک مصرع میں لفظ ”برس“ سے مصرع موزوں ہوتا تھا لیکن عزیز لکھنوی نے توجہ دلائی کہ صحیح تلفظ برس ہے، مگر یہ نوحہ دارالمصنفین کے صدر جناب عماد الملک کے اعلیٰ معیار کے مطابق نہیں تھا اس لیے انھوں نے ان کو لکھا کہ وہ بازار میں اس وقت تک اپنی چیز پیش نہ کریں جب تک کہ ان کو یقین نہ ہو جائے کہ اس سے بہتر چیز کوئی اور پیش نہیں کر سکتا ہے، اس واقعہ کو بیان کر کے سید صاحب نے فرمایا کہ عماد الملک کی یہ نصیحت ان کے ذہن پر برابر چھائی رہی، سید صاحب نے نواب عماد الملک کی موت پر جون ۱۹۲۶ء کے معارف کے جو شذرات لکھے تھے ان میں اسی بات کو اس طرح ادا کرتے ہیں:

”استاد مرحوم کی وفات پر جو اردو مرثیہ میں نے لکھا وہ ان کے یعنی (نواب صاحب) کے پاس بھیجا، جواب میں ایک ایسا نکتہ حوالہ قلم فرمایا جو ہمیشہ میرے لیے رہنما ثابت ہوا، فرمایا عرض ہنر اس وقت تک نہیں کرنا چاہیے جب تک کہ یہ نہ معلوم ہو کہ اب اس ہنر میں میرا کوئی حریف نہ ہو سکے گا۔“

ایک روز فرمایا کہ وہ اپنی تحریروں کو نوک سوزن اور نیش خار سے آلودہ کرنا گوارہ نہیں کرتے، اس کو شرافت اخلاق کے موتیوں سے جھلملاتا دیکھنا پسند کرتے ہیں البتہ وہ اللہ تبارک و تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے خلاف کوئی تحریر دیکھتے تو ان کا قلم بے قابو ہو جاتا

ہے، اور اس سے ایسی زہریلی تحریر نکل پڑتی ہے کہ سات سمندر کا پانی بھی اس کے زہر کو زائل نہیں کر سکتا، ایک روز فرمایا کہ وہ جب کوئی موضوع شروع کرتے ہیں تو وہ اس کے مضامین کے بارے میں اس قدر دبتے چلے جاتے ہیں کہ ان کے جسم میں کوئی قوت نہیں معلوم ہوتی ہے، وہ اپنے کو بے جان محسوس کرتے ہیں، مگر جب یہ موضوع مکمل ہو جاتا ہے تو ان کا جسم ہلکا پھلکا معلوم ہوتا ہے یہ کہہ کر فرمایا کہ وہ اپنی تصنیفی زندگی میں وحی خداوندی کے قائل ہوئے، کلام اللہ کا نزول جب رسول اللہ ﷺ پر ہوتا تھا تو آپ پر دباؤ اس قدر شدید ہوتا تھا کہ سردی کے موسم میں آپ پسینے سے شرابور ہو جاتے اور آپ کسی سواری پر ہوتے تو سواری بوجھ سے زمین پر بیٹھ جاتی، یہ تعجب انگیز نہیں۔

ایک روز مولانا محمد علی کا ذکر آیا تو فرمایا کہ وہ جب وفد خلافت کے ساتھ ان کے ہمراہ انگلستان میں تھے تو ان کو انگریزی بولنے میں ایسی مہارت تھی کہ وہ مقامی لب و لہجہ میں یہ زبان بول کر ہر قسم کا کام نکال لیتے تھے، اسی زمانہ میں ترکوں کا بھی ایک وفد آیا ہوا تھا، اس کے اراکین شاہی مہمان تھے، ایک ہوٹل میں ان کے قیام کا انتظام تھا جہاں بندوچی مقرر تھے کہ کوئی آدمی حکومت کی اجازت کے بغیر ان سے نہ مل سکے، مولانا محمد علی ان سے مل کر اپنا نقطہ نظر ان سے بیان کرنا چاہتے تھے، مگر ان کو اس کی اجازت نہیں ملی، مگر وہ کب باز آنے والے تھے، رات کو وہ چپکے سے نکلے ہوٹل کے پھاٹک پر پہنچے، ایک بندوچی سے مقامی لب و لہجہ میں مخاطب ہوئے پھر اس کے ہاتھ میں کچھ اشرفیاں رکھ دیں اور اس کو ایک بڑا لفافہ دیا کہ وہ ترکی وفد تک پہنچا دے، اشرفیوں کی رشوت لے کر وہ اس کے لیے راضی ہو گیا اور وہ لفافہ ترکی وفد تک پہنچ گیا، سید صاحب نے فرمایا کہ پھر یہ خیال غلط نکلا کہ انگریزوں کے یہاں رشوت نہیں چلتی ہے۔

کہنے لگے کہ ایک موقع ایسا بھی آیا کہ جب مولانا محمد علی عربوں کو مخاطب کرنے لگے، وہ انگریزی میں بولتے جاتے اور وہ یعنی سید صاحب اس کا ترجمہ عربی میں کر دیتے، مگر مولانا محمد علی انگریزی کے بڑے لمبے لمبے جملے بولتے، عربی میں وہ یعنی سید صاحب ان

کا صرف خلاصہ کر دیتے، مولانا محمد علی کو یہ پسند نہ آیا پھر وہ خود ہی ٹوٹی پھوٹی عربی میں تقریر کرنے لگے۔

وہ مولانا محمد علی کے صاف باطنی کے بہت قائل تھے، کہنے لگے کہ جب وہ ان کی سربراہی میں خلافت کے وفد کے ساتھ حجاز جا رہے تھے تو اخراجات کے لیے کوئی رقم گھر میں نہیں چھوڑی تھی، اللہ پر توکل کر کے چل کھڑے ہوئے، بمبئی سے جہاز روانہ ہونے لگا تو کچھ لوگ رخصت کرنے آئے، بمبئی کے ایک سیٹھ نے مولانا محمد علی سے رخصتی مصافحہ کیا تو ان کی ہتھیلی میں پانچ سو روپے کے نوٹ رکھ دئے، مولانا محمد علی ان نوٹوں کو اپنی دونوں ہتھیلیوں پر رکھ کر تمام مجمع کے سامنے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شکر ادا کرنے لگے کہ وہ کیسا مسبب الاسباب ہے، اسی سلسلہ میں سید صاحب نے فرمایا کہ اس زمانہ میں حجاز میں عراق کی طرف سے رشید رضا بھی خاص نمائندے بن کر آئے تھے مگر وہ وہاں عضو مخصوص کہلاتے تھے، جس سے مولانا محمد علی برابر لطف لیتے رہے، سید صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ حجاز سے جب وہ واپس ہوئے تو مولانا محمد علی سے وہاں کے مسائل کے سلسلہ میں کچھ اختلاف ہو گیا، مولانا محمد علی نے ان کے خلاف اپنے اخبار ہمدرد میں مضامین لکھنے شروع کیے مگر وہ خاموش رہے کسی بات کا جواب نہیں دیا، اسی زمانے میں وہ دہلی گئے تو مولانا محمد علی سے جا کر ملے اور ان سے اثنائے گفتگو میں کہا کہ وہ ان کے خلاف چاہے جو کچھ لکھیں گے لیکن وہ خاموش رہیں گے، مولانا محمد علی نے برجستہ جواب دیا کہ یہ مضامین اور بیانات تو آپ کو خاموش کرنے ہی کے لئے شائع کیے جا رہے ہیں۔

سید صاحب مولانا محمد علی کی وفات کے بعد ان کا ذکر برابر لطف و لذت کے ساتھ فرماتے، ان کی زندگی میں ان سے جس طرح محبت کرتے اسی طرح ان کے دل میں ان کی قدر اور خوبیاں بدستور پیوست رہیں، فرماتے، نئی تعلیم نے دو ہی سچے مسلمان غم خوار پیدا کیے ایک محمد علی اور دوسرا اقبال، دونوں میں اسلام کا حقیقی سوز تھا اور رسول رحمت ﷺ کے ساتھ سچا عشق، نئے زمانے کی جھوٹی آب و تاب اور نئے تمدن کی ظاہری چمک دک

سے ان کی آنکھیں خیرہ نہ تھیں، آفتاب اسلام کی ضیا باری کے مقابلہ میں ان کے سامنے جدید تہذیب و تمدن اور زمانہ حال کی تجدیدات کی نئی روشنی سرخشب کے مصنوعی نور سے زیادہ وقت نہیں رکھتی تھی۔

سید صاحب کو مولانا محمد علی کی وفات سے بڑا دکھ پہنچا، ان کو ایسا معلوم ہوا کہ ان کا کوئی محبوب ترین عزیز ان سے جدا ہو گیا ہے، معارف کے شذرات میں ان پر جو ماتمی تحریر لکھی ہے وہ ان کی بہترین تحریروں میں شمار کی جاسکتی ہے، اس کے کچھ حصے زیر نظر مجموعہ میں ناظرین کی نظر سے گزر چکے ہیں، کچھ اور یہ ہیں:

”تو ملت کا عزادار تھا، حق ہے کہ ساری ملت تیری عزدار ہو، تو امت محمدیہ کا سوگوار تھا، فرض ہے کہ پوری امت محمد تیرا سوگ کرے، تو نے دنیائے اسلام کا ماتم کیا تھا، سزا اور ہے کہ دنیائے اسلام تیرا ماتم کر کے، ہندوستان کا ماتم دار، طرابلس کا سوگوار عراق کے لیے غم زدہ، بلقان کے لیے اشک بار، شام پر گریاں، انگورہ پر مرثیہ خواں، حجاز کا سوختہ غم اور بیت المقدس کے لیے وقف الم، اے ہند کے آوارہ گرد مسافر تیرا حق سر زمین اسلام کے چپہ چپہ پر تھا، مناسب یہی تھا کہ تیرے لیے اولین قبلہ اسلام کا سینہ پھٹ جائے اور تو اس میں سما جائے۔“

”وہ مشرق کی زمین میں پیدا ہوا لیکن مغرب کی آب و ہوا میں نشوونما پائی، مشرق کی مٹی سے اس کا جسم بنا لیکن مغرب کے ہتھیاروں سے اس نے جسم سجایا، اس کا دماغ مغربی مگر دل مشرقی تھا، وہ مشرق کی حمایت میں بارہا مغرب سے، مغرب کے ہتھیاروں سے لڑا اور اس نے اس کا لوہا مانا، وہ مشرق کا آفتاب تھا، یہ آفتاب بھی اگر مشرق میں طلوع ہو کر مغرب میں ڈوبا تو دنیا کا کوئی نیا واقعہ نہ ہوا اور اسی لیے حق تھا کہ مشرق و مغرب کا متحدہ مرکز بیت المقدس اس کا مدفن ہو۔“

جب مولانا محمد علی چھند واڑہ میں نظر بند تھے، تو سید صاحب مولانا مسعود علی ندوی کے ساتھ ان سے جا کر ملے تھے، اس ملاقات کا ذکر مذکورہ بالا ماتمی شذرات میں اس طرح

کرتے ہیں:

”ہم لوگ ان کے بنگلہ تک پہنچے، دیکھ کر دونوں بھائی نہال ہو گئے، گلے سے لگایا، ہاتھ چومے، منہ چوما، بلائیں لیں، غرض ہر انداز کا پیار کیا، دونوں صاحبان کی زبان پر اس وقت یا قرآن کی آیتیں تھیں یا اقبال کی مثنوی کے شعر، اور چن چن، چن چن، چن چن یعنی گویا ترکی زبان بول رہے تھے، اور ترکوں کے اعلان جنگ کے بعد افغانی سرحد سے ان کے ہندوستان میں داخلہ کی پیشوائی کے یہ الفاظ تھے۔“

سید صاحب مولانا حسرت موہانی کے بہت قائل تھے، کہنے لگے کہ وہ صحیح معنوں میں نان کو آپریٹر تھے، ولایتی کپڑوں کا استعمال چھوڑا تو کبھی اس کا استعمال نہیں کیا، ایک بار ندوہ کے دفتر گولہ گنج میں ان سے ملنے کے لیے آئے تو رات کو ان ہی کے کمرے میں قیام کیا، سخت جاڑے پڑ رہے تھے، ان کے پاس بستر نہ تھا، ان کا بستر بچھا کر اس پر ایک ولایتی کمبل رکھ دیا گیا، انھوں نے سوتے وقت کمبل پر ”میڈان انگلینڈ“ لکھا دیکھا تو پھر رات بھر سردی کھاتے رہے لیکن اس کو نہیں اوڑھا، کیرکٹر کی یہ مثال مشکل سے اس زمانہ کے کسی رہنما میں ملے گی، ۱۵ مئی ۱۹۵۱ء کو ان کی وفات ہوئی تو سید صاحب نے ”وا حسرتا“ کے عنوان سے ان پر ایک طویل مضمون لکھا، جس میں ان کے حالات کے ساتھ ان کی خوبیاں دل کھول کر بیان کیں اور لکھا کہ حسرت جیسی متضاد طبیعت کا انسان شاید ہی منصفہ شہود پر آیا ہو، سیاسیات اور قید و بند کے خارزار کے ساتھ شعر و سخن کی چمن بندی اور آبیاری بہت کم ہو سکتی تھی، لیکن حسرت کے مزاج میں دونوں چیزیں جمع تھیں، اور خود حسرت کو بھی اس اجتماع ضدین پر تعجب تھا، ان کی زندگی کے واقعات پر نظر کر کے ان کی شان حضرت ابوذرؓ صحابی کی نظر آتی ہے، جن کی نسبت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ابوذرؓ سے زیادہ کسی حق گو پر آفتاب کی کرن کبھی نہیں چمکی، سچ یہ ہے کہ اس عہد پر فریب میں حسرت سے زیادہ کسی حق گو پر آفتاب کی کرن کبھی نہیں چمکی، اس طرح ابوذر کے بعد یہ قول نبوی بھی ان پر صادق

آتا ہے کہ حضرت ابوذرؓ کی حق گوئی نے ان کو زندگی میں تنہا چھوڑ دیا، ان کا کوئی ساتھی نہیں رہا اور اسی لیے اس فقرہ کا مورد بھی حسرت کی ذات تھی، عاشر فرید مات حمیدا (تنہا جیا اور ستودہ مرا)، آخر میں سید صاحب نے تحریر فرمایا:

”حسرت رخصت، تو تنہا آیا تھا، تنہا رہا، تنہا گیا، البتہ تیری نیکی، شرافت، تیرا اخلاص اور تیرے حسن عقیدت کے اعمال تیرے ساتھ ہیں اور وہی تیرے رفیق آخرت ہیں، بارالہا! اس کی حق گوئی کی نیکی کی شرم رکھ لیجئے اور اس کو اپنی رفاقت سے نوازئیے۔ وأنت الرفیق الأعلى۔“

ایک روز فرمایا کہ وہ (یعنی سید صاحب) پشاور کے کسی سیاسی جلسہ میں گئے ہوئے تھے اور علماء بھی تھے وہاں سر عبدالقیوم نے علماء کو اپنے یہاں مدعو کیا، کھانے کے بعد وہ علماء حضرات سے علاحدہ علاحدہ تنہائی میں رخصت ہوئے، ان سے بھی الوداعی مصافحہ کیا تو پانچ سو روپے کے نوٹ پیش کیے، سید صاحب نے کہا کہ یہ پانچ سو روپے قبول کرنے کو تو قبول کر لیے لیکن یہ نذرانہ گراں گزرا اس لیے یہ رقم ندوہ کو دے دی اور اس کی رسید سر عبدالقیوم کے پاس بھجوا دی۔

دہرہ دون بڑی پُر فضا جگہ ہے، خانہ باغوں کا شہر ہے، ہر طرف سبزہ اور چمن نظر آتا ہے، یوٹیکس کے درختوں کی بڑی فراوانی ہے، ان کے تنے چاندی کے کھمبے معلوم ہوتے ہیں، جو جھومتے ہیں تو ان کے جھونکوں میں صحت کے آثار بکھرتے نظر آتے ہیں، سڑکیں بڑی چوڑی اور صاف ستھری ہیں، دامن میں مسوری کی پہاڑیاں ہیں جہاں سے بجلی کے قمقمے ستاروں کی طرح جھلملاتے دکھائی دیتے ہیں، شام کو سید صاحب اپنے بچوں کے ساتھ ٹھلنے کے لیے نکلتے، میں بھی ساتھ ہوتا، اس زمانہ میں وہاں انگریز صاحبوں اور میموں کی کثرت تھی، یہ میمیں مردانہ لباس میں گھومتی پھرتیں، ان کو دیکھ کر سید صاحب نے فرمایا کہ جب کسی قوم پر زوال آتا ہے تو ان کی عورتیں مردانہ لباس اور مردانہ لباس پہننے لگتے ہیں، عبا سیوں کے زمانہ میں یہ بات عام ہو گئی تھی۔

ایک روز ہم لوگ ایک سڑک سے گزر رہے تھے کہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری ایک موٹر پر جاتے ہوئے دکھائی دیئے، سید صاحب نے مجھ سے کہا کہ معلوم نہیں کہ وہ کہاں ٹھہرے ہیں، وہ جا کر ان سے ملیں گے، دوسرے دن اخبار آیا تو ریل گاڑی میں ڈاکٹر صاحب کی حرکتِ قلب بند ہو جانے سے موت کی خبر موٹی سرخیوں کے ساتھ شائع کی گئی تھی، سید صاحب اس ملی حادثہ پر دن بھر مغموم رہے، پھر دوسرے دن ان پر پردرد و سوز شذرات لکھ کر معارف کے لیے بھیجے جس کے کچھ ٹکڑے یہ ہیں:

”وہ ہندو مسلم اتحاد کی مناد، عالم اسلام کے سفیر اور آزادی وطن کے مبلغ تھے وہ جلسوں میں بہت کم بولتے تھے مگر جب بولتے تھے تو وہ کہتے تھے جس کی صداقت دلوں میں گھر کر جاتی تھی، صداقت اور شرافت ان کا خمیر تھا، صداقت کی خاطر ان کو کبھی کبھی اپنے عزیز ترین دوستوں کا ساتھ چھوڑنا پڑا تھا اور شرافت کے سبب سے ان دوستوں کے غیظ و غضب اور جھانکشی کو پوری متانت اور سنجیدگی کے ساتھ برداشت کرتے تھے، اس کے کتنے مناظر خود میری آنکھوں کے سامنے گزرے ہیں۔“

”ان کا گھر مہمانوں کے لیے، ان کی جان دوستوں کے لیے اور ان کا مال ضرورت مندوں کے لیے وقف تھا، ناواقف ان کو دولت مند سمجھتے تھے مگر جاننے والوں کو معلوم ہے کہ کبھی کبھی ان پر ایسے دن بھی گزرے ہیں کہ قرض لے لے کر مہمان داری کا فرض انجام دیا جاتا تھا، اس حالت میں بھی قومی جلسوں کا پورا بار اپنے کندھوں پر اٹھاتے اور سیکڑوں اپنے جاننے والوں اور ناجاننے والوں کو مہمان بنائے ہوئے ہوتے تھے۔“

”وہ فیاضی کا مجسمہ، لطف و محبت کا دیوتا اور حسن اخلاق کے فرشتہ تھے، متانت اور سنجیدگی ان کی طینت اور غور و فکر ان کی عادت تھی، وہ وطن کے خدمت گار، انسانیت کے غم خوار اور اسلام کے پرستار تھے، دنیا میں اتحاد اسلامی کے

پیغامبر اور ملک میں ہندو مسلم اتحاد کے مبلغ تھے، ان کی پالیٹکس کے سولہ برسوں میں طوفان سیاست کے سینکڑوں جھونکے اٹھے اور سیاسی انقلاب خیال کے میسوں حادثے پیش آئے، مگر صداقت اور راست بازی کا یہ پہاڑ جوں کا توں اپنی جگہ جمار ہا۔“

سید سجاد حیدر یلدرم بھی اس زمانہ میں دہرہ دون میں بسلسلہ علالت مقیم تھے ان کی داستان، پاستاں، خیالستان، خوارزم شاہ پڑھ چکا تھا، ان کی بیگم صاحب نذر سجاد حیدر، تہذیب نسواں کی مستقل مضمون نگار اور بہت سے ناولوں کی بھی مصنفہ تھیں، سجاد حیدر یلدرم اپنے زمانہ کے مشہور ادیب تھے، شیخ عبدالقادر کے رسالہ مخزن میں ان کا ایک مشرقی افسانہ حقوق نسواں پر چھپا تھا، سید صاحب کا بیان ہے کہ مولانا شبلی کی زبان سے اس کی تعریف بار بار سنی وہ مولانا محمد علی جوہر کے ساتھیوں میں تھے، ام۔ اے۔ او۔ کالج سے ۱۹۰۱ء میں بی۔ اے۔ کیا، علی گڑھ کے پرنسپل مارین کی سفارش پر ترکی کے سفارت خانہ میں لے لیے گئے، ان کا تقرر بغداد میں ہو گیا، ۱۹۰۸ء میں واپس ہوئے تو دہرہ دون میں افغانستان کے بادشاہ امیر یعقوب خاں کے اسٹنٹ پولی ٹیکل آفیسر ہو گئے ۱۹۱۱ء میں ٹرکی گئے ۱۹۲۹ء میں عراق و ایران کا سفر کیا پھر انڈمان میں ریونیو کمشنر ہوئے، ۱۹۳۵ء میں پنشن پا کر دہرہ دون میں مقیم ہو گئے تھے، وہ دارالمصنفین بھی مولانا شبلی کی قبر کی زیارت کے لئے آئے تھے، سید صاحب سے تعلقات ذاتی روابط کی حد تک تھے، سید صاحب ان کی عیادت کے لئے گئے، تو میں بھی ان کے ساتھ تھا، ان کے بھائی ان کی تیمارداری کر رہے تھے، اپنی بھانج کی بد مزاجی کے شاک کی ہوئے اور کہنے لگے بھائی صاحب اپنی شرافت اور مروّت سے دبے رہتے ہیں، کہتے ہیں ان کو نہ چھیڑو جو وہ چاہیں کرنے دو، وہ شیعہ تھیں اور سجاد حیدر صاحب سنی تھے، ان کے بھائی صاحب کہنے لگے کہ دونوں میں اختلاف ہے کہ اولاد شیعہ رہے یا سنی، ان ہی کی صاحبزادی قرۃ العین ہیں جو ناول نگار کی حیثیت سے آج کل بہت مشہور ہیں، ان کی وفات لکھنؤ میں ۱۲/۱۲/۱۹۴۳ء کو ہوئی تو سید صاحب نے معارف

کے شذرات میں لکھا کہ وہ علی گڑھ کالج کے پرانے تعلیم یافتوں اور اسی تعلق سے کالج کے ان چند طالب علموں میں تھے جنہوں نے مولانا شبلیؒ کے درس اور صحبت سے شعروادب کا ذوق حاصل کیا تھا، مرحوم مولانا کے درس کے اس قسم کے واقعات کو مزے لے کر بیان کرتے تھے، آخر میں سید صاحب نے لکھا سجاد حیدر یلدرم ہماری زبان میں ایک نئی صنفِ ادب کے جس کو ادبِ لطیف کہتے ہیں بانی تھے اس لیے ہماری ادبی تاریخ میں ان کا ایک پایہ ہے، وہ کئی ادبی افسانوں کے مصنف اور ترکی ناولوں کے مترجم ہیں، وہ بڑے متواضع، مرنجاں مرنج، ہنس مکھ، شگفتہ دل، بذلہ سنج اور شریف و نرم خو تھے، ان کے دوستوں کو ان کی بہت یاد آئے گی۔

## حضرت سید صاحبؒ اور ڈاکٹر اقبالؒ

مجھ کو دارالمصنفین کے احاطہ میں اسی مکان میں رہنے کا فخر حاصل ہے جس میں استاذی المحترم حضرت سید سلیمان ندویؒ اپنے اہل و عیال کے ساتھ رہا کرتے تھے، اس لیے وہ میری نگاہوں میں ہر لمحہ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے اور ہنستے بولتے نظر آتے ہیں، اس مکان سے نکل کر جب دارالمصنفین کے کتب خانہ میں آتا ہوں تو ان کی وہ میز رکھی ہوئی نظر آتی ہے جس پر وہ بیٹھ کر تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے تھے، اس میز کے سامنے کھڑا ہوتا ہوں تو خیال آتا ہے معلوم نہیں اس پر سے اسلامی علوم و فنون کے کتنے سرچشمے پھوٹے اور بہے، پھر یکا یک ڈاکٹر اقبالؒ نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں جنہوں نے ان کے متعلق یہ فرمایا تھا کہ:

”علوم اسلام کی جوئے شیر کا فرہاد آج ہندوستان میں سوائے سید سلیمان ندویؒ

کے اور کون ہے۔“ (اقبال نامہ، ص ۱۶۶ مورخہ ۴ ستمبر ۱۹۳۳ء)

پھر وہ ساری باتیں یاد آجاتی ہیں جو ڈاکٹر صاحب ان کو اپنے خطوط میں لکھتے رہے تھے، اس طرح دونوں ایک ساتھ نظروں کے سامنے آجاتے ہیں، دونوں اپنے اپنے فن کے لحاظ سے یگانہ روزگار تھے، لیکن اپنی محبت اور عقیدت میں ایک دوسرے کے سامنے سر تسلیم خم کرنے میں لذت محسوس کرتے جو دونوں کی پاک طینت اور بلند سرشت کی دلیل ہے، سید صاحب ڈاکٹر صاحب کی شاعری کے معترف تھے، تو ڈاکٹر صاحب نے ان کی نثر نگاری کی داد یہ لکھ کر دی ہے:

”معارف مجھے خاص طور پر محبوب ہے اور بالخصوص آپ کے مضامین کے لیے، کہ آپ کی نثر معانی سے معمور ہونے کے علاوہ لٹریچر کی خوبیوں سے مالا مال ہوتی ہے۔“ (اقبال نامہ ص ۱۲۶، یکم فروری ۱۹۲۳ء)

سید صاحب کے اونچے مقام کا اعتراف اس طرح کرتے ہیں:

”آپ قلندر ہیں، مگر وہ قلندر، جس کی نسبت اقبال نے یہ کہا ہے:

قلندر ان کہ براہ تو سخت می کوشند  
ز شاہ باج ستانند و خرقة می پوشند  
مخلوت اندو کمندے بہ مہر و ماہچند  
مخلوت اندو زمان و مکان در آغوشند  
دریں جہاں کہ جمال تو جلوہ ہا دارد  
ز فرق تابہ قدم دیدہ و دل و گوشند  
بروز بزم سراپا چو پر نیاں و حریر  
بروز بزم خود آگاہ و تن فراموشند

”آپ اس جماعت کے پیش خیمہ ہیں، اس جماعت کا دنیا میں عنقریب پیدا ہونا قطعی اور یقینی ہے۔“ (اقبال نامہ ص ۱۳۹-۱۴۰، مورخہ ۵ ستمبر ۱۹۲۳ء)۔

پھر اپنی جلالت اور اسلامی علوم و فنون میں غیر معمولی بصیرت کا خیال کیے بغیر سید صاحب کو پورے عجز و انکسار کے ساتھ تحریر فرماتے ہیں:

”اگر میری نظر اس قدر وسیع ہوتی جس قدر آپ کی ہے تو مجھے یقین ہے کہ اسلام کی کچھ خدمت کر سکتا۔“ (اقبال نامہ ص ۱۵۱، مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۲۶ء)

حضرت سید صاحب بھی ڈاکٹر صاحب کی عظمت و فضیلت کے بار سے دبے نظر آتے ہیں، ان کی نظر میں ڈاکٹر صاحب موحد خالص، رسول کے شیدائی، دین کامل کے علم بردار، فلسفہ اسلام کے ترجمان، تجدید ملت کے طلب گار تھے، ڈاکٹر صاحب سند یافتہ عالم

نہ تھے لیکن سید صاحب نے ان کو اونچا مقام یہ لکھ کر دیا ہے کہ وہ جدید علم کلام کے بانی قرار دیئے جاسکتے ہیں، اور اس کو اپنے ایک مضمون ”ڈاکٹر اقبال کا علم کلام“ میں ثابت کر دکھایا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر اقبال نے توحید باری کی بنیاد کو عملی اتحاد پر رکھا ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ اسلام نے توحید پر جو غیر معمولی زور دیا ہے اس کا مقصد مسلمانوں میں صرف اتحادِ عمل پیدا کرنا تھا، اگر آج مسلمانوں میں اتحادِ عمل نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ان میں توحید، کم از کم کامل توحید کے ماننے والے نہیں ہیں، علم کلام کا ایک متداول مسئلہ یہ ہے کہ خدا کسی جہت میں نہیں۔

سید صاحب رقم طراز ہیں کہ ڈاکٹر اقبال نے اس خشک مسئلہ کو اپنے شاعرانہ زور بیان سے ایک نہایت پر جوش عمل مسئلہ بنا دیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ دنیا و آخرت میں جو کچھ ہے وہ انسان کے زور بازو کا نتیجہ ہے، اس لئے جس طاقت نے انسان جیسی پر زور طاقت پیدا کی ہے اس کا مرتبہ تو اس سے کہیں بالاتر ہوگا، عدم رویت باری بھی علم کلام کا مسئلہ ہے، اشاعرہ رویت باری کے قائل اور معتزلہ اس کے منکر ہیں لیکن دونوں کا طرز استدلال بالکل عقلی ہے جس سے جذبات اور قوتِ عمل کو کوئی تحریک نہیں ہوتی، سید صاحب کہتے ہیں کہ ڈاکٹر اقبال نے اس مسئلہ میں معتزلہ کا عقیدہ اختیار کیا ہے لیکن یہاں بھی انھوں نے انسان کے شرف اور اس کی قوتِ عمل کے مظاہرے کو نظر انداز نہیں کیا ہے بلکہ وہ کہتے ہیں کہ دنیا کے سپید و سیاہ، دریا و کوہ، دشت و در اور مہر و ماہ سب انسان نے پیدا کیے، یا یہ کہ انسان کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، اس لیے وہ ان ہی چیزوں کا گرویدہ و شیدائی ہے لیکن بلند ہمتی کا اقتضاء یہ ہے کہ نگاہ کو اس سے بھی زیادہ بلند کیا جائے اور اس ذات کی تلاش کی جائے جو نگاہ کی گرفت میں نہیں آسکتی، علم کلام میں نبوت کا اثبات معجزات کے ذریعہ سے کیا جاتا ہے، سید صاحب کہتے ہیں کہ ڈاکٹر اقبال کے نزدیک ایک قوم کا پیدا کرنا نبوت کا سب سے بڑا معجزہ ہے، ساحروں اور شعبدہ بازوں سے اگرچہ بہت سے حیرت انگیز واقعات سرزد ہو سکتے ہیں، لیکن آج تک کسی ساحر اور شعبدہ باز نے کسی قوم کو پیدا نہیں کیا ہے، علم کلام میں

معراج ایک خشک اور بے اثر مسئلہ تھا لیکن سید صاحب کا خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اس کے ذریعے سے مسلمانوں کو روحانی طاقت کی نشوونما اور بلند ہستی کا سبق دیا ہے، وحی والہام بھی علم کلام کا مسئلہ ہے، سید صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ ڈاکٹر اقبال کے نزدیک برے بھلے کی تمیز صرف عقل سے نہیں ہو سکتی ہے بلکہ اس کے لیے وحی والہام کی ضرورت ہوتی ہے، ذوقی چیزوں کی تمیز میں عقل بالکل بیکار ہو جاتی ہے، صاف اور شفاف پانی کو دیکھ کر صرف عقل یہ فیصلہ نہیں کر سکتی کہ وہ شور ہے یا شیریں، اس کا فیصلہ صرف ذوق کر سکتا ہے، اسی طرح بہت سے افعال کے حسن و قبح کا فیصلہ بھی عقل نہیں کر سکتی، بلکہ خود زندگی ہی یہ فیصلہ کر سکتی ہے کہ کون سے افعال زندگی کے لیے موزوں ہیں اور کون سے غیر موزوں، اسی ذوقی احساس کا نام وحی یا الہام ہے، خیر و شر کا مسئلہ بھی علم کلام کا ہے، سید صاحب کی رائے میں ڈاکٹر صاحب اس خیال کے نہیں کہ انسان میں پیغمبرانہ اور ساحرانہ قوتیں اگرچہ مساوی مقدار میں ہیں لیکن پیغمبرانہ طاقت میں جو نتائج بد پیدا ہوتے ہیں انسان قوت خیر سے اس کی تلافی کر دیتا ہے، مسئلہ تقدیر بھی کلامی مسئلہ ہے، سید صاحب لکھتے ہیں کہ کچھ لوگ تمام اعمال و عبادات چھوڑ بیٹھتے ہیں کہ دوزخ و جنت جو بھی تقدیر میں لکھی جا چکی ہے وہ تو لازمی طور پر ملے گی اس لیے اعمال و عبادات سے کیا فائدہ؟ لیکن ڈاکٹر اقبال نے بتایا کہ یہ خیال انسان کے عمل شرف کو کھو دیتا ہے اور اس کو نباتات و جمادات کی صف میں کھڑا کر دیتا ہے، آخر میں سید صاحب لکھتے ہیں کہ اس قسم کے اور بھی بہت سے مسائل ہیں جن پر ڈاکٹر اقبال نے شاعرانہ انداز میں بحث کی ہے، اگر ان سب کو جمع کیا جائے تو ایک نیا علم کلام مرتب ہو سکتا ہے، بالخصوص رموز بے خودی میں انھوں نے خاص طور پر اسی قسم کے مسائل کی تشریح کی ہے، مثلاً سب سے پہلے انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ جب تک تمام افراد باہم منظم و مدغم ہو کر ایک متحدہ قومیت کی شکل نہ اختیار کر لیں، اس وقت تک فرد و قوم دونوں کا نظام ابتر رہے گا (۱)۔

سید صاحب ڈاکٹر صاحب کو فلسفہ اسلام کا ترجمان اور کاروان ملت کا حدی خواں بھی سمجھتے رہے جیسا کہ آگے ذکر آئے گا، اب اس مضمون میں جوئے شیر علوم اسلامیہ کے فرہاد اور اسلام کے متکلم، فلسفی اور مشرق کی عزت و آبرو کے تعلقات کی جھلکیاں دکھانے میں مجھ کو جولدت محسوس ہوئی ہے، وہی امید ہے کہ ناظرین کو بھی ملے گی۔

ڈاکٹر اقبال کو سید صاحب سے شروع ہی سے قلبی لگاؤ رہا، اس لیے ۱۹۱۶ء میں اورینٹل کالج لاہور میں فارسی کے ایک استاد کی جگہ خالی ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نے ان کو لکھا کہ اگر وہ اس جگہ کو پسند فرمائیں تو قبول کر لیں کیوں کہ ان کا لاہور میں رہنا پنجاب والوں کے لیے مفید ہوگا حضرت سید صاحب نے دارالمصنفین سے علاحدہ ہونا پسند نہیں فرمایا اور جب انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو یہ لکھ کر بھیجا تو ڈاکٹر صاحب نے ان کو دعائیں دیں کہ اللہ تعالیٰ دارالمصنفین کے کام میں برکت دے، اور ان کا وجود مسلمانوں کے لیے مفید ثابت کرے (۱۲/نومبر ۱۹۱۶ء) اور پھر ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں کہ جو کام وہ کر رہے ہیں، جہاد فی سبیل اللہ ہے، اللہ اور اس کے رسول ان کو اس کا اجر عطا فرمائیں گے (۱۳/نومبر ۱۹۱۶ء)۔

۱۹۱۸ء میں ڈاکٹر صاحب کی مشہور کتاب رموز بے خودی شائع ہوئی تو انھوں نے حضرت سید صاحب کو اس کا ایک نسخہ بھیجا جس کو پڑھ کر حضرت سید صاحب بہت متاثر ہوئے اور جس کو پڑھ کر انھوں نے اپنے تاثرات کا اظہار اپریل ۱۹۱۸ء کے معارف میں ایک طویل ریویو میں کیا، جس میں انھوں نے تحریر فرمایا کہ مولوی رومی نے سات دفتروں میں سات آسمانوں کے خزانے یکجا کر دیئے اس لیے اہل معنی میں اس کی بے انتہا مقبولیت ہوئی، ضرورت تھی کہ ہمارے اہل دل شعراء مثنوی مولوی روم کا ایک دوسرا نسخہ ہمارے لیے تیار کر دیں، شعراء کے حال میں ڈاکٹر اقبال کو اللہ تعالیٰ نے اس ضرورت کے لیے جن لیا، انھوں نے اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر دو مثنویاں لکھیں، اسرار خودی اور رموز بے خودی، ان دونوں مثنویوں کا موازنہ کرتے ہوئے حضرت سید صاحب نے لکھا کہ رموز بے خودی میرے خیال میں زبان کے لحاظ سے اسرار خودی سے بہتر ہے اور اصل معنی کے لحاظ سے

دونوں میں یہ فرق ہے کہ اس میں مظاہر سیاست بیشتر اور اس میں مذہب کے عناصر زیادہ ہیں لیکن منزل مقصود ایک ہے، اسی سلسلہ میں سید صاحب رقم طراز ہیں کہ:

”اس وقت مسلمانوں میں دوبارہ زندگی پیدا کرنے کی جوتدبیریں اختیار کی جا رہی ہیں، ان میں حکمائے ملت مسلمانوں کے مزاج قومی کی تشخیص نہیں کرتے، مسلمانوں کے قومی مزاج کو جن لوگوں نے پہچانا ہے وہ صرف تین شخص ہیں، مولانا شبلیؒ نے آخری تین سال کے کلام میں، مولانا ابوالکلام نے مجلدات الہلال میں اور ڈاکٹر اقبال نے اپنی مثنویوں میں اور اب معلوم ہوتا ہے کہ یہ راستے اوروں پر بھی مکشوف ہو رہے ہیں۔“

حضرت سید صاحب رموز بے خودی کی جا بجا تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس مثنوی کے اکثر ابواب میں مذہبی حقائق فلسفیانہ تشریح کے ساتھ صوفیانہ رنگ میں شعر بنتے چلے گئے ہیں، علاوہ ازیں ڈاکٹر اقبالؒ نے اس میں جو اسرار اور نکات حل کیے ہیں ان کی بنیاد پر یہ مثنوی نہ صرف شاعری اور فن قومیات کا ایک رسالہ ہے بلکہ ہمارے خیال میں جدید کلام کی ایک بہترین کتاب ہے، اس کے اندر توحید کا ثبوت، رسالت کی ضرورت، قرآن پر ایمان رکھنے کا سبب، قبلہ کی حاجت وغیرہ اور اعتقادی مسائل پر نہایت پُر اثر اور تشفی بخش دلائل موجود ہیں۔

حضرت سید صاحبؒ نے اس مثنوی کی زبان پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، ریویو کے آغاز میں انھوں نے لکھا ہے کہ ”ابتداء سے ڈاکٹر اقبالؒ کی زبان اشکال پسند اور ترکیب آفریں واقع ہوئی ہے کبھی کبھی سہل پسندی کے ثبوت کے لیے انھوں نے رواں اور آسان زبان میں نظمیں لکھیں لیکن پھر وہ ڈاکٹر اقبال کے اشعار نہ رہے، بلکہ ان کی حیثیت ایک عام اردو شاعر کے خیالات موزوں کی رہ گئی،“ آگے چل کر سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ زبان کے لحاظ سے میں ڈاکٹر اقبالؒ کو ان شعراء میں گنتا ہوں جو معنوی محاسن اور باطنی خوبیوں کے مقابلہ میں الفاظ اور محاوروں کی ظاہری صحت کی پروا نہیں کرتے، لیکن حق یہ

ہے کہ اس کی ایک لغزش مستانہ پر ہزاروں سنجیدہ اور متین رفتاریں قربان ہیں، مصرعوں کی در دبست اور فصل واصل میں قصور ممکن ہے لیکن یہ ناممکن ہے کہ جو مصرعہ ڈاکٹر اقبال کی زبان سے نکل جائے وہ تیر و شتر بن کر سننے والوں کے دل و جگر میں نہ اتر جائے، شاید اس کا سبب یہی ہے کہ ڈاکٹر اقبال اپنے مخاطب کے احساسات پر مذہب، فلسفہ، تصوف اور شاعری ہر راہ سے حملہ کرتے ہیں، اس لیے اختلاف مذاق کے باوجود ان مختلف راہوں میں سے کسی ایک سے بھی بچ کر نہیں نکل سکتا،“ آخر میں حضرت سید صاحب تحریر فرماتے ہیں:

”ایک بالغ نظر اس مثنوی میں الفاظ کی صحت یا صحیح فارسی معنی میں ان کے استعمال میں شک اور بعض فارسی محاوروں کی گرفت کر سکتا ہے لیکن اصل یہ ہے کہ اقبالؒ کے شاعرانہ خیالات میں اتنی تیز روانی ہے کہ خس و خاشاک اس کی خوبی و لطافت میں مزاحم نہیں ہو سکتے، اس لیے اس تقریظ میں ان کی طرف توجہ نہیں کی گئی، نکتہ چینی اور حرف گیری بہت ہو چکی اب کچھ سوچنا اور سمجھنا بھی چاہیے اور یہی اس مثنوی کا اہم المطالب ہے۔“

معارف کا یہ ریویو ڈاکٹر اقبال کی نظر سے گزرا تو اپنی فراخ دلی، سیر چشمی اور بلند نظری کی بنا پر حضرت سید صاحبؒ کو لکھا کہ ”آپ کا ریویو نظر سے گزرا ہے، جس کے لیے سراپا سپاس ہوں، آپ نے جو کچھ فرمایا وہ میرے لیے سرمایہ افتخار ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے، اور پھر حضرت سید صاحبؒ نے ان کی زبان کی متعلق جو کچھ اشارہ کیا تھا اس سے اختلاف یا تکدر کا اظہار کرنے کے بجائے یہ تحریر کیا کہ ”صحت الفاظ و محاورات کے متعلق نے جو کچھ آپ نے لکھا ہے ضرور صحیح ہوگا لیکن اگر آپ ان لغزشوں کی طرف بھی توجہ فرماتے تو میرے لیے آپ کا ریویو زیادہ مفید ہوتا، اگر آپ نے غلط الفاظ و محاورات نوٹ کر رکھے ہیں تو مہربانی کر کے مجھے ان سے آگاہ کیجیے تاکہ دوسرے ایڈیشن میں ان کی اصلاح ہو جائے، غالباً آپ نے رموز بے خودی کے صفحات پر ہی نوٹ کیے ہوں گے، اگر ایسا ہو تو وہ کاپی ارسال فرما دیجئے، میں دوسری کاپی اس کے عوض بھیجوا دوں گا، اس تکلیف کو



احسان تصور کروں گا۔“ (مورخہ ۱۰ مئی ۱۹۱۸ء)

ان سطروں میں کتنی خاکساری اور فروتنی تھی، حضرت سید صاحبؒ کئی مہینے تک ڈاکٹر اقبال کے تسامحات کی نشاندہی کرنے سے گریز کرتے رہے لیکن ڈاکٹر اقبال کا اصرار بڑھا تو انھوں نے ان فروگزاشتوں کی طرف توجہ دلائی، افسوس ہے کہ حضرت سید صاحبؒ کے وہ مکاتیب سامنے نہیں ہیں جو انھوں نے ڈاکٹر اقبال کو لکھے لیکن اقبال نامہ میں ڈاکٹر صاحبؒ کے جو خطوط ہیں ان کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت سید صاحب نے جن تسامحات کی طرف توجہ دلائی تھی ان میں اکثر و بیشتر سے ڈاکٹر اقبال کو اتفاق نہ تھا اور انھوں نے بہت سے اساتذہ کی سند پیش کر کے سید صاحب کو مطمئن کرنے کی کوشش کی ہے اور غالباً سید صاحب بھی مطمئن ہو گئے تھے لیکن ڈاکٹر اقبالؒ اپنی عالی ظرفی سے ان کو برابر لکھتے رہے کہ میری خامیوں سے ضرور ضرور آگاہ کیا کیجیے، آپ کو زحمت تو ہوگی لیکن مجھے فائدہ ہوگا، (مورخہ ۳ اپریل ۱۹۱۹ء)۔

اور پھر اپنی شاعری کی سطح نظر کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ”شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کے کبھی میرا مطمع نظر نہیں رہا، کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لیے وقت نہیں، مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو، اور بس، اس بات کو مد نظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں، کیا عجب کی آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں۔“ (۱۰ اکتوبر ۱۹۱۹ء) اور پھر اپنی عالی ظرفی اور خاکساری کا ثبوت یہ لکھ کر دیتے ہیں کہ میرے افکار اس قابل نہیں کہ ان کی تنقید کے لیے سید سلیمان ندوی کا دل و دماغ صرف ہو، لیکن اگر احباب تبصرہ پر مصر ہیں تو یہی بہتر ہے کہ مجموعہ کا انتظار کیا جائے، اس کے علاوہ میں اپنے دل و دماغ کی سرگذشت مختصر طور پر لکھنا چاہتا ہوں اور یہ سرگذشت کلام پر روشنی ڈالنے کے لیے نہایت ضروری ہے، مجھے یقین ہے کہ جو خیالات اس وقت میرے کلام اور افکار کے متعلق لوگوں کے دلوں میں ہیں، اس تحریر سے ان میں بہت انقلاب پیدا

ہوگا، (۱۰ اکتوبر ۱۹۱۹ء) غالباً ایسی کوئی تحریر ڈاکٹر اقبالؒ کی قلم سے نکلنے نہ پائی۔

حضرت سید صاحبؒ اور ڈاکٹر اقبالؒ کی یگانگت و موانست بڑھتی گئی اور دونوں باہمی قلبی لگاؤ رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے علمی قدردان بھی ہو گئے، حضرت سید صاحبؒ ۱۹۲۰ء میں وفد خلافت سے سفر یورپ سے واپس آئے تو ڈاکٹر صاحب نے ان کو لکھا ”آپ نے بڑا کام کیا جس کا صلہ قوم کی طرف سے شکرگزاری کی صورت میں مل رہا ہے اور دربار نبوی سے نہ معلوم کس صورت میں عطا ہوگا۔“ (۱۰ اکتوبر ۱۹۲۰ء)۔ پھر حضرت سید صاحب نے اسی سال ان کو اپنی کتاب سیرت عائشہؓ بھیجی تو ڈاکٹر صاحب نے ایک مکتوب میں لکھا ”سیرت عائشہؓ کے لیے سراپا سپاس ہوں، یہ ہدیہ سلیمانی نہیں، سرمہ سلیمانی ہے، اس کتاب کو پڑھنے سے میرے علم میں بہت مفید اضافہ ہوا، خدا تعالیٰ جزائے خیر دے۔“ (۲۳ دسمبر ۱۹۲۰ء)

۱۹۲۱ء میں ڈاکٹر اقبالؒ کی اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر نکلسن نے کیا تو اس ترجمہ پر سید صاحبؒ نے ایک تقریظ مارچ ۱۹۲۱ء کے معارف میں شائع کی جس میں وہ لکھتے ہیں ”اقبالؒ کی زبان غالباً بیس برس سے ہندوستان میں زمزمہ پرداز ہے، ہمارے نوجوان کے کان اس کی سامعہ نوازی سے بہت کچھ لذت گیر ہوئے ہیں لیکن اب تک اس کی قدردانی کا کافی صلہ مصنف کو ہم نے ادا نہیں کیا۔“ اسی زمانہ میں سید صاحب یورپ کے سفر سے واپس ہوئے تھے، اس لیے لکھتے ہیں کہ ”پیرس میں جب ہماری ملاقات ذکاء الملک سابق وزیر تعلیمات ایران اور علامہ محمد عبدالوہاب قزوینی (مشہور ایرانی عالم اور صاحب قلم) سے ہوئی اور امام اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کا ذکر آیا تو ہم نے اقبالؒ کے فلسفے کا ذکر کیا اور محترم محمد علی نے رموز بے خودی اور اسرار خودی کا اپنا نسخہ ان کے مطالعہ کو عنایت کیا، وہ دیکھ کر بے حد محظوظ ہوئے، اس وقت مجھے نظر آیا کہ ان کی فارسی زبان نے ان کے دائرہ اثر کو کتنا بڑھا دیا ہے۔“ پروفیسر نکلسن نے اسرار خودی کی نظم کا ترجمہ نظم کے بجائے نثر میں کر دیا ہے، سید صاحب نے اس پر اپنے خیالات کا اظہار

کرتے ہوئے لکھا کہ اس سے ڈر ہے کہ شاعری کی لطافت دور ہو کر یہ مثنوی دوسری زبانوں میں فلسفہ کی کوئی بوجھل کتاب نہ بن جائے۔

۱۹۲۲ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں ڈاکٹر اقبال نے اپنی مشہور نظم ”خضر راہ“ پڑھ کر سنائی تو یہ نظم چھپ کر عام نہیں ہونے پائی تھی کہ حضرت سید صاحب نے اس کے کچھ بند مئی ۱۹۲۲ء کے معارف میں شائع کئے اور اس پر شروع میں جو تحریک لکھی اس کے کچھ حصے یہ ہیں:

”ڈاکٹر اقبالؒ کی یہ نظم گو جوش بیان میں ان کی پچھلی نظموں سے کم ہے لیکن اسی حیثیت سے تعقید اور فارسیت میں بھی کمی ہے، ان کی شاعری کا اصلی جوہر فلسفہ اور تخیل کی مصالحانہ آمیزش ہے اور ان کی یہ خصوصیت اس نظم میں بھی نمایاں ہے، دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ ڈاکٹر اقبالؒ نے جب یہ نظم جلسہ میں پڑھنا شروع کی تو مجلس پر ایک سماں بندھ گیا، اکثر مصرعوں پر سامعین کی آنکھوں میں آنسو بھرا آئے لیکن نظم کے دو مصرعوں نے خود شاعر کی آنکھوں کو اشکبار کر دیا:

بیچتا ہے ہاشمی ناموس دین مصطفیٰ

ہو گیا مانند آب ارزاں مسلمان کا لہو

اور پھر سید صاحبؒ نے لکھا کہ ہم کو اس نظم کے جس شعر نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ یہ ہے کہ:

لے گئے تثلیث کے فرزند میراث خلیل

خشت بنیاد کلیسا بن گئی خاک حجاز

ڈاکٹر اقبالؒ کی یہ نظم ایسی ہے کہ اس کی شرح لکھنی چاہیے۔

اور جب یہ تحریر ڈاکٹر اقبالؒ کی نظر سے گزری تو انھوں نے حضرت سید صاحبؒ کو لکھا کہ ”خضر راہ“ کے متعلق آپ نے جو نوٹ لکھا اس کا شکریہ قبول فرمائیے، جوش بیان کے متعلق آپ نے جو نوٹ لکھا ہے وہ صحیح ہے، مگر جو نقص اس نظم کے لیے ضروری تھا (کم از

کم میرے خیال میں) جناب خضر کی پختہ کاری، ان کا تجربہ اور واقعات و حوادث عالم پر ان کی نظر، ان سب باتوں کے علاوہ ان کا انداز طبیعت جو سورہ کہف سے معلوم ہوتا ہے اس بات کا مقتضی تھا کہ جوش اور تخیل کو ان کے ارشادات میں کم دخل ہو، اس نظم کے بعض بند میں نے خود نکال دیئے اور محض اس وجہ سے کہ ان کا جوش بیان بہت بڑھا ہوا تھا اور جناب خضر کے انداز طبیعت سے موافقت نہ رکھتا تھا، یہ بند اب کسی اور نظم کا حصہ بن جائیں گے۔ (۲۹ مئی ۱۹۲۲ء) ان سطروں سے اقبالؒ کی بالغ نظری اور باریک بینی کا صحیح اندازہ ہوگا۔

پھر معارف کی اسی اشاعت میں حضرت سید صاحبؒ نے ڈاکٹر اقبالؒ کی ”پیام مشرق“ کی ترتیب کی خبر یہ لکھ کر دی کہ ”ہم ناظرین کو ایک اور خوش خبری سنانا چاہتے ہیں، ڈاکٹر اقبالؒ ملک کے ان پرشور ایام میں خاموش نہیں رہے ہیں، جرمنی کے ایک شاعر گوئے نے اپنے جس مجموعہ اشعار کا نام مشرقی دیوان رکھا ہے، مغرب کا مشرق پر اب تک یہ قرض چلا آتا تھا، ہمارا مشرقی شاعر اب اس قرض کے بار سے مشرق کو سبکدوش کرنا چاہتا ہے، جب ڈاکٹر صاحب کے والا نامہ سے معلوم ہوا کہ انھوں نے گوئے کے جواب میں فارسی اشعار کا ایک مجموعہ لکھا ہے جو عنقریب شائع ہوگا، اس کے دیباچہ میں ڈاکٹر اقبالؒ یہ دکھائیں گے کہ فارسی لٹریچر نے جرمن لٹریچر پر کیا اثر ڈالا ہے، ابھی گذشتہ اور نیٹل کانفرنس کلکتہ میں ڈاکٹر جیون جی جمشید نے تقریباً اس موضوع پر ایک مضمون پڑھا تھا، امید ہے کہ ڈاکٹر اقبالؒ کا قلم ان سے زیادہ سیراب کن ہوگا“، ڈاکٹر صاحبؒ نے یہ تحریر پڑھی تو حضرت سید صاحبؒ کو لکھا کہ، ”پیام مشرق پر جو نوٹ آپ نے معارف میں لکھا ہے، اس کے لیے سراپا سپاس ہوں، پروفیسر نکلسن کا خط آیا ہے، انھوں نے اسے بہت پسند کیا ہے، مگر میرے لیے آپ کی رائے پروفیسر نکلسن کی رائے سے زیادہ قابل افتخار ہے۔“ (۵ جولائی ۱۹۲۲ء)

اقبال نامہ میں حضرت سید صاحب کے نام سے ڈاکٹر صاحب کے جو خطوط ہیں ان کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب علم و فلسفہ کے پہاڑ اور سمندر بنتے چلے جا رہے تھے لیکن کسی حال میں بھی اپنے علم کی بلندی اور گہرائی کا اظہار پسند نہیں کرتے تھے،

بلکہ جب ضرورت ہوئی تو اپنی عالم گیر شہرت اور عظمت کا خیال کئے بغیر حضرت سید صاحب سے علمی و مذہبی استفسارات کرنے میں مطلق نہیں ہچکچاتے تھے، انھوں نے جو سوالات کیے ہیں ان کو سنہ وار مرتب کر دیا جائے تو ان سے ان کے ذہنی تجسس اور تفحص کے ساتھ ان کے ذہنی ارتقاء کا بھی اندازہ ہوگا، اسی غرض سے یہ تمام استفسارات یہاں پر درج کئے جا رہے ہیں۔

”دریافت طلب امر یہ ہے کہ موکلین و کلاء کے پاس جب مقدمات کی پیشی کے لیے آتے ہیں تو ان میں سے بعض پھل، پھول، مٹھائی کی صورت میں ہدیہ لے آتے ہیں، یہ ہدایا فیس مقررہ کی علاوہ ہوتے ہیں اور وہ لوگ اپنی خوشی سے لاتے ہیں، کیا یہ مال مسلمان کے لیے حلال ہے؟“ (۱۰ نومبر ۱۹۱۹ء)

”یہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ حمیرا والی سب احادیث موضوعات میں ہیں، کیا کلمینی یا حمیرا“ بھی موضوع ہے، کمال کا شعر کیا مزے کا ہے:

اِس تصرف ہائے من در شعر من  
کلمینی یا حمیرائے من است

(۲۳ دسمبر ۱۹۲۰ء)

”کیا حکمائے صوفیہ اسلام میں کسی نے زمان و مکان کی حقیقت پر بحث کی ہے؟“ (۵ اکتوبر ۱۹۲۱ء)

”دو باتیں دریافت طلب ہیں (۱) متکلمین میں سے بعض نے علم مناظرہ و مرایا کی رو سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خدا تعالیٰ کی رویت ممکن ہے، یہ بحث کہاں ملے گی، میں اس مضمون کو دیکھا چاہتا ہوں، (۲) مرزا غالب کے اس شعر کا مفہوم آپ کے نزدیک کیا ہے؟

ہر کجا ہنگامہ عالم بود رحمتہ للعالمین ہم بود

حال کے ہیئت داں کہتے ہیں کہ بعض سیاروں میں انسانوں سے اعلیٰ تر مخلوق کی

آبادی ممکن ہے، اگر ایسا ہے تو رحمتہ للعالمین کا ظہور وہاں بھی ضروری ہے، اس صورت میں کم از کم محمدیت کے لیے تنازع یا برد نہ لازم آتا ہے، شیخ اشراق تنازع کی ایک شکل میں قائل تھے ان کے عقیدہ کی وجہ یہی تو نہ تھی؟“ (۲۰ اپریل ۱۹۲۲ء)

”مردانِ خدا خدا نباشد لیکن ز خدا جدا نباشد  
کس کا شعر ہے؟ ایک امر کے لئے اس کی تحقیق ضروری ہے، ممکن ہے آپ کی نظر میں کسی تذکرہ میں یہ شعر گزر رہا ہو“۔ (۳ اگست ۱۹۲۲ء)

”مولانا حکیم برکات احمد صاحب بہاری ثم ٹوکی کا رسالہ تحقیق زمان مطبوعہ ہے یا قلمی؟ اگر قلمی ہے تو کہاں سے عاریۃ ملے گا، علی ہذا القیاس مولانا شاہ اسماعیل کی عبقیات، قاضی محبت اللہ کی جو ہر الفرد اور حافظ امان اللہ بنارس کی تمام تصانیف کہاں سے دستیاب ہوں گی، جن کتابوں کا آپ نے اپنے والا نامہ میں ذکر فرمایا ہے، کیا آپ کے کتب خانہ دارالمصنفین میں موجود ہیں؟ اگر ہوں تو میں چند روز کے لیے ہیں حاضر ہو جاؤں اور آپ کی مدد سے ان میں سے بعض کو دیکھ سکوں، حضرت ابن عربی کے بحث زمان کا ملخص اگر عطا ہو جائے تو بہت عنایت ہوگی“۔ (۲۲ اگست ۱۹۲۲ء)

”آپ حضرت اولیس اور ان تمام صوفی روایات کے متعلق جو ان سے منسوب ہیں، پکا خیال رکھتے ہیں، اگر امام مالک کی تحقیق زیر نظر ہو تو ازراہ عنایت حوالے سے آگاہ فرمائیے گا“۔ (۲۳ جنوری ۱۹۲۳ء)

”مسلمانوں نے منطق استقرائی پر جو کچھ لکھا ہے اور جو اضافے انھوں نے یونانیوں کے منطق پر کیے، اس کے متعلق میں کچھ تحقیق کر رہا ہوں، میں آپ کا نہایت شکر گزار ہوں گا، اگر ازراہ عنایت اپنی وسیع معلومات میں سے مجھے مستفیض فرمائیں، کم از کم ان مقالوں کے نام تحریر فرمائیے جن کو پڑھنا ضروری ہے“۔ (یکم فروری ۱۹۲۳ء)

”کیا روسی مسلمانوں میں بھی ابن تیمیہ اور محمد بن عبد الوہاب نجدی کے حالات کی اشاعت ہوئی تھی؟ اس کے متعلق آگاہی کی ضرورت ہے، مفتی عالم جان جن کا حال میں

انتقال ہو گیا ہے ان کی تحریک کی اصل غایت کیا تھی؟ کیا یہ محض تعلیمی تحریک تھی یا اس کا مقصود ایک مذہبی انقلاب بھی تھا؟ تکلیف دہی کے لیے معافی چاہتا ہوں اور یہ بھی التماس کرتا ہوں کہ اس عریضہ کا جواب جہاں تک ہو سکے جلد دیجیے۔“ (یکم مئی ۱۹۲۲ء)

”حال میں امریکہ کی مشہور یونیورسٹی کولمبیا نے ایک کتاب شائع کی ہے، جس کا نام ”مسلمانوں کے نظریہ متعلقہ مالیات“ ہے، اس کتاب میں لکھا ہے، اجماع امت نص قرآنی کو منسوخ کر سکتا ہے، اب یہ امر دریافت طلب ہے کہ آیا مسلمانوں کے فقہی لٹریچر میں کوئی ایسا حوالہ موجود ہے۔“ (۸ اگست ۱۹۲۲ء)

”آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ فقہاء نے اجماع سے نص کی تخصیص جائز رکھی ہے، ایسی تخصیص یا تعلیم کی مثال اگر کوئی ہے تو اس سے آگاہ فرمائیے، اس کے علاوہ یہ بھی معلوم کرنا ضروری ہے کہ ایسی تخصیص یا تعلیم صرف اجماع صحابہ ہی کر سکتا ہے یا علمائے مجتہدین امت بھی کر سکتے ہیں، کوئی حکم ایسا بھی ہے جو صحابہؓ نے نص قرآن کے خلاف نافذ کیا ہو اور وہ کونسا حکم ہے.....؟“ (۲۷ اگست ۱۹۲۲ء)

”آپ نے کسی گزشتہ خط میں مجھے لکھا تھا کہ حضور سرور کائنات سے کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتا تو آپ بعض دفعہ وحی کا انتظار فرماتے، اگر وحی نازل ہوتی تو اس کے مطابق مسائل کا جواب دیتے اور اگر وحی کا نزول نہ ہوتا تو قرآن شریف کی کسی آیت سے استدلال فرماتے، اس کا حوالہ کون سی کتاب میں ملے گا؟ کیا یہ قاضی شوکانی کی کتاب اور ارشاد الفحول سے آپ نے لیا ہے؟“ (۱۶ اکتوبر ۱۹۳۳ء)

”آیہ توریت میں حصص بھی ازلی ابدی ہیں یا قاعدہ توریت میں جو اصول مضمحل ہے صرف وہی ناقابل تبدیل ہے اور حصص میں حالات کے مطابق تبدیلی ہو سکتی ہے، آیہ وصیت پر بھی جو ارشادات ہیں، میری سمجھ میں نہیں آئے، اس زحمت کے لیے معافی چاہتا ہوں، جب فرصت ملے جزئیات سے بھی آگاہ فرمائیے، اس احسان کے لیے ہمیشہ شکر گزار ہوں گا۔“ (۱۸ مارچ ۱۹۲۶ء)

”امام ایک شخص واحد ہے یا جماعت بھی امام کی قائم مقام ہو سکتی ہے، ہر اسلامی ملک کا اپنا امام ہو یا تمام اسلامی دنیا کے لیے ایک واحد امام ہو، مؤخر الذکر صورت موجودہ فرق اسلامیہ کی موجودگی میں کیوں کر بروئے کار آ سکتی ہے؟ مہربانی کر کے ان سوالات پر روشنی ڈالیے۔“ (۷ اپریل ۱۹۲۶ء)

”اجتہاد کی بنا محض عقل بشری اور تجربہ و مشاہدہ ہے یا یہ بھی وحی میں داخل ہے، اس پر آپ کیا دلیل قائم کرتے ہیں، وحی غیر متلو کی تعریف نفسیاتی اعتبار سے کیا ہے؟ کیا وحی متلو اور غیر متلو کے امتیاز کا پتہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں چلتا ہے یا یہ اصطلاحات بعد میں وضع کی گئیں؟“

”حضور ﷺ نے اذان کے متعلق صحابہؓ سے مشورہ کیا، کیا یہ مشورہ نبوت کے تحت میں آئے گا یا امت کے تحت میں؟..... امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک طلاق یا خاوند کی موت کے دو سال بعد بھی اگر بچہ پیدا ہو تو قیاس اس بچہ کے ولد الحرام ہونے پر نہیں کیا جاسکتا، اس مسئلہ کی اساس کیا ہے؟“ (۲۴ اپریل ۱۹۲۶ء)

”شمس بازغہ یا صدر میں جہاں زمان کی حقیقت کے متعلق بہت سے اقوال نقل کیے ہیں، ان میں ایک قول یہ ہے کہ زمان خدا ہے، بخاری میں ایک حدیث بھی اس مضمون کی ہے..... کیا حکمائے اسلام میں سے کسی نے یہ مذہب اختیار کیا ہے، اگر ایسا ہے تو یہ بحث کہاں ملے گی؟“ (۷ مارچ ۱۹۲۸ء)

”کیا یہ ممکن ہے کہ آپ زمانے کے متعلق امام رازی کے خیالات کا خلاصہ قلم بند فرما کر مجھے ارسال فرمادیں، میں اس کا ترجمہ نہیں چاہتا، صرف خلاصہ چاہتا ہوں، جس کے لکھنے میں غالباً آپ کا بہت سا وقت ضائع نہ ہوگا۔“ (۱۸ مارچ ۱۹۲۸ء)

”مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ البالغہ کا ایک ٹکڑا جو ترجمہ کیا ہے اس میں شعائر تعزیرات ہے، مہربانی کر کے یہ فرمائیے کہ لفظ شعائر سے کیا مراد ہے اور اس کے تحت میں کون کون سے مراسم یا دستور آتے ہیں، اس لفظ کی مفصل تشریح مطلوب ہے، جواب کا

سخت انتظار رہے گا۔“ (۲۲ ستمبر ۱۹۲۹ء)

”حضرت محی الدین ابن عربی کے فتوحات یا کسی اور کتاب میں حقیقت زمان کی بحث کس کس جگہ ہے؟ حضرات صوفیہ میں اگر کسی بزرگ نے بھی اس مضمون پر بحث کی ہو تو اس کے حوالے سے بھی آگاہ فرمائیے، متکلمین کے نقطہ خیال سے حقیقت زمان یا آن سیال پر مختصر اور مدلل بحث کون سی کتاب میں ملے گی۔“ (۸ اگست ۱۹۳۳ء)

”نور الاسلام کا عربی رسالہ بابت مکان قلمی یا مطبوعہ ہے، نور الاسلام کا زمانہ کون سا ہے۔“ (۲۴ ستمبر ۱۹۳۳ء) ”ملاحب اللہ بہاری کی کتاب جو ہر الفرد کہاں ملے گی۔“ (۱۰ ستمبر ۱۹۳۳ء)

”اگر دہر متمد اور مستمر ہے اور حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی ہے تو پھر مکان کیا چیز ہے؟ جس طرح زمان دہر کا ایک طرح عکس ہے اسی طرح مکان بھی دہر ہی کا عکس ہونا چاہیے یا یوں کہئے کہ زمان اور مکان دونوں کی حقیقت اصل یہ ہے، کیا یہ خیال محی الدین ابن عربی کے نقطہ خیال سے صحیح ہے؟ اس کا جواب شاید فتوحات میں ہی ملے، مہربانی کر کے تھوڑی سی تکلیف اور گوارا فرمائیے اور دیکھئے کہ کیا انھوں نے مکان پر بھی کچھ بحث کی ہے اور اگر کی ہے تو مکان اور دہر کا تعلق ان کے نزدیک کیا ہے۔ اس زحمت کے لئے معافی چاہتا ہوں۔ اور جواب جہاں تک ہو جلد مانگتا ہوں۔“ (۱۵ دسمبر ۱۹۳۳ء)

”دنیا اس وقت عجیب کش مکش میں ہے، نظام عالم ایک نئی تشکیل کا محتاج ہے، ان حالات میں آپ کے خیال میں اسلام اس جدید تشکیل کا کہاں تک مدد ہو سکتا ہے، اس بحث پر اپنے خیالات سے مستفیض فرمائیے۔“ (۱۵ جنوری ۱۹۳۴ء)

”احکام منصوصہ میں توسیع اختیارات امام کے اصول کیا ہیں؟ اگر امام توسیع کر سکتا ہے تو کیا ان کے عمل کو محدود بھی کر سکتا ہے؟ اس کی کوئی تاریخی مثال ہو واضح فرمائیے، زمین کا مالک قرآن کے نزدیک کون ہے؟ اگر کوئی اسلامی ملک (روس کی طرح) زمین کو حکومت کی ملکیت قرار دے تو کیا یہ بات شرع اسلامی کے موافق ہوگی، یا مخالف؟ اس مسئلہ کا سیاست اور اجتماع معاشرت سے گہرا تعلق ہے، کیا یہ بات بھی رائے

امام کے سپرد ہوگی، صدقات کی کتنی قسمیں اسلام میں ہیں؟ صدقہ اور خیرات میں کیا فرق ہے۔“ (یکم فروری ۱۹۳۴ء)

”قرآن شریف میں جن انبیاء کا ذکر ہے، ان میں کون سے نبی باہمزہ ہیں اور کون سے بغیر ہمزہ؟ یا سب کے سب بغیر ہمزہ ہیں، لفظ نار کاوٹ عربی زبان میں کیا ہے، لفظ نجات کا روٹ کیا ہے اور رکاوٹ کے لحاظ سے اس کے معنی کیا ہیں۔“ (۶ ستمبر ۱۹۳۴ء)

ان استفسارات کے جوابات حضرت سید صاحب برابر دیتے رہے، افسوس ہے کہ وہ محفوظ نہیں ہیں، شاید ڈاکٹر اقبال کے کاغذات میں ہوں، اگر وہ بھی شائع کر دیئے جاتے تو بہت سی مفید مذہبی، فقہی تاریخی اور علمی معلومات حاصل ہو جاتیں، سید صاحب نے اقبال نامہ کے مرتب کو ڈاکٹر صاحب کے خطوط بھیجتے وقت کچھ حواشی ضرور لکھ دیئے تھے مگر وہ سب ہی مختصر اور ناکافی ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت سید صاحب جو جوابات دیتے ان سے ڈاکٹر صاحب کو پوری تشفی ہو جاتی، اسی لیے وہ اپنے خطوط میں لکھتے رہے:

”آپ کا نوازش نامہ قوت روح اور طمینان قلب کا باعث ہے۔“ (۱۴ نومبر ۱۹۱۷ء)

”نوازش نامہ ابھی ملا ہے، جس کے لئے بہت شکر گزار ہوں، جتنی آگاہی آپ نے دے دی ہے، وہ اگر زمانہ فرصت دے تو باقی عمر کے لئے کافی ہے۔“ (۲۴ اگست ۱۹۲۲ء)

”نوازش نامہ معلومات سے لبریز ہے، نہایت شکر گزار ہوں۔“ (یکم فروری ۱۹۲۴ء)

”آپ نوازش نامہ کے طوالت کے لیے عذر خواہی کرتے ہیں مگر میرے لیے یہ طویل خط باعث خیر و برکت ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے، میں نے اسے کئی دفعہ پڑھا ہے، اور گزشتہ رات چودہری غلام رسول مہر سے بھی پڑھوا کر سنا، اور احباب بھی اس مجلس میں شریک تھے، اگر میری نظر اس قدر وسیع ہوتی جس قدر آپ کی ہے تو مجھے یقین ہے کہ میں اسلام کی کچھ خدمت کر سکتا۔“ (۲۴ اپریل ۱۹۲۶ء)

ڈاکٹر اقبال کے اس آخری اقتباس میں ان کے عجز و انکسار کے ساتھ ان کی شرافت

اخلاق اور شرافت طبع بھی نمایاں ہے، جو ان کی طبیعت کا سب سے بڑا جوہر تھا، اور جو خود افکار اسلامیہ کا ہمالیہ بنا ہوا تھا، اس نے یہ لکھنے میں بالکل تامل نہیں کیا کہ علوم اسلام کی جوئے شیر کا فرہاد آج ہندوستان میں سوائے سید سلیمان ندوی کے اور کون ہے۔ (۴/ستمبر ۱۹۳۳ء)

ڈاکٹر صاحب حضرت سید صاحب کو مفید مشورے بھی دیتے رہے، ایک بار سید صاحب نے ان کو اپنی ایک غزل بھیجی تو انھوں نے لکھ کر بھیجا کہ آپ کی غزل لا جواب ہے، بالخصوص مجھے یہ شعر بہت پسند آیا ہے:

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں

وہ ایک قطرہ خوں جو رگ گلو میں ہے

لیکن ڈاکٹر صاحب نے سید صاحب کو یہ بھی مشورہ دیا کہ مولانا شبلی کی طرح تاریخی نظمیں لکھیں، سید صاحب کو شاعری سے صرف اسی حد تک لگاؤ رہا کہ جب ان پر کوئی خاص کیفیت طاری ہوتی تو کوئی نظم یا کوئی غزل کہہ دیتے، ورنہ ان کا زیادہ وقت تصنیف و تالیف میں ہی صرف ہوتا۔

ڈاکٹر صاحب نے سید صاحب سے یہ فرمائش کی تھی کہ وہ یا جوج ماجوج پر کوئی مضمون لکھیں، کیوں کہ یہ امر تحقیق کا محتاج ہے۔ (یکم اکتوبر ۱۹۱۹ء)

جہاں تک مجھے یاد ہے کہ سید صاحب اس پر مضمون قلم بند نہ کر سکے، پھر اپنے ایک خط (مورخہ ۱۸ مارچ ۱۹۲۶ء) میں ڈاکٹر صاحب سید صاحب کو لکھتے ہیں کہ اس وقت سخت ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہ اسلامی کی ایک مفصل تاریخ لکھی جائے، اگر مولانا شبلی ہوتے تو میں ان سے ایسی کتاب لکھنے کی درخواست کرتا، موجودہ صورت میں سوائے آپ کے اس کام کو کون کرے گا، یہ کام سید صاحب خود تو نہ کر سکے، لیکن انھوں نے اپنے رفیق کار مولانا عبد السلام ندوی سے علامہ خضریٰ کی تاریخ فقہ اسلامی کا ترجمہ کرایا، جس کے کئی ایڈیشن اب تک دارالمصنفین سے شائع ہو چکے ہیں، پھر ایک اور خط میں لکھتے ہیں، دارالمصنفین کی طرف سے ہندوستان کے حکمائے اسلام پر ایک کتاب لکھنی چاہیے، اس کی

سخت ضرورت ہے، عام طور پر یورپ میں سمجھا جاتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی کوئی فلسفیانہ روایات نہیں ہیں۔ (۴/ستمبر ۱۹۳۳ء)

سید صاحب نے مولانا عبد السلام ندوی سے حکمائے اسلام دو جلدوں میں لکھوائی ہے، جس میں ہندوستان کے حکماء کا بھی ذکر آ گیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو زمان و مکان کے فلسفہ سے بڑی دلچسپی رہی، اس لئے وہ اپنے ایک خط میں صاحب کو لکھتے ہیں کہ میں نے زمان و مکان کے متعلق تھوڑا سا مطالعہ کیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے بڑے بڑے مسائل پر غور و فکر کیا ہے اور اس غور و فکر کی تاریخ لکھی جاسکتی ہے، یہ کام صرف آپ ہی کر سکتے ہیں، میرے خیال میں آپ کو چاہئے کہ اس کام کو اپنی زندگی کے اہم مقاصد میں شمار کریں۔ (۱۵/ستمبر ۱۹۳۳ء)

لیکن حضرت سید صاحب کو اس کام کے انجام دینے کی فرصت نہ ملی۔ علم و فن کے ان دو سیاروں کا قرآن السعدین بھی ہوتا رہا، ڈاکٹر صاحب تو کبھی اعظم گڑھ تشریف نہیں لائے، لیکن حضرت سید صاحب کو لاہور جانے کا بارہا اتفاق ہوا، تو وہاں وہ ڈاکٹر صاحب سے ضرور ملتے، ڈاکٹر صاحب کو بھی سید صاحب کے لاہور آنے کی خبر ملتی تو ان کو اپنے ہی یہاں مہمان ٹھہرانا پسند کرتے۔ (اقبال نامہ مکتوب مورخہ ۵ جولائی ۱۹۲۲ء)

سید صاحب اپریل ۱۹۲۷ء میں لاہور تشریف لے گئے تو وہ دہلی دروازہ کے باہر جہازی بلڈنگ میں مولانا ظفر علی خان کے یہاں زمیندار اخبار کے دفتر میں مقیم ہوئے، اس زمانہ میں ڈاکٹر صاحب میکلوڈ روڈ میں رہتے تھے، اس موقع پر علم و ادب کے ان دو سیاروں سے ملاقات ہوئی، اس کی بہت دلچسپ تفصیل ڈاکٹر عبد اللہ چغتائی نے اپریل ۱۹۵۶ء کے رسالہ اقبال لاہور میں لکھی ہے۔ ڈاکٹر عبد اللہ چغتائی نے سید صاحب کے لاہور آنے کی خبر ڈاکٹر صاحب کو دی تو ان کے ساتھ سید صاحب سے ملنے کے لئے تشریف لے گئے، دفتر زمیندار کے مکان کے بالائی منزل پر پہنچے، جہاں حضرت سید صاحب ایک الگ کمرہ میں مقیم تھے، مولانا ظفر علی خاں کے صاحب زادے مولانا اختر علی خاں نے رہنمائی کی، ڈاکٹر

عبداللہ چغتائی کا بیان ہے کہ اخلاق، علم اور عرفان کے دونوں پیکر نہایت تپاک اور مسرت سے ملے، ڈاکٹر صاحب نے نہایت عمدگی سے چغتائی صاحب کا تعارف سید صاحب سے کرایا، یہ صحبت ایک گھنٹہ تک کی تھی علم، دین اور فلسفہ اسلام کے موضوع پر گفتگو رہی جو زیادہ تر..... امام رازی کے مباحث مشرقیہ کے متعلق تھی، کیوں کہ اس زمانہ میں ڈاکٹر صاحب مکان و زمان کے موضوع سے پوری دلچسپی لے رہے تھے، اس کے لئے علماء و فضلاء سے استصواب بھی کیا تھا، اس موقع پر ڈاکٹر صاحب نے سید صاحب کو اپنے یہاں کھانے پر بعد نماز مغرب مدعو کیا، اس کے بعد سید صاحب نے انجمن حمایت اسلام میں جا کر ”عہد رسالت میں اشاعت اسلام“ کے عنوان سے تقریر کی، اس جلسہ کی صدارت رانا نصر اللہ خان نو مسلم نے کی، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی سید صاحب کے ساتھ تھے، جلسہ کے بعد سید صاحب سے ملنے والوں کا بڑا ہجوم ہوا، مگر ڈاکٹر عبداللہ چغتائی جلسہ سے سید صاحب کو باہر لے آئے اور ایک دلچسپ حرکت یہ کی کہ ان کو ان سے کہے بغیر پروفیسر محمود شیرانی کے گھر لے گئے، اس سے پہلے پروفیسر محمود شیرانی نے مولانا شبلی کی شعراجم پر سخت تنقیدیں کی تھیں، جس کا لب و لہجہ سید صاحب کو پسند نہیں آیا تھا، اس لئے دونوں کے درمیان شکر نجی تھی، جب سید صاحب وہاں پہنچے تو پروفیسر محمود شیرانی کے ساتھ مولانا تاجور نجیب آبادی بھی بیٹھے تھے، ان تینوں حضرات کی کوئی ملاقات پہلے نہیں ہوئی تھی، چغتائی صاحب لکھتے ہیں:

”آج تک ان تینوں حضرات کی ملاقات ایک دوسرے سے نہیں ہوئی تھی اور نہ وہ کسی کو پہچانتے تھے، جب میں بغیر اطلاع شیرانی صاحب کے سر پر جا پہنچا اور وہ میری طرف دیکھنے لگے تو میں نے فوراً اسلام کے بعد کہا کہ ”قبلہ سید سلیمان ندوی“ اور ان کی طرف دیکھ کر عرض کیا کہ ”پروفیسر شیرانی“ یہ دونوں فاضل اور محقق ہستیاں ایک دوسرے کی طرف تعجب سے دیکھنے لگیں اور حیرانی میں دونوں نے خشکیوں سے کہا کہ اللہ کے بندے پہلے بتاؤ دیتے، اتنے میں مولانا

تاجور کی طرف سید صاحب کی جو نظر پڑی تو میں نے کہا کہ مولانا تاجور، سید صاحب نے ذرا مسکراتے ہوئے فوراً کہا کہ ہم تو آپ کو تاجور ہی سمجھتے رہے، یہ مجلس تھی تو چند منٹ کی مگر بہت پر لطف، پروفیسر شیرانی مرحوم نے حسب عادت فوراً ٹھنڈے شربت سے تواضع کی، اس کے بعد میں سید صاحب کو ان کے مستقر دفتر زمیندار میں چھوڑ آیا۔“

اس کے بعد کا ٹکڑا زیادہ دلچسپ ہے، چغتائی صاحب لکھتے ہیں:

”اسی شب علامہ سراقبالؒ کے یہاں قبلہ سید صاحب کی دعوت بھی تھی، بعد دوپہر میں نے علامہ سراقبالؒ کو جب یہ تمام واقعہ سنایا تو بہت ہی ہنسے اور فرمانے لگے کہ یہ ملاقات بھی حالات کے اعتبار سے لازمی تھی، یہ بہت اچھا ہوا۔“

ڈاکٹر صاحب کے یہاں سید صاحب کی جو دعوت ہوئی اس میں چودھری محمد حسین، مولانا ظفر علی خاں، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، خواجہ سلیم، مولانا غلام رسول مہر، محمد دین تاثیر، مولانا عبد المجید سالک بھی شریک ہوئے، کھانا بہت ہی پر تکلف تھا، کافی دیر تک علمی گفتگو رہی جس میں زیادہ تر علامہ عنایت اللہ مشرقی کی کتاب تذکرہ کا ذکر رہا، مکان و زمان کا بھی مسئلہ چھڑ گیا، شعر و شاعری اور پنجاب کی علمی سرگرمیوں پر بھی تبصرہ رہا، سید صاحب اعظم گڑھ واپس آئے تو مئی ۱۹۱۲ء کے معارف کے شذرات میں اس سفر کی روداد لکھی، جس میں وہ ڈاکٹر صاحب کے متعلق رقم طراز ہیں:

”یہ لکھنے میں میرا دل خوشی اور مسرت سے لبریز ہے کہ لاہور کے اہل اور اہل قلم نے اپنی برادری کے اس کمترین ممبر کو خوش آمدید کہنے میں پوری فیاضی کا ثبوت دیا، مولوی ظفر علی خاں نے تو اپنے گھر مہمان ہی اتارا، اور یہ نامناسب بھی نہ ہوا کہ ایک دہقانی ایک زمیندار کا مہمان بنا، ڈاکٹر اقبال سے یہ میری پہلی ظاہری ملاقات تھی، اور مراسلت کی باطنی ملاقات تو ۱۹۱۲ء سے قائم ہے، ڈاکٹر صاحب نے کرم کیا کہ ملنے میں پیش دستی فرمائی، قیام گاہ پر آئے، متعدد صحبتوں

میں ساتھ رہے، پھر خود اپنے کا شانہ میں مدعو کیا جس کو وہ دارالفقر اور میں دارالافعال کہوں گا.....۔“

”ڈاکٹر اقبال تمام صحبتوں میں شمع محفل تھے، انھوں نے توشیح اور شاعر لکھا ہے، لیکن میں نے تو لاہور میں خود شاعر کو شمع دیکھا اور اور قدر شناسوں کو اس کا پروانہ پایا، ان کی صحبت لاہور کے نوجوانوں کی دماغی سطح کو بہت بلند کر رہی ہے، ان کے فلسفیانہ نکات، عالمانہ افکار شاعرانہ خیالات ان کی آس پاس کی دنیا کو ہمیشہ متاثر رکھتے ہیں، ان کی زمزمہ پرداز یوں کا نیا مجموعہ زبور عجم کے نام سے عنقریب سامعہ نواز ہونے والا ہے، میں نے کہا کہ فلسفہ عجم کے دشمن کو مناسب بھی یہی تھا کہ عجم کے ہاتھ میں زبور دے کر ان کے خیالی فلسفہ کو مزامیر داؤد کی دعاؤں سے بدل دے، اور ان کے قانون کو زبور کا پردہ رکھ کر قرآن کی نعمہ بنجیوں سے مانوس کر دے۔“

ادارہ معارف اسلامیہ کا جلسہ لاہور میں اپریل ۱۹۳۳ء میں ہوا تو سید صاحب نے بھی اس میں شرکت کی اور اپنا معرکتہ الآرا مقالہ ”لاہور کا ایک مہندس خاندان جس نے تاج محل اور لال قلعہ بنایا“ ڈاکٹر صاحب ہی کی صدارت میں پڑھا، یہ جلسہ لاہور میں پنجاب یونیورسٹی کے سینٹ ہال میں ہوا تھا۔

ڈاکٹر صاحب اور سید صاحب کو ۱۹۳۳ء کے سفر افغانستان میں ایک ساتھ رہنے کا زیادہ موقع ملا، اعلیٰ حضرت نادر شاہ نے ڈاکٹر صاحب، راس مسعود اور سید صاحب کو افغانستان کی بعض علمی اور تعلیمی اصلاحات کے سلسلہ میں افغانستان مدعو کیا۔ سید صاحب نے اس سفر کے دلچسپ کوائف ۱۹۳۳ء اور ۱۹۳۴ء کے معارف کی کئی اشاعتوں میں قلم بند کئے ہیں۔ ان میں ڈاکٹر صاحب کی جن جن باتوں سے متاثر ہوئے ان کو بھی اپنے احاطہ تحریر میں لائے ہیں۔

ایک موقع پر چینی ترکستان کا ذکر آیا تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ یورپ نے اپنی

اسی نئی ترقی میں اپنا سارا زور، بحری طاقت اور سیر و سیاحت کے راستے دریائی رکھے اور اپنے ان ہی جہازوں کے ذریعہ سے مشرق کو مغرب سے ملادیا، لیکن اب یہ نظر آتا ہے کہ ان بحری راستوں کی یہ جنت جلد فنا ہو جائے گی، اب آئندہ مشرق وسطیٰ کا راستہ مشرق و مغرب کو ملائے گا، اور تری کے بجائے خشکی کا راستہ اہمیت حاصل کرے گا، تجارتی قافلے اب موٹروں، لاریوں، ہوائی جہازوں اور ریلوے کے ذریعہ مشرق و مغرب میں آئیں جائیں گے اور چونکہ یہ پورا راستہ اسلامی ملکوں سے ہو کر گزرے گا، اس انقلاب سے ان اسلامی ملکوں میں عظیم الشان اقتصادی و سیاسی انقلاب رونما ہوگا، ڈاکٹر صاحب کی پیشین گوئی بڑی حد تک صحیح تھی، آج مشرق وسطیٰ میں جو سیاست کھیلی جا رہی ہے اور وہاں آئے دن جو بات ہوتے نظر آ رہے ہیں، ان کا مطالعہ انقلابات کر کے ڈاکٹر صاحب کی سیاسی فراست اور دور بینی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

افغانستان میں ہندوستانی مہمانوں کے اعزاز میں انجمن ادبی کا بل نے ایک دعوت کی تو اس میں تقریریں بھی ہوئیں، سید صاحب لکھتے ہیں کہ اس موقع پر ڈاکٹر صاحب کی تقریر فلسفیانہ انداز میں بہت ہی پراثر تھی، اس پوری تقریر کو سید صاحب نے معارف (مارچ ۱۹۳۴ء) میں نقل کیا ہے، جس کے کچھ ٹکڑے یہ ہیں:

”میرا یہ عقیدہ ہے کہ آرٹ یعنی ادبیات یا مصوری یا موسیقی یا معماری جو بھی ہو ہر ایک زندگی کی معاون اور خدمت گار ہے اور اسی بنا پر آرٹ کو چاہئے کہ میں ایجاد کہوں نہ تفریح، شاعر ایک قوم کی زندگی کی بنیاد کو آباد یا برباد کر سکتا ہے، اس وقت جب حکومت کوشش کر رہی ہے کہ موجودہ زمانہ میں افغانستان کی تاریخ نئی زندگی کے میدان میں داخل ہو تو اس ملک کے شعر پر لازم ہے کہ اخلاف نوجوانوں کے لئے سچے رہنما بنیں، زندگی کی عظمت و بزرگی کے بجائے موت کو زیادہ بڑھا کر نہ دکھائیں، کیوں کہ شاعر جب موت کا نقشہ کھینچتا ہے اور اس کو بڑھا کر دکھاتا ہے، اس وقت وہ سخت خوفناک اور برباد کن ہو جاتا ہے، اور جو حسن قوت سے خالی ہو وہ



محض ایک پیغام موت ہے:

دلبری بے قاہری جادوگری است

دلبری با قاہری پیغمبری است

اس موقع پر ڈاکٹر صاحب نے شاعری اور شاعر سے متعلق ایک عجیب نکتہ پیدا کیا جو غور کرنے کے لائق ہے انھوں نے فرمایا:

”ایک قوم کی زندگی کی موقوف علیہ چیزیں محض شکل و صورت نہیں بلکہ جو چیز حقیقت میں قوم کی زندگی سے تعلق رکھتی ہے وہ تخیل ہے، جس کو شاعر قوم کے سامنے پیش کرتا ہے اور وہ بلند نظریات ہیں جن کو وہ اپنی قوم میں پیدا کرنا چاہتا ہے، قومیں شعراء کی دست گیری سے پیدا ہوتی ہیں، اور اہل سیاست کی پامردی سے نشوونما پا کر مرجاتی ہیں، جو قوم ترقی کے راستہ پر چل رہی ہے اس کی انانیت تربیت کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے، مگر وہ تربیت جس کا خمیر احتیاط کے ساتھ اٹھایا جائے۔“

آخر میں انھوں نے تمام افغانوں سے مخاطب ہو کر فرمایا:

”افغانستان کو ایک ایسے مرد کی ضرورت ہے جو اس ملک کو اس کی قبائلی زندگی سے نکال کر وحدت ملی کی زندگی سے آشنا کر دے۔“

یہ ہندوستانی مہمان غزنی پہنچے تو حکیم سنائی کے مزار کی بھی زیارت کی، سید صاحب اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:

”حکیم وشاعر اقبال کو حکیم وشاعر سنائی کے مزار کے دیکھنے کا سب سے زیادہ اشتیاق تھا، جب ہم وہاں پہنچے تو مزار کے اندر بطریق مسنون دعا پڑھی، حکیم سنائی کی جلالت شان سے کون واقف نہیں، ہم سب اس منظر سے متاثر تھے، مگر ہم میں سے سب سے زیادہ اثر ڈاکٹر اقبال پر تھا وہ حکیم ممدوح کے سرہانے کھڑے ہو کر بے اختیار ہو گئے، اور دیر تک زور زور سے روتے

رہے، ”اللہم اغفرلہ وارحمہ۔“

والپسی میں چمن سے کوئٹہ تک سید صاحب اور ڈاکٹر صاحب دونوں نے ایک موٹر میں سفر کیا، سید صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ راستہ میں ڈاکٹر صاحب نے روحانیت کے ذاتی مشاہدات اور تجربے اور سچے پیر کی تلاش پر گفتگو شروع کر دی، مختلف شیوخ اور بزرگان سلاسل کا تذکرہ رہا، گفتگو میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے والد کا بھی ذکر کیا تو اس سلسلہ میں سید صاحب تحریر فرماتے ہیں:

”اس ضمن میں معلوم ہوا کہ ہمارے حلیل القدر اسلامی شاعر کے حیات خفہ کے تاروں میں جس مضرب نے حرکت پیدا کی وہ خود ان کے والد ماجد کی ذات بابرکات تھی، گفتگو میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے والد مرحوم کا ایک ایسا فقرہ سنایا، جس نے میرے دل پر بے حد اثر کیا، فرمایا کہ اپنے وطن سیالکوٹ میں صبح کی نماز کے بعد قرآن پاک کی تلاوت کیا کرتا تھا، ایک صبح کو نماز کے بعد حسب دستور میں تلاوت میں مصروف تھا کہ والد صاحب مرحوم ادھر آئے اور دریافت کیا کہ کیا کرتے ہو، ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ میں اس وقت تلاوت کرتا ہوں، فرمایا جب تک تم یہ نہ سمجھو کہ قرآن تمہارے قلب پر بھی اسی طرح اترا ہے جیسے محمد رسول اللہ ﷺ کے قلب اقدس پر نازل ہوا تھا تلاوت کا مزا نہیں، ڈاکٹر صاحب نے پوچھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے، فرمایا جب بی۔ اے۔ پاس ہو جاؤ گے تو بتاؤں گا، کچھ دنوں کے بعد جب انھوں نے بی۔ اے۔ پاس کر لیا تو اس دن کی گفتگو کا حوالہ دے کر اس مقام کی حصول کی تدبیر پوچھی، مرحوم نے ان کو کچھ طریقے اور دعائیں بتائیں اور نوجوان بیٹے سے عہد لیا کہ وہ ہمیشہ اپنی زبان و قلم سے ملت محمدی کی خدمت بجالاتا رہے گا، ڈاکٹر صاحب کی شاعری ان کے والد مرحوم کی زندگی ہی میں پورا فروغ پا چکی تھی اور ایک عالم ان کے نغمہ سے سرشار و مست تھا، اور مسلمانوں میں وہ قیامت انگیز تاثر پیدا کر رہا تھا، باپ

اپنے بیٹے کی اس عیسیٰ نفسی سے مسرور ہو کر اس دنیا سے سدھارا۔

اور جب سید صاحب سیر افغانستان کا تکرار کر رہے تھے تو ڈاکٹر صاحب کی تالیف ”مسافر“ ان کو ملی، اس پر اسی سفر نامہ میں یہ تبصرہ فرماتے ہیں کہ:

”یہ افغانستان کی چند روزہ سیاحت پر موصوف کے شاعرانہ جذبات کا مجموعہ ہے جو ابھی شائع ہوا ہے، فارسی زبان میں خیبر و کابل و غزنین و قندھار کے عبرت انگیز مناظر و مقابر پر شاعر کے آنسو ہیں اور بابر سلطان محمد حکیم سنائی اور احمد شاہ درانی کی خاموش تبتوں کی زبان حال سے سوال و جواب ہیں، مسافر کا آغاز نادر شاہ شہید کی مناقب سے اور اختتام شاہ محمد ظاہر خاں سے اظہار توقعات پر ہے۔“

حضرت سید صاحب افغانستان کے سفر سے لوٹے تو ڈاکٹر اقبال کی عالی ظرفی اور اخلاق کی پاکیزگی کے علاوہ ان کی فکر و نظر کی بلندی سے اور بھی زیادہ متاثر تھے اور دارالمصنفین کی نجی مجلسوں میں بار بار کہا کہ اسلام میں صدیوں کے بعد ڈاکٹر اقبال جیسا مفکر پیدا ہوا ہے، ایک موقع پر یہ بھی فرمایا کہ کابل ہی کے سفر میں انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ جب تک آپ کی شاعری ہندوستان میں باقی رہے گی، ہندوستان میں اسلام بھی باقی رہے گا، یہ سن کر ڈاکٹر صاحب نے سید صاحب سے فرمایا کہ نہیں جب تک دارالمصنفین کا لٹریچر ہندوستان میں رہے گا اس وقت تک ہندوستان میں اسلام بھی باقی رہے گا۔ سر اس مسعود بھی اس موقع پر موجود تھے انھوں نے کہا ”بس یوں کہیے کہ جب تک ہندوستان میں ڈاکٹر اقبال کی شاعری اور دارالمصنفین کا لٹریچر باقی رہے گا ہندوستان میں اسلام باقی رہے گا۔“

۱۹۳۵ء میں ڈاکٹر اقبال کا مجموعہ کلام بال جبریل شائع ہوا تو اس کا ایک نسخہ ڈاکٹر صاحب نے سید صاحب کو بھی بھیجا، جب یہ نسخہ دارالمصنفین پہنچا تو سید صاحب نے بہت ذوق و شوق سے اس کا مطالعہ کیا، بار بار پڑھا، اپنے رفقاء کے کار کو پڑھ کر سنایا، اور ان سے

پڑھوا کر سنا اور پھر جون ۱۹۳۵ء کے معارف میں اس پر ایک لمبی تقریظ بھی لکھی، جس کے شروع میں لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی شاعری کا آغاز اردو شاعر کی حیثیت سے کیا، مگر کم از کم بیس برس سے وہ اپنے سامعین کی وسعت اور دنیائے اسلام کے ایک بڑے حصہ تک اس کو پہنچانے کی خاطر اپنے حکیمانہ اسلامی خیالات کو مناسب پیرایہ بیان میں ادا کرنے کے لیے فارسی میں اظہار خیال کرنے لگے، اور مولانا رومی کی رہنمائی میں آسمانوں کی سیر فرماتے رہے، اب بال جبریل کی مدد سے وہ پھر زمین پر اتر رہے ہیں، مگر اس زمین پر بھی وہ آسمانوں ہی کے لیے آمادہ پرواز ہیں۔

پھر یہ بتا کر کہ مجموعہ کے مختلف حصوں میں کیا کیا ہے، لکھتے ہیں کہ ہر نظم میں شاعر نے طرح طرح سے خداوند جل و علا کی شان غیوری کو حرکت میں لانے کی کوشش کی ہے، کہیں وہ روٹھا ہے، کہیں وہ رویا ہے، کبھی سجدہ میں گر پڑا ہے کبھی اٹھ کر تن گیا ہے اور اپنی بندگی و عبودیت پر اتر رہا ہے اور پھر فوراً ہی اپنی حاضری و در ماندگی کی ساری بساط کو اس بارگاہ بے نیاز میں نذر لاتا ہے، کبھی غزنی میں ثنائی کی مزار پر کبھی قرطبہ کی مسجد میں کبھی فلسطین کے بیت المقدس میں اور کبھی یورپ کی تماشہ گاہوں میں، شاعر کو مسلمانوں کی ناخود شناسی پر رونا آتا ہے، کبھی وہ ان کو سمجھاتا ہے، کبھی شرماتا ہے، کبھی دھمکاتا ہے، کبھی رلاتا ہے، اور ہر طرح کی کوشش کرتا ہے کہ مسلمان اپنی حقیقت کو سمجھیں اور اسلام کا پیغام لے کر وہ پھر پنہائے ارض کے گوشہ گوشہ میں دوڑ جائیں۔

سید صاحب شروع میں تو ڈاکٹر اقبال کی زبان کے کچھ ناقد ضرور تھے لیکن اس مجموعہ کا مطالعہ کر کے ڈاکٹر اقبال کی زبان سے متعلق ان کی رائے بدل گئی، اس لیے بڑی فراخ دلی کے ساتھ لکھتے ہیں کہ بال جبریل کی نسبت سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس میں شاعر نے بانگ درا سے بڑھ کر اپنے شاعرانہ صفت، سلاست، روانی، بے تکلفی اور زبان کی صحت میں حیرت انگیز کامیابی کا ثبوت دیا ہے، اور عجب نہیں کہ بال جبریل کو دیکھ کر لکھنؤ اور دہلی کے صنعت گر خن و رہی پنجاب کے خن داں کا لوہا مان لیں، زبان میں غزل

کی سی شیرینی تو نہیں مگر قصائد کی سی جزالت اور متانت پوری طرح موجود ہے۔

۱۹۳۶ء سید صاحبؒ اور ڈاکٹر صاحبؒ دونوں کی صحت بہت خراب رہی، سید صاحبؒ دہرہ دون جا کر مقیم ہو گئے تھے، اور ڈاکٹر صاحبؒ بھوپال میں علاج کر رہے تھے، پھر بھی اگست ۱۹۳۶ء میں وہ سید صاحبؒ کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ وہ قوانین اسلام پر ایک کتاب لکھنا چاہتے ہیں، کیوں کہ اس وقت اسی کی زیادہ ضرورت ہے، اس سلسلے میں انھوں نے سید صاحبؒ سے مشورے بھی طلب کیے لیکن ڈاکٹر صاحبؒ کی صحت کی خرابی کی وجہ سے یہ کتاب مکمل نہ ہو سکی، سید صاحبؒ نے اراکتوبر ۱۹۳۶ء کے معارف کے شذرات میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

”ہمارے حکیم شاعر ڈاکٹر محمد اقبالؒ کا ایک نیا ادبی معجزہ ضربِ کلیم کے نام سے ظاہر ہوا ہے، اس میں موصوف کی وہ تازہ اردو نظمیں ہیں جن میں اسلام کے نقطہ نظر سے زمانہ موجودہ کے خیالات پر تبصرہ کیا گیا ہے، لیکن معلوم نہیں کہ یہ حضرت کلیم کی وہ ضرب ہے جو بحرِ احمر پر پڑی تھی جس سے دریا پھٹ گیا تھا اور اس سے ایک قوم آزاد اور دوسری برباد ہوئی تھی، یا وہ ضرب ہے جو وادیِ تیبہ کی ایک چٹان پر پڑی تھی، جس سے پانی کی بارہ دھاریں بنی اسرائیل کے پیاسوں کے لیے پھوٹیں تھیں، بہر حال ان میں سے جو وہ ہمارے لیے فال نیک ہی ہے۔“

آگے چل کر سید صاحبؒ لکھتے ہیں:

”حضرت اقبالؒ کی شاعری اب شاعری کی حدود سے نکل کر خالص حکمت کے سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچ چکی ہے، ”ان من الشعر لحکمة“ کے خلعتِ نبوی سے سرفراز ہو چکی ہے، اب ان کی شاعری میں جذبات کا سراب نہیں بلکہ علم و حکمت کا چشمہٴ حیات ہے، اب وہ لطف و لذت نہیں بلکہ بصیرت و موعظت ہے، وہ مسلمانوں کو اب ان کے بزرگوں کا تاریخی پیغام سننے کے لیے نہیں بلکہ ان قوموں کے عروج اور زوال کا فلسفہ سمجھانے کے لیے ہے، اب وہ میدانِ جنگ کا

رجز یا مسافرانِ راہ کے لیے بانگِ درانی نہیں بلکہ غور و فکر کے غارِ حرا سے ناموسِ اکبر کی آواز اور جبریل امین کا پیام ہے۔“

اور جب اپریل ۱۹۳۸ء میں سید صاحبؒ کو ڈاکٹر اقبالؒ کی وفات کی خبر ملی تو وہ نہایت رنج و غم میں اٹھ اٹھ کر ٹہلتے تھے، ان کو یاد کرتے اور ان کی آنکھیں اشکبار ہو جاتیں، جیسے کہ ان کے کسی عزیز خاص کی المناک موت ہو گئی ہو، بھرائی ہوئی آواز سے ان کی زندگی کے مختلف واقعات سناتے اور اپنے رفقاءِ کار سے کئی روز تک ان ہی کا ذکر سننا پسند فرماتے، پھر اسی وفور غم میں ماتم اقبالؒ کی سرخی قائم کر کے ڈاکٹر اقبالؒ پر ایک تحریر لکھنے بیٹھ گئے اور جب یہ ختم ہوئی تو اس کے ہر جملہ سے ان کے رنج و الم اور سوز و گداز کا اندازہ ہوتا ہے، خود پیکرِ غم بن کر انھوں نے یہ تحریر لکھی ہے، اور شاید ان کے قلم سے اس سے بہتر کوئی اور تحریر نہ نکلی، اس کا آغاز وہ اس طرح کرتے ہیں:

”وقعت الواقعة“ آخر موت اور حیات کی چند ہفتوں کی کش مکش کے بعد ڈاکٹر اقبالؒ نے دنیائے فانی کو الوداع کہا، صفر کی انیسویں اور اپریل کی اکیسویں کی صبح کو عمر کی اکٹھ بہاریں دیکھ کر اور شاعری کی دنیا میں چالیس برس چہچہا کر یہ بلبل ہزار داستان اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا، وہ ہندوستان کی آبرو، مشرق کی عزت اور اسلام کا فخر تھا، آج دنیا ان ساری عزتوں سے محروم ہو گئی، ایسا عارف، فلسفی، عاشقِ رسول شاعر، فلسفہ اسلام کا ترجمان اور کاروانِ ملت کا حدی خواں صدیوں کے بعد پیدا ہوا تھا، اور شاید یہ صدیوں کے بعد پیدا ہو، اس کے ذہن کا ہر ترانہ بانگِ درا، اس کی جانِ حزیں کی ہر آواز زبورِ نجم، اس کے دل کی ہر فریادِ پیامِ مشرق، اس کے شعر کی ہر پروازِ بالِ جبریل تھا، اس کی فانی عمر گو ختم ہو گئی، لیکن اس کی زندگی کا ہر کارنامہ جاوید بن کر انشاء اللہ باقی رہے گا، امید ہے کہ ملت کا یہ غم خوار شاعر اب عرشِ الہی کے سایہ میں ہوگا اور قبول و مغفرت کے پھول اس پر برسائے جا رہے ہوں گے، خداوند! اس کے

دل شکستہ کی جومت کے غم سے رنجور تھا غم خواری فرما اور اپنی ربانی نوازشوں سے اس کے قلب حزین کو مسرور کر۔

پھر سیرۃ النبی کے مصنف کی یہ رائے پڑھنے کے لائق ہے کہ مرحوم کی زندگی کا ہر لمحہ ملت کی زندگی کے لیے ایک نیا پیام لاتا تھا، وہ توحید خالص کا پرستار، دین کامل کا علمبردار، تجدید ملت کا طلب گار تھا، اس کے رونگٹے رونگٹے میں رسول انام علیہ السلام کا عشق پیوست تھا اور اس کی آنکھیں جسم اسلام کے ہر ناسور پر اشکبار رہتی تھیں، اس نے مستقبل اسلام کا ایک خواب دیکھا تھا، اسی خواب کی تعبیر میں اس کی ساری عمر ختم ہو گئی۔

آج کل اقبالؒ کی شاعری اور ان کے فلسفہ کے ماخوذوں پر طرح طرح کی خیال آرائیاں اور نکتہ آفرینیاں کی جا رہی ہیں لیکن سید صاحبؒ نے چند فقروں میں ان کی شاعری کے جو رموز و نکات بتائے ہیں وہی دراصل حقیقت ہے، سید صاحبؒ رقم طراز ہیں:

”اقبالؒ صرف شاعر نہ تھا، وہ حکیم نہیں جو اسطو کی گاڑی کے قلی ہوں یا یورپ کے فلاسفوں کے خوشہ چیں، بلکہ وہ حکیم جو اسرار قدرت کا محرم اور رموز فطرت کا آشنا تھا، وہ نئے فلسفہ کے ہر راز سے آشنا ہو کر اسلام کے راز کو اپنے رنگ میں کھول کر دکھاتا، یعنی بادۂ اُگور نچوڑ کر توشنیم کا پیالہ تیار کرتا تھا۔“

پھر آخر میں یہ لکھتے ہیں:

”اقبالؒ! ہندوستان کا فخر اقبالؒ! اسلامی دنیا کا ہیرو اقبالؒ! فضل و کمال کا پیکر اقبالؒ! حکمت و معرفت کا داتا اقبالؒ! کاروانِ ملت کا رہنما اقبالؒ! رخصت، رخصت، الوداع، الوداع، سلام اللہ علیک ورحمتہ الی یوم التلاق۔“ (۱)

## سید صاحب اور سیاست (۱)

کراچی ۱۹۵۵ء سے برابر آرہا ہوں۔ نومبر ۱۹۸۳ء میں یہاں آیا تو بعض ضروریات کی بنا پر تین مہینے قیام ہو گیا۔ جناب سید فخر الحسن صاحب پر نپل لیاقت کالج سے برابر ملنے کا اتفاق ہوا، ان کو بہت ہی ملنسار، خاکسار، خلیق، بامروت، علم دوست اور علم نواز پایا۔ جب جب ملا، ان کی شرافت طبع سے متاثر ہوتا رہا۔ ان کو حضرت الاستاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ کا بہت ہی گرویدہ اور عقیدت مند پایا، جس سے اور بھی ان سے قریب تر ہوتا گیا، انھوں نے ۲۲ نومبر ۱۹۸۳ء کو جنیس ہٹل کراچی میں حضرت سید صاحب کی برسی بہت ہی باوقار طریقہ سے منائی، جس میں شہر کے اکابر و معززین شریک تھے، اس میں ان کی طرف سے اعلان ہوا کہ وہ ۱۹۸۴ء میں حضرت سید صاحب کی سو سالہ سالگرہ منانے کا ارادہ رکھتے ہیں، جس سے ان کی مزید گہری عقیدت کا اظہار ہوا۔

اسی عقیدت کی بنیاد پر انھوں نے زیر نظر کتاب قلمبند کی ہے، حضرت سید صاحب کی سیاسی سرگرمیوں کا ذکر دارالمصنفین اعظم گڈھ کی شائع کردہ کتاب ”حیاتِ سلیمان“ میں ہے، مگر یہ ان کے اور سوانح حیات کے سلسلہ میں ہیں، یکجا اور مربوط طریقہ پر نہیں ہیں، خوشی کی بات ہے کہ جناب سید فخر الحسن صاحب نے ان کو ایک مستقل موضوع بنا کر پوری ایک کتاب قلمبند کر دی ہے، جس محنت بلکہ محبت سے اس میں سارے واقعات پوری تفصیل سے جمع کر دیئے گئے ہیں، اُن سے حضرت سید صاحب کی سیاسی سرگرمیوں کو سمجھنے

(۱) مقدمہ کتاب ”علامہ سید سلیمان ندویؒ کی سیاسی خدمات“ از سید فخر الحسن صاحب کراچی

میں بڑی آسانی ہوگی۔ اس کی زبان بھی اچھی ہے، اور انداز بیان بھی صاف ستھرا ہے۔

آج کل کسی سیاسی زندگی پر کچھ لکھنا آسان نہیں، سیاست بقول حضرت سید صاحب بڑی گندی چیز ہے، کسی کی سیاسی زندگی پر نکتہ چینی کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ خصوصاً جب خردہ گری کرنا، قلم کو بے باک بنانا اور خوبیوں کے بجائے عیب ڈھونڈنا ایک آرٹ اور ہنر بن گیا ہو، عیب جو طبائع حضرت سید صاحب کی سیاسی زندگی میں بہت کچھ حرف گیری کر سکتی ہیں، مگر جس طرح اور پاکیزہ جذبہ سے انھوں نے سیاست میں حصہ لیا، اسی جذبہ سے اگر انکی سیاسی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو اس سے بہت کچھ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ جناب سید فخر الحسن صاحب ایک پاکستانی ہیں۔ تقسیم ہند سے پہلے اس برصغیر کی سیاست پر ان کا جو تبصرہ ہے، اس سے ایک ہندوستانی کو اختلاف ہو سکتا ہے مگر انھوں نے اپنا جو نقطہ نظر پیش کیا ہے، اس سے بہت کچھ استفادہ کیا جاسکتا ہے، کبھی کبھی نظر و فکر کے مختلف اور متضاد پہلوؤں کے اندر سے اصابت رائے کی کرن دکھائی دیتی ہے۔

ان میں جو تحریری استعداد اور صلاحیت ہے، اس کے لئے دعاء ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ! ان کی قلمی کاوش و محنت بہت سی مفید علمی اور تحقیقی کارگزاریوں میں صرف ہوتی رہیں۔ آمین۔

ان سطروں کو لکھتے وقت خود راقم کی نظروں میں حضرت سید صاحب کی سیاسی سرگرمیاں گھومنے لگیں، اور بے اختیار حسب ذیل باتیں قلم سے نکل پڑیں۔

حضرت سید صاحب نے علم فن کے پیکر بن کر ساری زندگی گزاری، وہ علم فن کے لئے تھے، اور علم فن ان کے لئے تھے، انھوں نے علم کے ذریعہ سے جو کچھ حاصل کیا، اس کو فن بنا کر اسلام کی خدمت گزاری میں صرف کیا، اور اس کو جب کاغذ کے صفحات پر منتقل کرتے تو اس میں کسی نہ کسی طرح اسلام ہی کی جلوہ گری ہوتی اس لئے وہ شروع سے آخر تک اسلام کے سفیر اور ضمیر بن کر رہے۔

وہ اپنی علمی زندگی کو چھوڑ کر کبھی کبھی سیاست کی خاردار وادی میں چل کھڑے

ہوتے، یلائے جاتے مگر اس کی رہ نوردی میں بھی اسلام کو اپنے سینے سے لگا کے رکھنے ہی میں اپنی زندگی کی جلا پائی۔

۱۹۳۷ء کا زمانہ تھا انڈین نیشنل کانگریس کی وزارتیں صوبوں میں قائم ہو گئی تھیں، بہار میں ڈاکٹر سید محمود وزیر تعلیم تھے، وہ اردو اور ہندی کے لسانی جھگڑے کو ختم کرنے کے سلسلہ میں ہندوستانی زبان کو قومی زبان بنانے کے حامی تھے، انھوں نے اس کو فروغ دینے کے لئے ایک جلسہ بلایا جس میں حضرت سید صاحب کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد، بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق اور دوسرے مشاہیر بھی مدعو تھے، جلسہ کی کارروائی کے درمیان مغرب کا وقت آیا، تو نماز کے لئے وقفہ ہوا، جاڑے کا موسم تھا، حضرت سید صاحب گرم شیردانی پہنے ہوئے تھے، اسی کپڑے کی کشتی نما ٹوپی ان کے سر پر تھی، جو عام طور سے اس زمانے میں گاندھی کیپ کہلاتی تھی، اس ٹوپی کے اوپر عمامہ بھی باندھے ہوئے تھے، وضو کرنے کے لئے عمامہ اتارنا تو ان کی ٹوپی پر مولانا ابوالکلام آزاد کی نظر پڑی، وہ تفریحا بولے اچھا مولانا! آپ نے قومیت اور مذہب دونوں کو ساتھ جمع کر رکھا ہے۔ حضرت سید صاحب نے برجستہ جواب دیا ”جی ہاں! مگر مذہب اوپر ہے، قومیت نیچے ہے“۔ یہ جواب سن کر مولانا ابوالکلام آزاد ہنس پڑے۔ یہ محض ایک تفریحی بات تھی، مگر حضرت سید صاحب کی سیاسی زندگی اسی کا عملی نمونہ تھی، ان کا زمانہ سیاسی حیثیت سے بڑا پر آشوب رہا، پوری دنیا میں مسلمانوں کا ٹکراؤ ان کے مخالفوں سے تھا۔ طرابلس پر یورپین تو میں حملہ آور ہوئیں۔ بلقان کی جنگ ہوئی، کانپور کی مسجد کا واقعہ پیش آیا، پہلی جنگ عظیم کی ہولناکیوں نے دنیا کو متحیر کر دیا ہندوستان میں ہندو مسلمان کے بڑھتے ہوئے اختلافات کو دور کرنے کے لئے لکھنؤ پیکٹ ہوا، جنگ عظیم کے اتحادیوں نے دولت عثمانیہ کے حصے بخرے کر کے ترکی میں خلافت کو بے جان کر دیا، ہندوستان میں خلافت اور ترک موالات کی ملی جلی تحریکیں زور و شور سے چل کھڑی ہوئیں پھر ہندو مسلم فسادات ہونے لگے، شدھی سنگٹھن اور تبلیغ کے جھگڑے کھڑے ہو گئے، انڈین نیشنل کانگریس کی سیاسی سرگرمیاں تیز ہونے لگیں تو ہندو

مسلمان کے سیاسی اختلافات بہت زیادہ بڑھ گئے، نہرور پورٹ مرتب ہوئی، لندن میں گول میز کانفرنس کا انعقاد ہوا، ہندو مسلم کا مسئلہ عقدہ لانیل بن گیا، جمعیت العلماء سیاست میں آگے بڑھی، مسلم لیگ پہلے سے قائم تھی، وہ زیادہ مؤثر نہیں ہوئی تو مسلم کانفرنس قائم ہوگئی۔ بیرونی سیاست میں مسئلہ فلسطین اٹھ کھڑا ہوا، ہندوستان میں شاردا ایکٹ، وڈیا مندر اسکیم اور وار دھا اسکیم سے یہاں کے مسلمانوں میں بڑی بے چینی پیدا ہوئی، یکا یک مسلم لیگ بہت جاندار ہوگئی تو کانگریس اور مسلم لیگ میں زور آزمائیاں ہونے لگیں، دوسری جنگ عظیم بھی برپا ہوگئی، ہندوستان میں جنگ آزادی کے ساتھ پاکستان کی تحریک چلنے لگی، یہاں تک کہ ہندوستان کی تقسیم ہوگئی۔

ان تمام مسائل میں حضرت سید صاحب کا سیاسی ذہن ان کی ملی حیثیت کے ماتحت رہا۔ اور اسی معیار پر اپنے سیاسی معاصروں کو جانچا کرتے، وہ علامہ محمد اقبال کو اس لئے پسند کرتے تھے کہ وہ اپنی شاعری کے ذریعہ سے فلسفہ اسلام کے ترجمان اور کاروان ملت کے حدی خواں بنے ہوئے تھے، وہ مولانا محمد علی کے اس لئے مداح تھے کہ وہ ہندوستان کے ماتم دار ہونے کے علاوہ طرابلس کے لئے سوگوار، عراق کے لئے غمزہ، بلقان کے لئے اشک بار، شام پر گریاں، انگورہ پر مرثیہ خواں، حجاز کے سوختہ غم اور بیت المقدس کے لئے وقف الم رہے، وہ مولانا ابوالکلام آزاد کے ہفتہ وار اخبار الہلال کے اسٹاف میں اس لئے شریک ہوئے کہ انھوں نے اسلامی مسائل پر اپنے زور قلم اور قوت بیان سے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے کانوں کو کتاب و سنت کے پیغام سے آشنا کیا۔

معارف کے شذرات میں ایک موقع پر لکھا کہ اقبال، محمد علی اور ابوالکلام تھوڑے تھوڑے فرق سے ایک ہی منزل، رجوع الی الاسلام کے منادی تھے۔

یہ تحریر مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی میں ان کی کتاب غبارِ خاطر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھی تھی، جس میں یہ بھی لکھا تھا کہ دو تو جاچکے اور تیسرے کو اپنے ادھورے کاموں کی تکمیل کا موقع حاصل ہے۔

حضرت سید صاحب کی سیاسی زندگی کی منزل بھی رجوع الی الاسلام رہی، ان کے زمانے میں مسلمانوں پر جو کوہ الم ٹوٹ رہا تھا، اس پر جس طرح خون کے آنسو بہاتے رہے، اس کا اندازہ ان کی حسب ذیل عبارت سے بھی ہوگا، جو انھوں نے ۱۹۱۳ء میں کانپور کی ایک مسجد کے ایک حصہ کے منہدم ہونے کے سلسلہ میں لکھا تھا:

”زمین پیاسی ہے، اس کو خون چاہئے، لیکن کس کا، مسلمانوں کا، طرابلس کی زمین کس کے خون سے سیراب ہے، مسلمانوں کے، مسجد اقصیٰ کس خون سے رنگین ہے، مسلمانوں کے، خاک ایران پر کس کی لاشیں تڑپتی ہیں، مسلمانوں کی، سرزمین عثمان میں کس کا خون بہتا ہے، مسلمانوں کا، ہندوستان کی زمین بھی پیاسی تھی، خون چاہتی تھی، کس کا، مسلمانوں کا، آخر کار سرزمین کانپور پر خون برسا اور ہندوستان کی خاک سیراب ہوئی“۔ (۱)

انھوں نے تحریک خلافت میں شریک ہو کر لندن کے محاذ پر جا کر برطانوی سامراجیت کے خلاف جس طرح جنگ کی، وہ ان کا بہت بڑا سیاسی کارنامہ ہے، یہ جنگ اس لئے کی کہ دنیا کے مسلمانوں پر یہ ثابت کیا جائے کہ کعبہ کو چھوڑ کر ہم کو کوئی اور آستانہ نہیں مل سکتا ہے (برید فرنگ ص: ۱۲۱)، مگر ان کو اسی محاذ پر یہ دکھ بھی پہونچا کہ یورپ کی تعلیم نے تمام اقوام عالم کے کانوں میں قومی تفریق کا جو منتر پھونک دیا ہے، وہ اب کسی رد سحر سے اتر نہیں سکتا، چنانچہ عرب اور ترک ایک دوسرے کی ماتحتی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں، گو اتحاد اسلامی کے خواب سب کو نظر آتے ہیں، مگر اسی محاذ پر ان کا یہ سیاسی ایمان اور عقیدہ ہو گیا کہ ہم کعبہ اور مقداد خضر کو آزاد کرانا چاہتے ہیں تو اب ہندوستان کی آئینی آزادی میں کوشش صرف دنیاوی مسلک نہیں بلکہ دینی قرض اور مذہبی حق ہے۔ (برید فرنگ ص: ۱۷۸)

اسی جذبے سے وہ کانگریس، خلافت کانفرنس اور جمعیت العلماء کی سیاسی سرگرمیوں میں شریک ہوتے رہے، کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی نامزد ہوئے،

خلافت کانفرنس اور جمعیت العلماء کے سالانہ اجلاسوں کی صدارت بھی کی، جب حجاز میں سلطان عبدالعزیز اور شریف حسین میں آویزش ہوئی تو ۱۹۲۴ء میں خلافت کانفرنس کے ایک وفد کے سربراہ بن کر حجاز بھی گئے۔ جس کے اراکین مولانا عبدالماجد بادیونی اور مولانا عبدالقادر قصوری تھے، وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے یہ پیام لے کر گئے کہ دنیائے اسلام کے مشورے سے وہاں شرعی اور جمہوری حکومت قائم ہو، مگر وہ وہاں پہونچے تو ان کو دکھ ہوا کہ وہ دین جو دنیا میں قومی عصبتوں، نسلی امتیازوں اور ملکی تفرقوں کو مٹانے آیا تھا اس کے پیرو خود مصیبتوں، نسلی امتیازوں اور تفرقوں کو ذریعہ نجات اور طریق حیات جانتے ہیں، ان کو صدمہ اس سے بھی پہونچا کہ یہ سرزمین یورپ کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہے، اور وہ یہ خیال کر کے لوٹے کہ اس کو یورپ کی غلامی سے آزاد کرانا ہمارا فرض ہے۔ لیکن جب وہاں نجدیوں کا تسلط ہوا، تو وہاں کی سیاست بدل گئی، وہاں سے یہ خبریں آنے لگیں کہ نجدیوں نے ارض مقدس کے مقابر، آثار اور مشاہد کو منہدم کر دیا ہے تو ہندوستان کے مسلمانوں میں بڑی بے چینی پھیلی، ہندوستان کے اندر ہندو مسلمان فسادات بھی شروع ہو گئے، حضرت سید صاحب ہندوستان کے اندر اور اس سے باہر مسلمانوں کی سیاست سے بے حد غمزدہ رہے۔

وہ وطنی سیاست میں ہندو مسلم اتحاد کے قائل تھے، ۱۹۱۶ء میں مسٹر محمد علی جناح کی مساعی سے ہندو مسلمان کے درمیان لکھنؤ پیکٹ ہوا تھا تو وہ خوش تھے کہ مریض قوم کے جینے کی امید اس لئے ہو چلی ہے کہ اس کے ڈاکٹر محمد علی جناح ہو رہے ہیں اور جب وہ خلافت کے وفد میں مولانا محمد علی کے ساتھ انگلستان جا رہے تھے تو یہ اعلان کیا تھا کہ یہ وفد انڈین نیشنلزم اور پین اسلام ازم کو متحد کر کے ہندوستان کی آزادی کی جنگ لڑنے چلا ہے، مگر جب ہندوستان کے بعض فرقوں کی طرف سے شدھی اور سنگٹھن کی تحریکیں چلیں تو ان کی ملی حمایت بروئے کار آئی، اور مارچ ۱۹۲۶ء میں کلکتہ میں جمعیت العلماء کے اجلاس کے صدارتی خطبہ میں یہ اعلان کیا کہ مسلمانوں کو دشمنوں کے معنوی حملوں سے بچانے کے لئے سوائے اس

کے اور کوئی تدبیر نہیں ہے کہ ناقص مسلمانوں کو کامل مسلمان بنایا جائے، شدھی کے روکنے کے لئے یہی تدبیر ہے کہ دیہاتوں اور دور دراز مسلمانوں اور خاص کر مسلم رقبوں میں بکثرت مذہبی مکاتب جاری کئے جائیں۔ ایک مسلمان کو نامسلمان بنانے کے لئے بس یہ کافی ہے کہ اس کو عملی اسلام سے آگاہ نہ کیا جائے۔

حضرت سید صاحب ہندو مسلم مناقشات کے دور رس نتائج سے غمزدہ ہو رہے تھے کہ خبر ملی کہ نجدیوں نے یورپ حجاز پر قبضہ کر لیا ہے اور سلطان عبدالعزیز نے وہاں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا ہے، اور ان کی نگرانی میں جنت البقیع اور مدینہ منورہ کے دوسرے مزارات منہدم کئے جا رہے ہیں، ان دونوں خبروں سے ہندوستان کے مسلمانوں کو بڑی تکلیف پہونچی، سلطان عبدالعزیز نے اپنی حکومت کے ان نازیبا اقدامات پر پردہ ڈالنے کے لئے ایک موتمر اسلامی کا انعقاد کیا جس میں اور ملکوں سے وفد طلب کئے تو ہندوستان سے خلافت کانفرنس، جمعیت العلماء اور اہل حدیث کانفرنس کو بھی دعوت نامہ بھیجا، ۱۹۲۶ء میں خلافت کانفرنس کا وفد سید صاحب کی قیادت میں گیا، اس میں علی برادران اور شعیب قریشی بھی شامل ہوئے، سید صاحب نے اپنے وفد کی طرف سے تین تجویزیں پیش کیں کہ ایک تو یہ کہ کتاب وسنت پر عمل کے ساتھ ان امور میں وسعت دینی چاہئے جس میں خود صحابہ کرام اور تابعین مختلف الرائے تھے، کتاب وسنت کے تمسک کے نتائج کا سب سے پہلا مظہر حکومت کو ہونا چاہئے یعنی طرز اول کے مطابق خلیفہ کا انتخاب شرعی طریقہ پر ہونا چاہئے جو وراثت سے پاک ہو، تیسری چیز یہ کہ ماثر و مقابر کے انہدام کے سلسلہ میں دنیائے اسلام کے علماء کا فیصلہ طلب کرنا چاہئے، ان تجویزوں کو منوانے کے لئے سید صاحب نے بڑی پر زور عالمانہ تقریر کیں، لیکن سلطان عبدالعزیز نے ان کو منظور کرنے کے بجائے موتمر سے وہی تجویزیں منوائیں جو ان کی حمایت میں تھیں، یہ وفد جولائی ۱۹۲۶ء میں ہندوستان واپس آیا، ہندوستان میں ہندو مسلمان کے اختلافات بھی روز بروز بڑھتے گئے، سید صاحب ان حالات سے متاثر ہو کر عملی سیاست سے کنارہ کش ہو گئے، معارف کے

ذریعہ سے اپنی نظری اور فکری رائے کا تو اظہار کرتے رہے، مگر سیاسی کاموں میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا۔ کبھی کبھی جمعیت العلماء کے جلسہ میں رسمی طور پر شرکت کر کے مفید مشورے دیتے رہے مگر علمی اور مذہبی جلسوں میں ان کی سرگرمیاں جاری رہیں، لاہور، دہلی، علی گڑھ، پشاور، بڑودہ اور مدراس جا کر کچھ ایسے علمی، تاریخی اور لسانی خطبے دیئے جن سے مسلمانوں کے اسلامی ذہن کی نشوونما ہوتی رہی، اور اسی کی مدد سے ان کی سیاست آگے بڑھی، خود ان کی تصانیف اور مضامین میں کاروان ملت کی یا تو حدی خوانی یا رجز خوانی ہوتی رہی، یہ خاموش اور غیر شعوری خدمت ہر طرح مفید ثابت ہوئی۔

وہ عملی سیاست سے کنارہ کش ضرور ہے، لیکن ہندوستان میں جو سیاسی سرگرمیاں جاری تھیں، ان کو دور سے دیکھ کر ان کے دل کے اندر تلاطم برپا رہتا، سوراج کا مطالبہ جاری تھا، اس زمانہ میں سید صاحب کو یہ فکر رہی کہ جب سوراج حاصل ہو جائے گا تو مسلمانوں کی مذہبی اصلاحات، ان کے ملکی اور زمانی مصالح کی حفاظت کے لئے مکروہ، مباح اور مستحسن امور میں یا ان امور میں جن میں اسلام نے تعزیر یا وضع قانون یا فیصلہ کا حکم امام اور امیر کو دیا ہے، تعزیر یا وضع قانون کی صورت کیا ہوگی، اس سلسلہ میں ان کا مشورہ یہ تھا کہ لوگ جہاں سوراج کے لئے لڑ رہے ہیں، مسلمانوں خصوصاً سیاسی علماء اور عام سیاستین کو اس پر غور کرنا اور اس کے لئے راہ نکالنا نہایت ضروری ہے، جب تک اس کی راہ نہ نکلے گی، مسلمانوں کا قومی و مذہبی نظام اس ملک میں نہ محفوظ ہے اور نہ قابل ترقی۔

اسی زمانہ میں نہرو رپورٹ شائع کی گئی، جس میں ہندوستان کا برطانوی راج کے ماتحت رہ کر ہندوستان کا ایک دستور تیار کیا گیا، اس میں مکمل آزادی تو نہیں مانگی گئی، بلکہ برطانوی راج کو تسلیم کرتے ہوئے یہاں کے لوگوں کی حکومت کی تشکیل کی گئی، اس میں مسلمانوں کو جو نمائندگی اور حقوق دئے گئے تھے، ان سے وہ مطمئن نہیں تھے، انھوں نے اس کی سخت مخالفت کی، حضرت سید صاحب نے نومبر ۱۹۲۹ء کے ”معارف“ میں لکھا کہ آج جہاں مسلمان نہرو رپورٹ اور سوراج میں متعدد دفعات کا مطالبہ کرتے ہیں، ان کا یہ مطالبہ

بھی ہو کہ آئندہ حکومت میں مسلمانوں کے خالص مذہبی اور شخصی قوانین کی حفاظت، ترقی اور استحکام کے لئے ان کا مستقل نظام منظور کیا جائے اور اس کے لئے ایک قابل عمل تجویز کا خاکہ پیش کیا جائے۔

سیاست سے ان کی طویل مدت کی کنارہ کشی کے بعد جب فلسطین کا عالمی مسئلہ کھڑا ہوا، تو ہندوستان کے مسلمانوں کی نظر ان کی طرف پھر اٹھی، اس سلسلہ میں ان کے سیاسی جذبات کے ساتھ ان کی مذہبی حمیت بھی ابھری، کیونکہ فلسطین کا مسئلہ سیاسی سے زیادہ مذہبی تھا۔

نومبر ۱۹۳۶ء میں آل انڈیا فلسطین کانفرنس کی صدارت کے لئے بہ اصرار دہلی مدعو کئے گئے، اور اس میں جو خطبہ دیا، اس سے مذہبی و ایمانی غیرت اور علمی و تحقیقی بصیرت کے ساتھ ان کی مدبرانہ رائے کا اثر پورے ہندوستان پر پڑا، اس کے بعد پھر عملی سیاست سے کنارہ کش رہے۔

وہ طبعاً اور مزاجاً سیاسی لیڈر بننا بھی پسند نہیں کرتے تھے، اپنی نجی زندگی کی طرح سیاست میں بھی شرافت اور مروت کے پیکر بنے رہے، کسی سے سبقت لے جانے کی کوشش کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے، فرماتے مجھے دوسرے کو دھکا دے کر آگے بڑھنا پسند نہیں۔

وہ گرم نفسی اور شعلہ بیانی کے بھی قائل نہ تھے، ان کے ہاتھوں میں قلم برابر رہا، لیکن اپنی سیاسی زندگی میں دست و قلم کی معرکہ آرائی بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ ۱۹۲۶ء میں ہندوستان سے جو وفد حجاز گیا تھا، واپسی پر مولانا محمد علی نے کچھ ایسی تحریریں لکھیں جن سے سید صاحب کو اتفاق نہ تھا، ان کا جواب دینے کے بجائے خاموش رہے، اسی زمانہ میں وہ دہلی تشریف لے گئے تو مولانا محمد علی سے ملنے گئے، اثنائے گفتگو میں سید صاحب نے ان سے کہا کہ آپ چاہے جیسی بھی تحریریں لکھیں یا بیانات دیں میں خاموش ہی رہوں گا، مولانا محمد علی کی حاضر جوابی مشہور تھی، انھوں نے برجستہ کہا کہ یہ تحریریں اور بیانات تو آپ کو خاموش کرنے ہی کے لئے شائع کئے جا رہے ہیں، اس جواب سے خود سید صاحب بھی محظوظ ہوئے۔



وہ سیاست کو جہاں الحق کا مصداق ہوتے دیکھنا چاہتے تھے اس لیے حلق وزبان سے کام لینے کے بجائے صلح کل کی پالیسی پر گامزن رہتے، اور ضرورت ہوتی تو آشتی کے پیامبر بن جاتے۔

خلافت کی تحریک کے ابتدائی دور میں علماء اور انگریزی تعلیم یافتہ سیاست دانوں میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا، سید صاحب نے ان کے درمیان حلقہ اتصال کا کام دیا، خلافت کانفرنس کا پہلا اجلاس لکھنؤ میں ہوا، اس میں انھوں نے ایسی تقریر کی کہ مسندِ صدارت سے پائیں تک ساری مجلس بزمِ ماتم بن گئی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور چودھری خلیق الزماں وغیرہ کے سارے اختلافات دور ہو گئے۔

ان کی سیاسی سرگرمیوں کا نمایاں وصف یہ رہا کہ اپنے امعانِ نظر، اصابتِ فکر اور قوتِ قلم سے ان میں علمی، تاریخی اور تحقیقی رنگ پیدا کر دیتے، ۱۹۱۷ء میں ہوم رول سے، پہلے ہوم لیگوتج کا سوال اٹھا، تو انھوں نے اردو کی حمایت ایک ماہر لسانیات کی حیثیت سے کی، اسی سال مسلمانان ہند کی مذہبی تنظیم کا مسئلہ درپیش ہوا، تو وہاں صدر جہاں اور شیخ الاسلام جیسے عہدوں کی تجویز پیش کی، اور ان عہدوں کی اہمیت ایک دیدہ ورمورخ کی حیثیت سے پیش کی، ۱۹۱۹ء میں حسرت موہانی کو برطانوی حکومت نے نظر بند کیا تو ان کی ہائی کی تقریب میں ”نظر بندان اسلام“ کے عنوان سے معارف کے کئی نمبروں میں ایک مضمون لکھا جس میں علمی، تاریخی اور مذہبی رنگ غالب تھا۔ خلافت کی تحریک کے زمانے میں لندن میں پروفیسر مارگولیتھ اور ایک اطالوی مستشرق سے مسئلہ خلافت پر علمی نبرہ آزمائی کی، اور اس مسئلہ پر انگریزی کے مشہور رسالہ فارن افیئرز میں ایک مدلل مضمون لکھا، پھر اسی زمانہ میں خلافت اور ہندوستان، خلفائے اسلام کا اثر و اقتدار، غزنوی سلاطین کے بیعت نامے، خلافت عثمانیہ اور دنیائے اسلام، خلافت عثمانیہ اور مسیحی دنیا کا اعتراف کے عنوانات سے متعدد مضامین لکھے جن سے اس تحریک کو بڑی تقویت پہنچتی رہی، ۱۹۲۳ء میں بہار کی خلافت کانفرنس کی صدارت کی تو اپنے خطبہ میں ارض مقدس کی پوری داستان قلمبند کر دی، جب ہندو مسلم فسادات شروع

ہوئے تو اکتوبر ۱۹۲۴ء کے ”معارف“ میں ”ہندو مسلم اختلافات کی تشخیص اور اس کا صحیح علاج“ کے عنوان سے ایک پُر مغز مضمون لکھا، جس میں یہ تلقین کی کہ دونوں قومیں اپنے فاتحانہ اور مفتوحانہ جذبات سزا و انتقام کو ختم کر دیں، اور نیا دور شروع کریں جس میں گذشتہ آٹھ صدیوں کے تلخ واقعات کی یاد قطعاً موقوف کر دی جائے، اور مستقبل کی اصلاح و درستی کی خاطر حال کو ماضی کی تکرار میں برباد نہ کیا جائے، ۱۹۲۶ء میں کلکتہ میں جمعیت العلماء کے اجلاس کی صدارت کی تو اپنے خطبہ میں یہ فاضلانہ بحث چھیڑ دی کہ آیا ہر ناحیہ بعیدہ کی امت پر اپنے اپنے ناحیہ میں نصب امامت واجب ہے یا نہیں، اور اگر ہے تو اس بنا پر کہ اس کے نفوذ اقتدار وغیرہ کے شرائط پورے نہیں ہو سکتے، وہ واجب اس سے ساقط ہو جائے گا یا جس طرح جس حد تک اور جس صورت تک ممکن ہوگا اس کا ادا کرنا ضروری ہوگا، پھر مسلمانوں کی تاریخ سے ایسے حوالے دیئے کہ انھوں نے اپنی محکومی اور عدم استطاعت کی حالت میں بھی ایک نوع کی تنظیمی مرکزیت قائم رکھی تھی، اس کے لئے سلیمان تاجر، بزرگ بن شہریار، اور مسعودی کے سفر ناموں کے حوالے دے کر یہ ثابت کیا کہ مسلمان اپنی محکومی کے باوجود اپنے تمام مذہبی اور ملی کاموں میں منظم ہوں تاکہ ان میں جماعتی روح نمایاں ہو۔ اسی سال ۱۹۲۶ء میں وہ خلافت کانفرنس کا وفد لے کر حجاز گئے تو وہاں کے موتمر اسلامی میں مآثر و مقابیر پر بڑی پر زور علمی تقریریں کیں۔ اور یہ بتایا کہ مآثر یعنی وہ مقامات مقدسہ جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرام سے کوئی خاص نسبت ہے ان کی حفاظت یا ان کی تعمیر و فنا کی ممانعت سے احادیث نبوی ﷺ کے تمام دفتر خالی ہیں، اس پر اگر بحث ہو سکتی ہے تو صرف ان کی صحت اسناد یا عدم صحت سے، البتہ ان مآثر میں اگر غافل مسلمان ایسے اعمال کریں جو خلاف شرع ہوں تو دوسری چیزوں کی طرح حکومت کا فرض ہے کہ وہ ایسے نگران مقرر کرے جو زائرین کو ان کے ایسے اعمال سے باز رکھیں، رہے مقابر، تو ان کی تعمیر احادیث و فقہ کی رو سے ممنوع ہے، گو ایک فریق ایسا نہیں سمجھتا، تاہم اس کی ایک شرعی حیثیت ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ علمائے اسلام کے سامنے کھلے طریق سے اس مسئلہ کو پیش کر کے ان کے متعلق فتویٰ طلب کیا جائے۔

۲۸-۱۹۲۷ء میں ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں ساردا بل پیش ہوا جس کا مقصد یہ تھا کہ بلوغ سے پہلے نکاح قانوناً جرم دیا جائے، مسلمانوں نے اس کی مخالفت میں سیاسی رنگ پیدا کر دیا، مگر سید صاحب نے اس کی مخالفت فقہی اور شرعی پہلو سے کی، اس سلسلہ میں نکاح کے رقت حضرت عائشہؓ کی عمر کی بحث بھی چھڑ گئی، سید صاحب نے اس کا جواب عالمانہ اور محققانہ رنگ میں دیا۔ اور یہ واضح کیا کہ نابالغوں کا نکاح شرعاً جائز ہے، گو ہر حال میں مستحسن نہیں، لیکن کسی اسلامی قانون میں کسی قسم کی کمی بیشی خواہ وہ اصلاحی ہی کیوں نہ ہو، اور نیک نیتی ہی سے کیوں نہ ہو، براہ راست کسی غیر اسلامی سلطنت کے حکم اور کسی ایسی مجلس کی اکثریت سے جو مسلمان نہ ہو، ہم اپنی مرضی سے منظور نہ کریں گے اور نہ اس اصول کی خاطر لڑنا ہر طرح ہمارا حق ہے، ۱۹۳۶ء میں آل انڈیا فلسطین کانفرنس کا صدر اتنی خطبہ ان کی تانجی تحریروں کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے، یہ دنیائے اسلام میں بڑا مقبول ہوا، مصر اور شام کے اخبارات نے اس کے ترجمے کئے، مجلس اعلیٰ فلسطین کے صدر مفتی سید امین الحسینی نے خاص طور سے تاریخ بھیج کر ان کا شکریہ ادا کیا۔

سید صاحب سیاست میں محض جوش و خروش، ہجوم و آواز کے قائل نہ تھے، جوش و خروش کے دریا کی تہہ میں موتی دیکھنا چاہتے تھے، ہجوم میں اثبات کے وجود کے خواہاں ہوتے، آوازوں میں وہ تلاطم پسند نہیں کرتے جو معانی سے تہی ہو، سیاست میں ہر ذرہ کو انا لشمس اور ہر قطرہ کو انا البحر کا قائل دیکھ کر مکدر ہو جاتے تھے، وہ حق و باطل کا معیار سامنے رکھتے، اور یہ دیکھنا نہیں چاہتے کہ خورشید حقیقت پر ابر چھایا رہے، اس حیثیت سے وہ ہندوستان کے سیاسی واقعات کو دیکھنے کے عادی رہے، وہ ہندو مسلم اتحاد ہی میں ہندوستان کی بھلائی پاتے، اور اس کی برابرتلقین کی کہ اگر ہم ہندو مسلمانوں کے نزاعات کا واقعی خاتمہ کرنا چاہتے ہیں اور اس بد نصیب ملک میں خون کی ندیوں کے بدلے جوئے محبت بہانا چاہتے ہیں تو اس کا اصل علاج یہ ہے کہ آریہ سماجی روش میں تبدیلی کی جائے، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو تبلیغ اور پروپگنڈا پورے نظام کے ساتھ تقریروں، تحریروں، کتابوں،

رسالوں، اخباروں، تماشائی، ناطکوں، افسانوں اور تاریخوں کے ذریعہ پھیلا یا جا رہا ہے، ان کو یک قلم بند کیا جائے اسی کے ساتھ لازماً مسلمانوں کی مدافعت کو ششیں بھی خود بخود بند ہو جائیں گی، آریہ سماجی مقررین اور محررین اپنے بیان اور گفتگو کا موضوع اپنے مذہب کی خوبیوں اور اچھائیوں کا اظہار قرار دیں، دوسرے مذاہب کے سب و شتم نہیں، اسی طرح ہندو اور مسلمان اہل قلم تاریخ ہند کے اسلامی دور کے وہ واقعات تلاش اور یکجا کریں جن سے دونوں میں مصالحانہ روح کی ترقی ہو۔ (معارف اکتوبر ۱۹۳۴ء) مگر اس قسم کی تلقین کے باوجود ہندو مسلم کے تعلقات بگڑتے گئے، جب ساردا بل آیا، اور کچھ دنوں کے بعد دیا مندر اور وار دھا سکیمیں پیش کی گئیں تو سید صاحب کو فکر لاحق ہوئی کہ جب ہندوستان آزاد ہوگا تو کیا مسلمانوں کی ممتاز ہستی اس ملک میں قائم رہ سکتی ہے، (خطبہ صدارت جمعیتہ العلماء)، کیا اردو زبان باقی رہ جائے گی، کیا اردو زبان سے قطع نظر کرنا مسلمانوں کے لئے محال نہ ہوگا، کیا یہ ڈر نہیں کہ اس کا نام بھی مٹ جائے۔ (معارف ۱۰ اگست ۱۹۳۵ء)، کیا مسلمانوں کے مذہبی اور شخصی قوانین کا تحفظ ہو سکے گا، کیا ہندوستانی حکومت کا یہ قومی نصب العین نہ ہو جائے گا کہ ہندوستان میں ہندو تہذیب، ہندو کلچر، ہندو ادب، بلکہ ہندو حکومت قائم کی جائے، کیا ہندوستان کو بجا طور پر ہندوستان نہ بنا دیا جائے گا، اور کیا اس مقصد کے لئے آریہ سماج ستان دھومی، مہاسبائی، کانگریسی جی حضوری آزاد، ملازم سرکار اور غیر ملازم سب متفق نہ ہو جائیں گے، اور اس قوم کا ہر فرد اور ہر رکن اپنے اپنے راستے سے اس منزل مقصود کی طرف بڑھتا نہ چلا جائے گا؟ (معارف جولائی ۱۹۳۶ء)

ان ہی خدشات کی بناء پر مسلم لیگ اور کانگریس میں سخت آویزش ہونے لگی، جو تحریک پاکستان میں تبدیل ہو گئی۔ اس تحریک کے زمانے میں سید صاحب پر ملے جلے جذبات طاری رہے، اندرونی طور پر خوش تھے کہ مسلمانوں کی ایک ریاست بن جائے گی، مگر اس خوشی کے ساتھ وہ سوچتے کہ ان مسلمانوں کا کیا حال ہوگا جو ہندوستان میں رہ جائیں گے، ان کا دینی وجود اس ملک میں کیونکر قائم رہ سکے گا، اس سرزمین میں جو بقول مولانا حالی

اکال الامم (قوموں کو کھانے والی ہے) امت محمدیہ کی حفاظت کا کیا سامان ہوگا؟ سید صاحب کی مؤرخانہ نگاہ یہ دیکھنے لگی کہ یہاں برہمنوں نے اقلیت کے باوجود ساری قوم کی سرداری اور نیابت کا مرتبہ حاصل کر لیا ہے، اور وہ دوسری قوموں کو اپنے جھنڈے کے نیچے کسی نہ کسی گوشہ میں جگہ دے کر ان کو اس طرح بے خبر بناتے رہے کہ خود ان کو اپنی خبر نہیں رہی، اور پھر ان کو اچھوت، راکشش اور ملیچھ بنا کر ان کی ہستی کو کھود دیا، سید صاحب فکر مند تھے کہ کیا آئندہ ہندوستان کے مسلمانوں کا یہی حال تو نہ ہو جائے گا۔ (معارف مارچ ۱۹۴۶ء) مگر اسی تحریک کے زمانہ میں یہ پیام بھی دے گئے ہیں کوئی قوم مارے سے نہیں مرتی بلکہ اپنی اخلاقی اور ایمانی موت سے مرتی ہے۔ ہم کو اس کی کوشش کرنی چاہئے کہ مسلمانوں کو ان کی اخلاقی اور ایمانی موت سے بچائیں، جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سلطنت وقت ان کی حفاظت کی ذمہ دار ہے، اور اسی ذمہ داری کے زیر سایہ وہ اپنی زندگی کا خواب دیکھتے ہیں، وہ سخت غلطی پر ہیں، کوئی سلطنت نہیں بلکہ خود قوم اپنی زندگی کی ذمہ دار ہے، اور قوم کے نوجوانوں پر جو ملت کے سپاہی ہیں، قوم کی حفاظت کا فرض عائد ہوتا ہے، مگر یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ہماری قوت کا سرچشمہ ہماری ایمانی قوت کا خزانہ ہے اس خزانہ کی حفاظت اہنی تیغ و خنجر کے بجائے اسلام کی حفاظت کی تلوار اور ایمان باللہ کے خنجر سے ہو سکتی ہے۔ (معارف جولائی ۱۹۴۱ء)

اسلام کے اس سفیر کا یہی پیام ہونا چاہئے تھا، مگر ان کے ضمیر سے یہ بھی آواز اٹھ رہی تھی کہ کسی خطہ کو حاصل کر کے اس پر حکومت کرنے سے پہلے اپنے نفس پر آپ حکومت کرنا چاہئے، حق کے پیامبر کے لئے غیر متزلزل ایمان، احکام الہی پر بے چوں و چرا عمل، حق کی راہ میں مجاہدانہ روح، اثبات قدم، عزم راسخ، حق کے لئے ایثار اور ذاتی غرضوں کا استیصال ضروری ہے، کیونکہ دنیا کسی دعوت کو اس وقت تک قبول نہیں کرتی جب تک داعیوں کے جان و مال کا پورا امتحان نہیں لے لیتی اور دعوت کے حرفوں کو خون کی روشنائی سے نہیں پڑھ لیتی، یہ خدا کے بنائے ہوئے اصول فطری ہیں، جو کبھی نہ بدلے ہیں، اور نہ بدلیں گے۔ (معارف اپریل ۱۹۴۳ء)

یہ وہ سینا کا کوئی وعظ نہیں بلکہ ایک درد مند سفیر اسلام کے دل کی حقیقت پسندانہ آواز تھی، جو بیالیس سال پہلے لکھی گئی تھی، ماضی میں جو کچھ کہا گیا اور حال میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے اس کی صحت اور اصابت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اسی سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے سید صاحب نے تحریر فرمایا تھا کہ ایک اور نکتہ نہ بھولنا چاہئے، اسلام اور مسلمان ایک نہیں دو چیزیں ہیں، مسلمان ایک قوم کا نام پڑ گیا ہے، اس کے اسلاف پیام اسلام کے حامل اور تعلیم اسلام کے عامل تھے۔ انھوں نے دنیا پر فتح پائی اور اپنی مفتوحہ دولت اپنے اخلاف کے سپرد کر دی، زمانہ کے مرور سے یہ اخلاف بھول گئے کہ یہ انعام ان کے اسلاف کو ان کے خاص اوصاف کے صلہ میں ملا تھا، جب تک وہ اوصاف رہے وہ انعام ان کے پاس رہا، جب وہ جاتے رہے تو ان کا یہ انعام بھی چھن گیا، اب اگر اس کے حصول کی پھر تمنا ہے تو ان ہی اوصاف کو حاصل کرنا چاہئے، (معارف اپریل ۱۹۴۲ء)۔

پاکستان کے رہنے والے یہ سوچیں کہ اس کے بنانے والوں نے ان اوصاف کو حاصل کر کے اپنی تمنا پوری کی، یا کسی وجہ سے ان کی تمنا پوری ہو گئی۔ سید صاحب نے اس سلسلہ میں یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ ان اوصاف کے بغیر ہم کو کوئی چیز رعایت سے ملی بھی تو ہمارے پاس کبھی نہیں رہ سکتی (ایضاً)۔ کیا ان کا یہ لکھنا صحیح نہیں پھر ایک صحافی، یا ایک سیاست دان یا ایک سیاسی کاہن کی طرح نہیں بلکہ اسلامی ضمیر رکھنے والے اور اسلام کے ایک سفیر کی طرح یہ بھی لکھا ”ایک سوال اس سے بھی زیادہ دقیق ہے کہ فرض کیجئے کہ دنیا کے کسی گوشہ میں مسلمانوں کی ایک سلطنت کا اضافہ ہو گیا تو کیا اس سے اسلام کا پیام زندہ ہو جائے گا، اس سے مسلمان پھر مسلمان ہو جائیں گے، زیادہ سے زیادہ جو خوش کن خواب نظر آ سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم کو ایک اور طویل و عریض عراق یا شام یا مصر مل جائے گا، تو کیا اس سے اسلام کی بے کسی اور غربت میں کچھ بھی کمی ہو سکتی ہے“۔ (معارف اپریل ۱۹۴۲ء)

پاکستان بننے کو تھا بن گیا، مگر سیرۃ النبی ﷺ کے مصنف نے اوپر جو لکھا تھا اسی کی روشنی میں پاکستان کے موجودہ ڈھانچہ اور سانچہ کا مطالعہ کرنا ہے، مگر ایک روشن ضمیر، پاک

ذات اور پاک صفات شیدائی اسلام کی حیثیت سے وہ یہ پیام بھی چھوڑ گئے ہیں کہ قرآن پاک نے بنی اسرائیل کے آغاز سلطنت کے ضمن میں یہ بتادیا ہے کہ حکمرانی کی استعداد و صلاحیت کے لئے دو صفتیں ضروری ہیں۔ بسطۃ فی العلم والجسم یعنی علم و جسم کی طاقت، علم کی طاقت کے دائرے میں ایمان و تعلیم صحیح دونوں داخل ہیں۔ اور جسم کی طاقت میں اس کے سپاہیانہ جوہروں کی طرف اشارہ ہے، اور جہاد الہی کی راہ میں انفاق سبیل اللہ کی بار بار تاکید جماعت کی اقتصادی طاقت کو نمایاں کرتی ہے۔

اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرمایا کہ لوگ جسمانی و اقتصادی طاقت کی ضرورت کو تو تسلیم کریں گے، مگر ایمانی اور تعلیمی طاقت کے بارے میں ہم سے دلیل کے طالب ہوں گے، لیکن ایمان اور تعلیم کی حقیقت سمجھ لینے کے بعد یہ شک خود بخود زائل ہو جائے گا، انسان جس غرض سے کوئی کام کرتا ہے اس غرض کی صحت، اس صحت کا یقین اور اس یقین کے لئے جان فروشی کا جذبہ ایمان ہے، مسلمانوں کے جہاد کی غرض و غایت حکومت، تجارت، قومیت اور وطنیت نہیں بلکہ صرف اعلائے کلمۃ اللہ ہے یعنی اللہ کی حاکمیت علی الاطلاق کے تحت انسانوں کی دینی اخوت کا قیام اور اس مقصد کے لئے صحیح طریق و تدبیر کے علم کا نام تعلیم ہے۔ (معارف جون ۱۹۴۶ء)

ان کی اصلی اور اندرونی خواہش یہ رہی کہ عقائد و عبادات کے ساتھ اسلامی سیاسیات، اسلامی اقتصادیات، اسلامی طریق تجارت، اسلامی اصول مضاربہ (یعنی سرمایہ و مزدوری کا تعاون) اسلامی طریق کاشتکاری، اسلامی طریق کارخانہ داری، کسانوں اور مزدوروں کے اسلامی حقوق، اسلامی لین دین اور معاملات کے مسائل اور دیگر ضروری امور زندگی کے متعلق خالص اسلامی حل لوگوں کے سامنے رکھا جائے، اور اس کو قبول و عمل کی دعوت دی جائے جس سے اسلام کی نشاۃ ثانیہ ہو اور مسلمان مسلمان بن کر دنیا میں ظاہر ہوں۔ (معارف اپریل ۱۹۴۶ء)

وہ پاکستان آئے اور رحلت بھی فرما گئے، لیکن ان کی یہ خواہش اور آرزو پوری نہیں

ہوئی، شاید ان کی روح عالم بالا میں اب تک اس کے لئے بے چین اور مضطرب ہوگی۔ وہ سیاسی مقصد کی تکمیل میں جذبات، جوش و خروش اور ہنگاموں کو زیادہ مفید نہیں سمجھتے، بلکہ ان کا خیال تھا کہ کسی مقصد کے ساتھ عشق کی سی وابستگی اور اس کے حصول کی راہ میں جان و مال و عزت ہر چیز کی قربانی کا حوصلہ ہونا چاہئے اور اس راہ میں موانع کی جو مشکلیں آئیں، ان کے ازالہ اور برداشت میں صبر، ضبط، عزم، ہمت، استقلال اور اصول مقصد کے بعد اس حاصل شدہ مقصد کی بقا کے لئے اخلاق کی بلندی، عیش و آرام کی زندگی سے پرہیز، مال و دولت کی اور جاہ و قوت کی حرص و محنت سے آزادی، مختلف عناصر کے مختلف افراد کے ساتھ عدل و انصاف کے معاملہ اور مقصد کی بقا، اور ہر ذاتی منفعت اور شخصی فائدہ مندی سے برتر جاننا اور اسی کے لئے جینا اور مرنا، جب تک افراد میں اکثریت و اغللیت کے ساتھ یہ اوصاف پیدا نہ ہوں گے کوئی مقصد حاصل نہیں ہو سکتا، اور ہو بھی جائے تو باقی نہیں رہ سکتا۔ (معارف نومبر ۱۹۴۶ء)

پاکستان کے لوگ سوچیں کہ ان کے مقصد کی تکمیل میں یہ رائے کہاں تک مفید ہو سکتی ہے اور کیا یہ رائے اعلیٰ قسم کا سیاسی فلسفہ نہیں۔

میری تحریر کچھ طویل ہو گئی ہے، ایک جلیل القدر استاد پر ایک ادنیٰ شاگرد کچھ لکھتا ہے، تو اس کا قلم بے قابو ہو جاتا ہے، پھر بھی حق ادا نہیں ہوتا ہے، اس تحریر میں ایک شاگرد نے اپنے استاد کی سیاسی سرگرمیوں کی کچھ بنیادی باتوں کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی ہے، یہ جناب سید فخر الحسن صاحب کی کتاب کے ساتھ پڑھی گئی تو ممکن ہے کہ ان کے سیاسی خیالات کے سمجھنے میں معاون ہو۔

خوشی ہے کہ جناب سید فخر الحسن کی بدولت حضرت سید صاحب کی سیاسی خدمت پر ایک مستقل کتاب طبع ہو کر شائع ہوگی، امید ہے کہ یہ غور اور شوق سے پڑھی جائے گی۔

عرفانی جو بنار بنا دیا ہے۔

یہ دونوں جلدیں ہاتھ میں آئیں تو ندامت سے گردن جھک گئی کہ جو کام دارالمصنفین کے اندر ہونا چاہئے تھا وہ یہاں سے دور اس برصغیر کے سرحدی علاقہ پشاور میں انجام پایا:

تری نگاہ جسے چاہے بادہ خوار کرے

اس شرم کے باوجود کتاب کا مطالعہ شروع کیا تو ایسا معلوم ہوا کہ اس میں رشد و ہدایت کا خزانہ عامرہ کھلا ہوا ہے، روحانی معلومات کے سیم وزر کا انبار لگا ہوا ہے، سلوک و معرفت کے لئے ارغوانی کے شیشہ و ساغر کھٹکھٹاتے ہوئے دل و جان کو سرشار کر رہے ہیں، اس کتاب کی خوبی یہ بھی ہے کہ اس کے مصنف کے انداز بیان میں ان کے مرشد کے اسلوب نگارش کی جھلکیاں ہیں، پھر حضرت سلیمان اشرفی کو راہ سلوک میں جو کیف آگینی حاصل تھی، وہ خود مصنف کی ذات میں سرایت ہو کر اس کتاب کی ہر سطر اور ہر لفظ میں منتقل ہو گئی ہے، اس کتاب میں جان اس لئے بھی پڑ گئی ہے کہ علامہ سید سلیمان ندویؒ حضرت سید سلیمان اشرفی سے دبے نظر نہیں آتے، یعنی اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ کوئی مرتاض زاہد یا گوشہ گیر عابد یا کسی خانقاہ کے سجادہ نشین کے افادات و ملفوظات نہیں ہیں، بلکہ ایک ایسے محقق اسلام کی تعلیمات ہیں جن کی تحریروں میں کبھی ابن تیمیہؒ، کبھی ابن قیمؒ، کبھی غزالیؒ، کبھی مجدد سرہندیؒ اور کبھی شاہ ولی اللہؒ کے جلوئے نظر آتے رہے، انھوں نے اپنی آخری زندگی میں واردات، انتخاب شیخ، بیعت، صفات الہی، مراقبات، وحدۃ الوجود، وحدۃ الشہود، غنا، عبدیت، اجتناب، انابت، اور طلب وصول کے متعلق جو تعلیم دی، وہ محض رسمی اور روایتی نہیں ہے بلکہ ایک جید سیرت نگار کی بھی سوچی سمجھی ہوئی تعلیم ہے۔

یہ تعلیم ان کے لئے بھی چراغ راہ ہے جو تصوف کو غیر اسلامی اعمال و اشغال اور غیر شرعی بدعات، مکاشفات اور مجاہدات کا مجموعہ سمجھ کر ان کو نظر انداز کرتے ہیں، اس کے مطالعہ سے ظاہر ہوگا کہ صحیح حدیث میں احسان کے ذریعہ سے جس طرح مذہب کی روح

## سلوک سلیمانی پر ایک نظر (۱)

پشاور یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے پروفیسر محمد اشرف خان نے اپنی تصنیف سلوک سلیمانی یا شاہراہ معرفت کی دو جلدیں دارالمصنفین کو کیا بھیجیں کہ وہاں بیٹھ کر یہاں کے لوگوں کے لئے روحانی انبساط کا ایک خوانِ یغما بچھا دیا۔

ان دونوں جلدوں میں حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی صوفیانہ اور عارفانہ تعلیمات ہیں، وہ دارالمصنفین کے قیام میں اپنے شاگردوں اور عقیدت مندوں کی نظروں میں ایک بے مثال عالم، ایک بلند پایہ مفسر، ایک بے عدیل سیرت نگار، ایک غیر معمولی متکلم اسلام، ایک دیدہ ورمورخ اور ایک نامور ادیب و انشاء پرداز رہے، ان کی وجہ سے دارالمصنفین کا یہ دور افتادہ گوشہ عافیت علم و فن کا ایک حصن حصین بن گیا تھا، وہ جب اپنے آخری ایام زندگی میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بیعت ہوئے تو ان میں عظیم انقلاب آیا جس سے دارالمصنفین کو سلوک و معرفت کا بھی چشمہ حیوان بنا چاہئے تھا، مگر یہاں کے لوگ بحر ظلمات کو طے کر کے اس کے آب حیات کو نہ پاسکے، لیکن اس کے امرت دھارا سے سب سے زیادہ سیراب کراچی کے جناب غلام محمد صاحب اور پشاور کے پروفیسر محمد اشرف خان صاحب ہوئے، جناب غلام محمد نے جو کچھ حاصل کیا، اس کو ”تذکرہ سلیمان“ میں منتقل کیا، پروفیسر محمد اشرف خان نے اپنے مرشد کے یہاں سے سلوک و طریقت کا جو آب زلال پایا اس کو اپنی تصنیف ”سلوک سلیمانی یا شاہراہ معرفت“ میں دنواں

بیدار کی گئی یا اخلاق میں جو جان ڈالی گئی، ایمان میں جو کمال پیدا کیا گیا وہی تعلیم حضرت سید صاحبؒ نے تصوف کے ذریعہ سے دی، یعنی حقیقی اور شرعی تصوف دین کی روح ہے، یہ اخلاص فی اللہ اور علم حصول تقویٰ کا نام ہے، یہ نوافلاطونی نظریہ، اشراقی حکمت، رواقی دستور، مثالی، عقیدہ، ہندی ویدانت اور مسیحی رہبانیت سے بالکل الگ چیز ہے، اگر اس میں احکام الہی کی تعمیل و تکمیل کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات جمیل کی جلوہ سامانیوں کی ضیا پاشیاں نہ ہوں تو یہ تصوف نہیں، کچھ اور چیز ہے، اسلامی تصوف میں جمال نبوی ﷺ ہی سے دین میں روح، ایمان میں جان اور قلب میں تزکیہ پیدا ہوتا ہے، ایک سیرت نگار کی تعلیم یہی اور صرف یہی ہو سکتی تھی۔

حضرت سید صاحب کی اسی تعلیم کی روح پر ور شرح اس کتاب کی دونوں جلدوں میں ہے، اس کی اشاعت سے پہلے اسی عنوان سے مصنف کی کچھ تحریریں پڑھ کر مولانا عبدالباری ندوی مرحوم نے تحریر فرمایا تھا کہ انشاء اللہ اثر فی سلوک سلیمانی قالب میں قلم اشرف سے اشرف السلوک ہی ثابت ہوگا، اسی زمانہ میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے بھی لکھا کہ یہ نام کے اشرف کام کے لحاظ سے بھی اشرف نکلے، جس کسی کو بھی اس کتاب کے مطالعہ کا موقع ملے گا وہ ان دونوں بزرگوں کی رائے سے نہ صرف اتفاق کرے گا بلکہ اس کو غیر شعوری طور پر یہ بھی احساس ہوگا کہ اگر کسی کو اخلاص دین، اخلاق باطن، تہذیب نفس، صفائی روح اور تعلق مع اللہ تعالیٰ کی تعلیم کی تلاش ہو تو وہ اس کو اس کتاب میں ضرور مل جائے گی، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے فرمایا تھا کہ:

از سلیمان گیر اخلاص عمل

اسی اخلاص عمل کی تعلیم و تلقین کے آبدار موتی اس کتاب کی ہر سطر میں جھلکاتے

نظر آتے ہیں۔

## سید صاحبؒ کی اہلیہ محترمہ (۱)

کراچی کے ایک مکتوب سے یہ المناک خبر ملی کہ استاذی المعظم حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی اہلیہ محترمہ ۲۳ جولائی ۱۹۸۷ء کو اپنی اولاد کو آنسوؤں کے سیل رواں میں چھوڑ کر عالم جاودانی کو سدھاریں۔ ”إنا لله وإنا إليه راجعون“۔

یہ تعزیتی تحریر دارالمصنفین کے احاطہ میں اس گھر میں لکھی جا رہی ہے جہاں حضرت استاذی المحترم نے اپنی زندگی کے بہترین بلکہ بہار آفریں اور مشک آگیں دور گزارے ہیں، وہ یہاں کے کتب خانہ میں اپنی میز پر سیرۃ النبیؐ، معارف کے شذرات اور علمی، مذہبی اور ادبی مضامین میں اپنے علم و عرفان کے مردارید، نظر و فکر کے زمرہ دار ادب و انشاء کے درشا ہوار بکھیر کر اس گھر میں داخل ہوتے تو پہلے اپنی سب سے چھوٹی اولاد کو اپنی آغوش شفقت میں لیتے، پھر ان کی اور اولادیں ان کے بچپن میں بیٹھ جاتیں، جس کے بعد علمی میز پر ان کو جو تکوان ہوتی وہ یکا یک دور ہو جاتی، اور ان کے چہرے پر بشارت، ان کی ہر ادا میں نزہت اور ان کی بزرگی میں روحانیت دکھائی دیتی، وہ اپنے بچوں کے شگفتہ چہروں کو دیکھتے تو ان کی آنکھیں جنت نگاہ بن جاتیں، اُن کی معصوم باتوں کو سنتے تو ان کے کان فردوس گوش بن جاتے، پھر فضا میں پدری مہر و محبت کی کوثر و سلسبیل بہتی نظر آتیں، اسی فضا میں ان کی اہلیہ محترمہ نے بھی زندگی گزاری، اس گھر میں وہ تقریباً ۱۸ برس رہیں۔

(۱) سید صباح الدین صاحب نے اپنی وفات سے چند ماہ قبل اگست ۱۹۸۷ء کو معارف کے شذرات میں یہ مضمون

تحریر فرمایا تھا، عنوان مرتب کا وضع کردہ ہے۔

سید صاحبؒ اپنی گھریلو زندگی میں بہت ہی نفاست پسند تھے، ان کی ہر چیز بہت سلیقہ، صفائی، اور ستھرائی سے رکھی رہتی، مرحومہ بھی فطری طور پر بہت ہی سلیقہ مند، مہذب، عبادت گزار اور باوقار تھیں، جس سے سید صاحبؒ کو اپنی زندگی گزارنے میں بڑی مدد ملتی رہتی، دارالمصنفین کی قلیل آمدنی میں دونوں کی زندگی نہ صرف صاف ستھری بلکہ کیف و سرور سے معمور رہی، وہ سید صاحبؒ کے ساتھ بھوپال بھی گئیں، پھر کراچی منتقل ہو گئیں، لیکن آخر وقت تک فرماتی رہیں کہ جو مسرت اور انبساط بھری زندگی دارالمصنفین میں گزری وہ کہیں اور نہیں ملی۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کو چار بیٹیوں اور ایک بیٹے سے نوازا، سید صاحبؒ کی پہلی اہلیہ محترمہ مرحومہ سے ایک بیٹے عزیز ی ابو سہیل خوش گوار زندگی گزار رہے ہیں، مرحومہ اپنی محبت بھری وضع داری میں جب کبھی کوئی خط لکھتیں تو آخر میں والدہ ابو سہیل ہی لکھ کر اس کو ختم کرتیں، ان کے فرزند ارجمند عزیز ی ڈاکٹر سلمان ندوی نے اپنا نام علمی دنیا میں اونچا کیا ہے، لیکن وہ اپنی عالی ظرفی میں والدہ سلمان لکھنے کے بجائے زیادہ تر والدہ ابو سہیل ہی لکھنا پسند کرتیں۔

وہ اپنی تمام اولاد کو اپنی زندگی میں آباد، خوش اور خرم دیکھ کر اس دنیا سے رخصت ہوئیں، اپنے نواسے، نواسیوں، پوتے اور پوتی کی زندگی کی بہاریں بھی دیکھیں، ایک خوش نصیب کی حیثیت سے اس دار فانی سے رخصت ہوئیں، البتہ اپنے نامور اور ہر دلعزیز شوہر کی وفات کے بعد تقریباً ۳۴ سال بیوگی کی زندگی گزاری، مگر ان کی یادوں کی جوت جگا کر ہر طرح شاکر اور مطمئن رہنے کی کوشش کی، ان کی وفات کے ۱۶ برس کے بعد حکومت پاکستان نے ان کے لئے ایک وظیفہ مقرر کر دیا تھا، یہ کوئی بڑی رقم نہ تھی، مگر قناعت، توکل، صبر اور رضا کو اپنی نسوانی زندگی کا زیور اور ہنسی خوشی کے زیور کو اپنے گلے کا ہار بنا کر بچوں کے ساتھ زندگی گزار دی۔

یہ راقم ۱۹۳۵ء سے ان کی زندگی کی آخری لمحات تک ان کی مخلصانہ شفقت کی

تسلیم سے سیراب ہوتا رہا، ایک ماں کی مہر و محبت کی جتنی ضیاء باری ہو سکتی ہے، وہ ایک حقیقت بن کر میری زندگی کے ذرہ ذرہ میں چمکتی رہی، میری جوانی ایک اندوہناک سانحہ سے بالکل برباد اور تباہ ہونے کو تھی، لیکن انھوں نے دستگیری کی، اور اس کو سنوار کر از سر نو بسر کرنے میں فرشتہ رحمت بن گئیں، ۱۹۵۵ء سے کراچی بار بار جاتا رہا ہوں، یہ شہر میری نگاہوں میں اس لئے جاذب ہے کہ یہیں استاذی احترام کا مزار پر انوار ہے، پھر جب وہاں پہنچ کر مرحومہ کی خدمت میں حاضر ہوتا، تو ایسا معلوم ہوتا کہ مہر مادری کی مہتابی چھٹکی ہوئی ہے، اور میں گلشن محبت کی خوشبوؤں سے معطر ہو رہا ہوں، گذشتہ مہینہ پاکستان کے سفر میں ۳ جولائی ۱۹۸۷ء کو ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ اپنی تشویشناک علالت کی وجہ سے نیم بے ہوشی کے عالم میں تھیں، ان کی آنکھیں کھلیں تو پہچانا، ہاتھ پکڑ کر بولیں بیٹا! اچھا ہوا تم آ گئے، آخری ملاقات ہو گئی، اب دنیا سے رخصت ہو رہی ہوں، ان پر موت کا کوئی ہراس طاری نہ تھا، مجھ کو دیکھ کر ان کی اگلی سی توانائی آ گئی، زندگی کی بزم رفتہ کی کہانی شروع کر دی، اس وقت ایسا معلوم ہوا کہ وہ قضاء کی دہن بنی ہوئی ہیں، ۱۶ جولائی تک ان کی عیادت کے لئے برابر حاضر ہوتا رہا۔

حضرت سید صاحبؒ کی سیرۃ النبیؐ جلد ہفتم پر پاکستان کے صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے ایک لاکھ روپے کے انعام کا اعلان کیا تھا، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے یہ طے فرمایا تھا کہ اس میں سے ۵۰ ہزار روپے کی رقم مرحومہ کی خدمت میں پیش کی جائے، اور بقیہ ۵۰ ہزار دارالمصنفین کو ملے، کوشش تھی کہ یہ رقم، مرحومہ کی زندگی میں ان کے پاس پہنچ جائے، تاکہ ان کو کم از کم یہ تشفی ہو کہ ان کو بھی اپنے نامور شوہر کی علمی ناموری سے کچھ نہ کچھ مادی اور مالی فائدہ پہنچا، مگر یہ رقم ان کے پاس اس وقت پہنچی، جب وہ کائنات کی ساری دولت سے بے نیاز ہو چکی تھیں۔

حضرت سید صاحبؒ کے روحانی خلیفہ جناب مولانا غلام محمد نے اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا:

”وقعت الواقعة“ کل بروز پنج شنبہ ۲۶/ ذی قعدہ ۱۴۰۷ھ/ ۲۳ جولائی ۱۹۸۷ء کو صبح کے ٹھیک ۷ بجے علیا پیرانی صاحبہ رحلت کر گئیں، بڑے سایہ شفقت اور بڑی دعاؤں کی پشت پناہی سے ہم سب محروم ہو گئے، اللہ تعالیٰ مرحومہ کی مغفرت کرے، اور درجات عالیہ عطا فرمائیں، آخر وقت تک وہی بے ہوشی کی سی کیفیت رہی، نماز جنازہ جامع مسجد بیت المکرم گلشن اقبال میں نماز عصر کے فوراً بعد پڑھی گئی، امامت کی سعادت سلمان میاں اور سب اہل خانہ کے اصرار پر راقم حقیر ہی کے حصہ میں آئی، ماشاء اللہ! پیرانی صاحبہ پر سکینت کا یہ عالم تھا کہ جیسے ہی جنازہ کے قریب آیا، محسوس ہوا کہ کسی نے میر سینہ میں برف رکھ دی، جنازہ میں اہل اخلاص و محبت کا خاصا اجتماع رہا، مولانا نظم ندوی، پروفیسر فخر الحسن، حاجی علی محمد صاحب، مولانا عبدالشکور، جناب نومی والا اور آپ کے داماد ڈاکٹر راشد مصطفیٰ وغیرہ شریک تھے، بیت المکرم کے وسیع رقبہ میں سات بڑی صفیں ہو گئی تھیں، الحمد للہ ریڈیو پر بھی اطلاع نشر ہوئی، اخباروں میں بھی خبر چھپی، گورنر سندھ اور عائدین حکومت کی طرف سے اخبارات میں تعزیتی بیانات چھپے، ملک پلانٹ سے متصل قبرستان میں ایک صاف ستھری جگہ پر ایک نیم سایہ دار درخت کے نیچے مرحومہ کی ابدی خواب گاہ بنی ہے، رحمہا اللہ تعالیٰ رحمۃ دائماً، یوں تو گھر کا ہر فرد و فور غم میں مبتلا تھا مگر میری اہلیہ بتا رہی تھیں کہ سنجھلی اور چھوٹی صاحبزادیوں کا حال بہت ہی برا تھا، مگر ہمت سے کام کر رہی تھیں، پیرانی صاحبہ کو غسل خود صاحبزادیوں نے اپنے ہاتھوں سے دیا، ماں کی کیسی خوش نصیبی اور بیٹیوں کی کیسی سعادت اندوزی ہے۔“

وہ وہاں جا چکیں جہاں سب کو ایک روز جانا ہے، اپنے جلیل القدر شوہر کی ناموس عظمت کو اپنی زندگی میں جس زہد و عبادت سے برقرار رکھا اور پھر جس سے ملیں اس کو اپنی بزرگانہ محبت سے جس طرح سرشار کیا، اور اپنے پیچھے اپنے آن بان کی جو روایتیں چھوڑ گئی ہیں ان کی یادوں کی شمع روشن کر کے ان کی اولاد ان کی خوبیوں کے جلووں سے اپنی خلوتیں آباد کرتی رہے، ان کے جاننے اور ملنے والوں میں کون ہے جو ان کو یاد کر کے سو گوار نہ ہوگا،

میرے لئے ان کی یاد کی بے کلی مخزن تسکین بنی رہے گی، حضرت سید صاحب کے سایہ عاطفت اور مرحومہ کی شفقت مادری کے جلو میں دارالمصنفین کے احاطہ کی زندگی میں جو کشش، یہاں کی سحر میں جو دلکشی، یہاں کی شام میں جو دلفریبی اور یہاں کی رات میں جو دل افروزی پائی، ان کی یادوں کے غم کو آغوش میں لے کر چشم اشک آگیں کے ساتھ بقیہ زندگی گزرے گی، دعا ہے کہ سیرۃ النبیؐ کے پاک ذات اور پاک صفات مصنف کی شریک حیات کی تربت کو اللہ جل شانہ اپنی رحمتوں اور برکتوں کے پھولوں سے ہمیشہ نکھت بیز رکھے، آمین ثم آمین۔

کل من علیہا فان ویبقی وجہ ربك ذوالجلال والاکرام۔



## حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندویؒ کی خیام پر ایک نظر<sup>(۱)</sup>

حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ اپنے لکھنے پڑھنے کی میز پر بیٹھ جاتے تو اُن کے شاگردان کو دیکھ کر محسوس کرتے کہ ان کے استاذ علم کے لئے ہیں اور فن ان کے لئے ہے، وہ یہ بھی تصور کرتے کہ اس وقت نظر کی نسیم نو بہاری اُن کے قلم کو چوم رہی ہے، اور فکر کی شیم انگیزی ان کی تحریروں کو معطر کر رہی ہے اور محنت و ریاضت ایک مینا نگار ساغر میں ان کے سامنے تلاش جستجو اور تحقیق کی مئے ارغوانی پیش کر رہی ہے، یہ محض ان کے شاگردوں کی نظر تحسین نہیں تھی، بلکہ ان کے ہم جلیس بھی اُن کے جسم کو چھو لیتے تو ان کو ایسا معلوم ہوتا کہ اس میں صرف گوشت و پوست ہے، ہڈیاں نہیں، وہ کہتے کہ اُن کے جسم کی ہڈیاں ان کی علمی مشقت کی وجہ سے محلول ہو گئی ہیں، ان کی علمی زندگی کا یہ شیوہ رہا، کہ جو کچھ لکھتے بڑی عرق ریزی، تحقیق اور تدقیق کے ساتھ لکھتے، قرآن مجید کی آیتیں ہوتیں تو ان کے شان نزول، مطالب، معانی، فصاحت اور بلاغت کا تدبر بڑے غور و فکر کے ساتھ کرتے، اس لئے بہت بڑے ماہر قرآنیات سمجھے گئے، حدیث کا کوئی ٹکڑا ہوتا تو اس کو روایت و روایت کے

(۱) سید صباح الدینؒ کی تصنیف ”مولانا سید سلیمانؒ کی تصانیف ایک مطالعہ“ میں خیام پر جو مضمون ہے وہ اس سے کسی قدر مختلف ہے۔ اس کے بعض مباحث اس میں شامل نہیں اس لئے جناب خلیق انجم صاحب کے مرتب کردہ مجموعہ مقالات شائع شدہ انجمن ترقی اردو ہند سے اخذ کر کے اس میں شامل کیا گیا ہے۔ یہ مقالہ انجمن کے زیر اہتمام سید صاحب کی صدی تقریب ولادت کے موقع پر پڑھا گیا تھا۔

اصول کے اعلیٰ معیار سے پرکھتے، اسی لئے ان کی محدثانہ فضیلت بھی تسلیم کی گئی، فقہ کے جزئیات کے استنباط کرنے میں اپنے ذہن کو پورے طور پر بیدار رکھتے، اس لئے انھوں نے فقہی مسائل پر جو کچھ لکھا اس سے کسی کو اختلاف نہیں ہوا، وہ کلامی دلائل کے ساتھ کچھ فکری چیزیں لکھتے تو ان کی راسخ العقیدگی جلو میں برابر رہتی، تاریخ کا مطالعہ کر کے نتائج اخذ کرنے میں بڑی بصیرت کا ثبوت دیتے، اس لئے وہ ایک اعلیٰ پایہ کے مؤرخ بھی سمجھے گئے، وہ اپنے معاصروں سے بڑی محبت کرتے، ان میں سے کسی سے علمی یا مذہبی اختلاف تو ہوا، لیکن ذاتی اختلاف سے ان کا دامن پاک رہا، اس لئے اپنے معاصرین کی نظروں میں بھی محترم رہے، سیاست میں آئے نہیں، لائے گئے لیکن اس میدان میں بھی مذہبی جذبات اور خودداری لئے رہے، ان کے ان خوددارانہ جذبات کی قدران کی سیاسی زندگی میں ہوتی رہی، شعر و ادب پر ان کا قلم چلتا تو نکتہ وری اور سخن سنجی کی پریاں ادبی افق سے ان کی تحریروں میں اترتی نظر آتیں۔

ان کی سب سے پہلی علمی تصنیف ”ارض القرآن“ ہے، جس کو انھوں نے ایسی گہرائی اور گیرائی سے لکھا ہے کہ تحقیق کا وزن اور وقار اس سے اونچا ہوا۔ یہی وزن اور وقار سیرت عائشہ میں تحریر کے ادب و احترام کے ساتھ مل کر دوسرے انداز میں نمودار ہوا ہے، اور جب ”سیرۃ النبیؐ“ لکھنی شروع کی تو یہ وزن اور وقار انتہائی عروج کو پہنچ گیا، اس میں رسول اللہؐ کی حیات طیبہ پیش کرنے میں سیرت نگاری کے فن کے سلسلے میں قرآن مجید کے رموز اور حدیث کے نکات کے میل اور فقہ کی پیچیدگیوں کو نبھانے میں ان کا متکلمانہ انداز بیان، ان کے فہم و ادراک کے سدرة المنتہی کو چھوٹا نظر آتا ہے۔ ان کی ”خطبات مدراس“ میں ادب و انشا کے پھول بکھرے نظر آتے ہیں، مگر کسی حال میں تحقیق کا دامن نہیں چھوٹا ہے، ان کی زبانی اس خاکسار نے سنا کہ ”عرب و ہند کے تعلقات“ لکھنے میں پچیس برس صرف ہوئے۔ ان کی ”یاد رفتگان“ میں ان کے آنسو جھلملاتے ہوئے ادبی موتی بن گئے ہیں، ان کی ”برید فرنگ“ میں ان کے سیاسی جذبات کا تلاطم اور تموج دکھائی دیتا ہے، اور

ان کی ”نقوش سلیمانی“ میں شعروادب کے گل ویا سمن کے گلدستے نظر آتے ہیں۔  
ان کی مشہور تصنیف ”خیام“ میں ان کی تحقیق، بصیرت اور تحریر کی یہی ساری جلوہ  
سامانیاں نظر آئیں گی۔

خیام مشرق سے زیادہ مغرب میں مقبول ہوا، فریڈرک روزن نے لکھا ہے کہ  
مشرق کے کسی شاعر کو اتنی مقبولیت نہیں ملی، جتنی خیام خیمہ دوز کو ہوئی، مغرب میں اس سے  
دلچسپی اس کی رباعیات کے انگریزی ترجمہ سے ہوئی، جوفٹز جیرالڈ نے کیا، اس کی ۱۰۱۰ رباعیوں  
کا ترجمہ ایسا مقبول ہوا کہ انجیل کی عبارت کے بعد انگریزی بولنے والوں کی زبان پر یہی  
اشعار ہوتے۔

خیام کی رباعیات جرمن، فرانسیسی اور روسی زبانوں میں بھی ترجمہ ہوئیں۔ یورپی  
مصنفوں میں زکووسکی، ڈینی سی راس، ای، جی براؤن، ارتھر کر سٹینسن، اولو روتھ فولڈ اور سی،  
رالف روزن وغیرہ نے خیام سے بڑی دلچسپی لی ہے لیکن اس کی ذات سے بے سرو پا  
کہانیاں، داستانیں، افسانے اور دوسرے مصنفوں کی بعض تصانیف اور کچھ دوسرے  
شاعروں کی رباعیات ایسی منسوب ہو گئیں کہ وہ ایک رند مشرب شاعر کی حیثیت سے مشہور  
ہو گیا، جو شراب اور عورتوں کے پیچھے دیوانہ رہا، جرمن مستشرق ہمیر نے اس کو آزاد خیال اور  
مذہب کا تمسخر اڑانے والا شاعر بتایا، لارڈ ٹینس نے لکھا کہ یہ تمہارا عمر ایک عظیم کافر ہے،  
ٹامس کارلائل نے اس کو ایک ایرانی پاجی اور فحش گو (BLACK GUARD) کی حیثیت  
سے پیش کیا، اور ایک انگریز پادری نے اس کو ہر مجسٹی ابلیس کا سفیر اعظم اور معزز قاصد کہا  
(مزید تفصیلات کے لئے دیکھئے: مولانا شبلیؒ اور عمر خیام از آر ایف بھاجی والا،  
ص: ۵۶-۵۴) ان تمام غلط فہمیوں کو پہلی دفعہ مولانا شبلیؒ نے شعر العجم جلد اول میں اور پھر  
مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس زیر نظر اپنی کتاب ”خیام“ میں دور کیا۔

”شعر العجم“ کی پہلی جلد میں عمر خیام پر صرف ایک باب ہے جو ۳۱ صفحہ پر مشتمل  
ہے اس میں تفصیلات کی گنجائش بھی نہ تھی، البتہ خیام کی شاعری کے متعلق جو غلط فہمیاں تھیں

ان کو بڑی حد تک دور کیا، ”شعر العجم“ میں جو کمی رہ گئی تھی، اس کو مولانا سید سلیمان ندویؒ  
نے عمر خیام پر ۴۸۷ صفحے کی کتاب لکھ کر پورا کیا، جس میں وہ اپنی پوری تحقیقی شان سے  
دکھائی دیتے ہیں، جب کبھی دنیا کی اعلیٰ ترین تحقیقی کتابوں کی فہرست تیار کی جائے گی تو اس  
میں اردو کی یہ کتاب ضرور شامل کی جائے گی، اور جس وقت نظر سے یہ لکھی گئی ہے اردو میں  
اس سے پہلے شاید کوئی اور کتاب نہیں لکھی گئی، خیام کی شاعری کے علاوہ اس کے حالات اور  
تصانیف کو مصنفوں نے بہت ہی گنجلک اور گمراہ کن بنا دیا تھا، سید صاحبؒ نے اپنی کتاب  
میں خیام سے متعلق ہر چیز کو مٹھ کیا ہے، انھوں نے گذشتہ مصنفوں کی بے شمار باتوں سے  
اختلاف کیا ہے، اسی لئے اس کتاب کے ہر صفحے میں ان کی دیدہ وری اور تحقیق اُس کی  
اصل جان ہے۔

اس کتاب کی ابتدا خیام کے مآخذ و مصادر کے ناقدانہ تبصرے سے ہوئی ہے۔  
اس میں جیسی عالمانہ بحث کی گئی ہے۔ ویسی کم دیکھنے میں آتی ہے، اس میں فرانسیسی مستشرق  
پروفیسر ہوٹسیا، روسی مستشرق والٹین زکوووسکی، انگریز مصنف ڈینی سن راس، پروفیسر ای،  
جی، براؤن اور علامہ عبدالوہاب قزوینی نے جن مآخذوں کا ذکر کیا ہے، ان سب کے نام  
تفصیل سے لکھ دئے ہیں پھر آخر میں بڑے وثوق کے ساتھ اپنی طرف سے ان مآخذوں  
کے نام لکھے ہیں، جو صحیح ترتیب زمانی کے لحاظ سے قابل اعتبار ہیں، ان مآخذوں سے وہ  
اہل قلم پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں، جو خیام پر تفصیل سے کچھ لکھنا چاہتے ہیں، اپنی اس بحث  
میں وہ مذکورہ فاضل مصنفوں کی کچھ باتوں سے اختلاف بھی کر گئے ہیں، مثلاً زکوووسکی کے  
متعلق لکھا ہے کہ اس نے حکیم خیام کی ۸۴ رباعیات نقل کی ہیں، لیکن اس نے دوسرے  
شعراء کی رباعیات میں ان کو مخلوط کر دیا ہے (ص: ۴) ڈینی سن راس کے متعلق لکھا ہے کہ  
اس نے خیام کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات کی تعیین کی نام تمام کوشش کی ہے۔ (ص: ۵)  
اوٹور وھینلڈ کی ایک کتاب ”عمر خیام اور اس کے زمانہ“ کے نام سے تارپور والا بمبئی نے  
شائع کی ہے۔ اس کے متعلق سید صاحب لکھتے ہیں کہ گولفسی خیام کو اس نے سمجھنے کی سب

سے بہتر کوشش کی ہے مگر کتاب حشو و زوائد سے پاک نہیں (ص: ۱۴)، خیام کے حالات زندگی بہت ہی نا صاف اور گنجلک تھے۔ سید صاحب نے ان کو پہلے صاف اور مٹھ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کو خیال ہوا کہ خیام کی زندگی کے ساتھ یہ واقعہ مشہور کر دیا گیا ہے، کہ وہ نظام الملک اور حسن بن صباح کا ہم درس تھا، اگر اس کے غلط اور صحیح ہونے کی نوعیت معلوم ہو جائے، تو پھر اس کی زندگی کے سنین متعین ہو سکتے ہیں، اس واقعہ کا بڑا گہرا تجزیہ کیا ہے، جن ماخذوں میں اس کا حوالہ ہے، یا جن بیانات میں اس کا ذکر ہے، ان پر ایسی عالمانہ بحث کی ہے، کہ اس سے ان لوگوں کو شاید دلچسپی نہ ہو، جو ملکی پھلکی تحریریں پڑھنے کے عادی ہیں، مگر وہ گوشہ گیر اہل نظر جن کو تحقیق و تدقیق سے لگاؤ ہے، ایسی بحث سے بہت ہی لطف اندوز ہوں گے، حضرت سید صاحب سارے ماخذوں اور بیانات کا تجزیہ کر کے اس نتیجے پر پہنچے ہیں، کہ یہ واقعہ من گھڑت ہے، جو خیام کی زندگی کے بہت بعد اس کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے، ان کے دلائل یہ ہیں کہ خیام کی مستند تاریخ ولادت پورے سند کے ساتھ ۴۸۰ھ یا ۴۸۱ھ بتائی جاتی ہے، یعنی نظام الملک، عمر خیام کی پیدائش سے چالیس سال پہلے پیدا ہوا، دونوں ہم درس کیسے ہو سکتے ہیں، اسی طرح حسن بن صباح کا بچپن رے میں گزرا، اور خیام کی پیدائش نیشاپور میں ہوئی، وہیں اس کی ابتدائی تعلیم ہوئی، اس لئے حسن بن صباح اور خیام کا مکتب میں ہم درس ہونا ممکن نہیں، فرانسیسی مستشرق پروفیسر ہوٹسما نے پہلی دفعہ ان تینوں کی ہمدردی کو مشکوک بتایا تھا، لیکن سید صاحب نے اس کو یقینی طور پر بے سرو پا اور من گھڑت ثابت کیا۔

اس کے بعد سید صاحب نے خیام کی وفات اور ولادت کے سنین کی تعیین کی ہے، وہ مختلف شواہد کے گہرے مطالعے سے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ عمر خیام نے ۵۰۶ء میں وفات پائی اور اس کی ولادت ۵۴۴ء میں ہوئی۔ ۱۹۴۱ء میں سوامی گووند تیرتھ نے عمر خیام پر انگریزی میں ایک کتاب ”دی ٹکٹار آف گرلیس“ کے نام سے لکھی، انھوں نے زچ ایلیخانی کی مدد سے خیام کا زائچہ تیار کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اس کی ولادت ۴۴۰ھ میں ہوئی، جو

عیسوی سن کے لحاظ سے تاریخ ۱۸ مئی ۱۰۴۸ء ہوتی ہے، مگر ان کا بیان ہے کہ خیام کے مزار پر اس کی تاریخ وفات ۱۲ محرم ۵۱۶ھ لکھی ہوئی ہے، اس سے سید صاحب کی تحقیق کی تائید نہیں ہوتی ہے، لیکن سید صاحب کا ماخذ چہار مقالہ عروضی ہے، خیام اس کے مصنف کا استاذ تھا، اور یہی مصنف لکھتا ہے کہ اس نے ۵۲۲ھ میں استاذ کی خدمت میں حاضری دی، پھر حج کو چلا گیا، تین سال کے بعد واپس آیا، تو دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ استاذ نے وفات پائی؟ پھر ان کے مرقد کی زیارت کو نیشاپور گیا۔ اب یہ کیسے یقین کر لیا جائے کہ خیام کی وفات ۵۱۶ھ میں ہو گئی تھی! شاید مزار کا کتبہ پڑھنے میں تسامح ہوا ہو۔

تاریخ الفی کے مؤلف احمد نصر اللہ ٹھٹھوی (م ۱۰۰۰ھ) نے خیام کا وطن قریہ شمشاد تابع بلخ یا قریہ سنگ تابع استرآباد بتایا ہے، فریڈرک روزن نے بعض کتابوں کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس کا مولد لو کر تھا جو رودخانہ مرغاب کے کنارے شہر میرورود کے قریب تھا۔ سید صاحب نے ان دونوں کے بیان کی تردید کی ہے، اور پورے وثوق کے ساتھ لکھا ہے کہ اس کا مولد نیشاپور تھا۔

سید صاحب لکھتے ہیں کہ تمام مؤرخین کا اتفاق ہے کہ خیام کا نام عمر اور اس کے باپ کا نام ابراہیم تھا، لیکن مولوی عبدالرزاق کانپوری نے اپنی مشہور تصنیف نظام الملک طوسی میں لکھا ہے کہ عمر کے باپ کا نام عثمان تھا، اور عمر خیام خاقانی شروانی کا چچا تھا۔ ان کو خاقانی کے جس شعر سے یہ غلط فہمی ہوئی اس کی تفصیل بتا کر سید صاحب نے ان کے اس بیان کی تردید کی ہے۔ سید صاحب لکھتے ہیں کہ عمر عام طور سے خیام کی نسبت کے ساتھ مشہور ہے۔ اس کو کبھی کبھی خیامی بھی لکھا گیا مگر ربا عیات میں وہ خیام ہی لکھتا ہے، خیام کے معنی خیمہ دوز کے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے خاندان میں خیمہ دوزی کا پیشہ ہوتا تھا۔ اس مناسبت سے وہ خیام کے نام سے مشہور ہے۔ بعض مصنفوں نے اور خصوصاً فریڈرک روزن نے خیمہ دوزی کی نسبت عمر خیام کی بزرگی کے خلاف جان کر خیام کے معنی خیمہ ساز کے بجائے خیمہ نشیں لئے ہیں، اور کچھ مصنفوں نے اس کو عرب کا کوئی قبیلہ بتانے

کی کوشش کی ہے، سید صاحب نے ان تمام باتوں کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ خیال کہ خیمہ دوزی کے خاندانی پیشے سے ہمارے ایک عالی مرتبہ فلسفی اور بلند مرتبہ شاعر کی توہین ہوتی ہے، غلط ہے۔ مساوات پسند اسلام کی تاریخ میں ایسی ہستیاں ہیں، جو ادنیٰ خاندانی پیشوں کی نسبت کے باوجود مشاہیر فن اور اکابر علم کی فہرست میں داخل ہیں امام محمد غزالیؒ سوت کا تنے والے تھے، فقہ حنفی کے مشہور امام شمس الائمہ حلوائی تھے، وحدۃ الوجود کے مشہور مبلغ حسین بن صلاح نداف تھے، حلاج کے معنی ہی نداف کے ہیں۔

مولوی عبدالرزاق نے اپنی کتاب نظام الملک طوسی میں لکھا ہے کہ خیام نے تابل کی زندگی اختیار نہیں کی، اور ہمیشہ مجرد رہا۔ لیکن سید صاحب نے اس کی بھی تردید کی ہے، اور مستند حوالہ سے بتایا ہے کہ اس نے تابل اختیار کیا اور کم از کم اس کی اولاد میں ایک لڑکی تھی، جس کی شادی اس کی زندگی ہی میں بغداد کے ایک فاضل سے ہو چکی تھی (ص: ۷۱) عرب و مشرق کے کسی تذکرہ نویس نے کہیں یہ نہیں لکھا ہے کہ خیام کا فضل و کمال کن کن بزرگوں کی تعلیم و تربیت کا رہین منت تھا۔ سید صاحب نے اپنی محنت سے اس کمی کو اچھی طرح پورا کر دیا ہے۔ خیام کے زمانے میں نیشاپور میں سات بہت اچھے مدرسے تھے، جن کی تفصیل لکھ کر سید صاحب نے اہل علم کے لئے خوانِ نعمت بچھا دیا ہے۔ پھر اس زمانے میں علمی مجالس تھیں، ان کی ایسی مرقع آرائی کی ہے کہ ان کو پڑھ کر ارباب علم محظوظ ہوں گے، سید صاحب رقمطراز ہیں، کہ نیشاپور کی متعدد درسگاہوں اور علماء کی مجلسوں کے آغوش میں خیام پل کر جوان ہوا، اور پھر معتبر ماخذوں کے حوالہ سے اس کی نشاندہی کی ہے، جمال الاسلام امام موفق (المتوفی ۴۴۱ھ) شافعی کی مجلس میں خیام نے مذہبی تعلیم حاصل کی (ص: ۷۹)، حکیم سنائی کے استاد مولانا شیخ محمد بن منصور سے بھی پڑھا، اور سترہ برس کی عمر میں اپنے ہم عصروں سے بڑھ کر کمال حاصل کیا (ص: ۸۰) علم ہیئت میں اس کے اساتذہ میں ابوالحسن انباری تھے (ص: ۸۰) خیام نے اپنے رسالہ کون و فساد میں سید صاحب اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: بوعلی سینا اگرچہ واقعی اس کے استاذ نہ ہوں لیکن وہ ان کی

تصنیفات سے بے حد عقیدت رکھتا تھا، وہ بوعلی سینا کو متاخرین فلسفیوں میں سب سے بہتر کہتا ہے، اُس کے ایجاد کردہ مسئلہ ”عقول عشرہ“ کا قائل تھا (ص: ۸۲) اور اپنی زندگی کے آخر لمحہ میں بوعلی سینا کی شفا کے مطالعے میں مصروف تھا (ایضاً) بوعلی کے بہت سے تلامذہ اس کے زمانے میں تھے، ممکن ہے اس نے فلسفہ کا درس ان سے لیا ہو اور اس لئے وہ بوعلی سینا کو اپنا استاد اور معلم کہتا ہو (ص: ۸۲)، ہم نے چند سطروں میں خیام کے اساتذہ کا ذکر کیا ہے، اس کو سید صاحب نے چودہ صفحے میں پھیلا کر جس طرح لکھا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے کس کس طرح سے جزئیات کو سمیٹ کر یہ ساری باتیں ناظرین کے سامنے پیش کی ہیں۔

پھر کارلائل نے جس کو ایرانی BLACK GUARD کہا ہے اس کے فضل و کمال کا مرتبہ سید صاحب نے جس طرح متعین کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فلسفہ و حکمت میں بوعلی سینا کے بعد اسی کا درجہ تھا (ص: ۸۷)، گو اس کو خود علم نجوم سے عقیدت نہ تھی، لیکن وہ اپنے منجملہ ان کمالات کی وجہ سے بھی مشہور تھا (ص: ۸۹)، طب میں اس کا پایہ بلند تھا، اور وہ ملک شاہ کے دربار کا طبیب بھی تھا (ص: ۹۰)، عقلیات کے علاوہ علوم نقلی کا بھی ماہر تھا۔ فلسفی ہونے کے باوجود فنِ قرأت میں بھی یدِ طولیٰ رکھتا تھا (ص: ۹۱) تفسیر اس کے دائرے کی چیز نہ تھی، لیکن بعض سورتوں پر گفتگو کرتے وقت اپنے معلومات کے دریا بہا دیتا (ص: ۹۲) جبر و مقابلہ کے علاوہ اُس کو ہندی ریاضیات سے بھی واقفیت تھی (ص: ۹۳)، اُس کو عربی ادب کا بھی اچھا ذوق تھا (ص: ۹۳)۔ عربی فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کرتا تھا، مگر اس کی عربی اس کے رتبے سے فروتر ہے، اس کو ادیب اور شاعر کی حیثیت سے بھی بعض اہل نظر نے جگہ دی ہے، اس کا حافظ ایسا قوی تھا کہ اس نے اصفہان میں ایک کتاب سات دفعہ بغور پڑھی تھی، اور اس کو ایسا یاد کر لیا تھا کہ نیشاپور آ کر زبانی لکھوا دی، جب اصل سے مقابلہ کیا گیا تو کچھ بھی فرق نہ نکلا (ص: ۹۴)۔

سید صاحب کی ان ساری تفصیلات سے وہ ناظرین حیرت زدہ ہو کر رہ جائیں

گے، جو خیام کو صرف ایک بادہ پرست شاعر تصور کرتے رہے ہیں۔

خیام نے شروع میں ایک کتاب ”البرهان علی استخراج اضلاع المربعات والمکعبات“ کے نام سے لکھی، جن میں اس نے دعویٰ کیا کہ ان میں ایسے قواعد دریافت کئے گئے ہیں، جو پہلے دریافت نہیں ہوئے تھے مگر اس کی کوئی قدر نہیں کی گئی، پھر اس نے مساحت، جبر و مقابلہ اور اقلیدس پر ایک مختصر رسالہ لکھا، جس میں اس فن کے مشکلات کو حل کیا، اور اس کی نئی نئی صورتیں نکالیں (ص: ۹۵)، وہ بدل تھا کہ اس کا کوئی مربی نہیں، مگر اس نے اپنی موخر الذکر کتاب میں اپنے ایک سرپرست قاضی القضاۃ ابوطاہر کا ذکر کیا ہے، لیکن اس نے یہ نہیں لکھا کہ یہ کون اور کیا تھے، سید صاحب نے ابوطاہر کی کھوج میں جو محنت کی ہے وہ ان کی گہری علمی تحقیق کی ایک نادر مثال ہے۔ انھوں نے یہ تحقیق کی کہ یہ اصل میں ماژندران کے ایک مقام ساریہ کے رہنے والے تھے، ان کی ولادت اصفہان میں ہوئی، تعلیم و تربیت سمرقند میں پائی، اور وہاں کے رئیس الشافعیہ ہو گئے، فقہ وحدیث کے عالم تھے، دولت مند بھی تھے، خیام نے اپنی دوسری تصنیف کے لئے ان کا دامن پکڑا اور انھوں نے اس کو شمس الملک خاقان ترکستان کے دربار تک پہنچایا (ص: ۱۰۳)، جس نے اس کی بہت قدر کی، وہ اس کو اپنے ساتھ تخت پر بٹھاتا تھا (ص: ۱۰۵)، اس سلسلے میں سید صاحب لکھتے ہیں کہ اس خاندان کی پوری تاریخ کہیں نہیں ملتی، پھر بھی سید صاحب نے اس کے متعلق جو تھوڑی بہت تاریخی معلومات فراہم کرادی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا قلم مختلف سموں میں چلنے کا عادی تھا اور جس سمت میں بھی نکل پڑتا وہاں کچھ نہ کچھ گل بوٹے کھلا کر رہتا، وہ لکھتے ہیں کہ شمس الملک کا سسرالی تعلق اس زمانے کے مشہور سلجوقی فرمانروا ملک شاہ سے تھا۔ شمس الملک نے ازراہ قدردانی خیام کو ملک شاہ کے دربار تک پہنچادیا، جہاں وہ انیس برس تک رہا۔ اس قیام میں اس کا سب سے بڑا کارنامہ رصدخانہ ملک شاہی کی تعمیر ہے، اس سلسلے میں اس نے بہت سی فلکیاتی تحقیقات کیں، اور زیج ملک شاہی، رسالہ کون و فساد، اور بعض دوسرے رسالے لکھے (ص: ۱۱۰)،

سید صاحب کو خیام کے بنائے ہوئے رصدخانہ سے بڑی دلچسپی ہوئی، انھوں نے اس کی تفصیل لکھنے میں قمری ماہ و سال، شمسی مہینے اور سال کے حساب مرتب کرنے اور مسلمانوں کے دور میں اس کی جو کوششیں ہوئیں، اسلام میں شمسی سال اختیار کرنے کے موانع، پھر مسلمانوں کی حکومتوں کے زمانے میں مختلف رصد خانوں کی تعمیر، ان میں حرکت شمسی کی تحقیقات کی تفصیلات، نصیر الدین طوسی کے کارناموں، ہیئت پر جامع بہادر خانی، علامہ قوشچی کے رسالہ قوشچیہ، گریگوری کے اصول کی نوعیت، خیام کی تاریخ جلالی کی غلطیوں وغیرہ سے متعلق جو پر مغز معلومات اپنی طرف سے فراہم کی ہیں ان کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ قرآن مجید، حدیث، فقہ، سیرت اور کلام وغیرہ کے مطالعہ میں ڈوب کر زندگی بسر کرنے والے مصنف کو علم نجوم و ہیئت سے ایسی گہری دل چسپی کیسے ہو گئی۔ مگر ان کی علمی زندگی کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو شروع سے اس فن سے لگاؤ رہا۔ اپنی ابتدائی زندگی میں انھوں نے ”اسلامی رصد خانے“ کے عنوان سے ایک مضمون لکھ کر علمی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کیا تھا۔ اس لئے تحریر میں جب کبھی ہیئت ونجوم کا ذکر آ جاتا ہے، تو ان کا قلم بے قابو ہو جاتا ہے، یہ کہنے میں تامل نہیں کہ ان کا علم بحر زخار تھا، جس کی موجیں مختلف سمتوں میں اُمنڈتی رہتیں، سید صاحب نے اپنی یہ کتاب اپنی عمر کے ۴۹ ویں سال میں لکھی، لیکن ان کے علم کا بے پایاں سمندر اور بڑھتا اور گہرا ہوتا چلا گیا، جیسا کہ ان کے بعد کی تصانیف سے اندازہ ہوتا ہے۔

اپنی اس کتاب میں سید صاحب نے بھی دکھایا ہے کہ خیام کا تعلق نہ صرف ملک شاہ جیسے جیل القدر فرمانروا سے رہا، بلکہ ملک شاہ کے جانشینوں میں سلطان سنجر بھی خیام کو اپنے ساتھ تخت پر بٹھاتا تھا (ص: ۱۴۰)، اور اس کے بھتیجے شہاب الاسلام، ابوالحسن، عبدالرزاق کی مجلسوں میں بھی وہ شریک رہتا تھا (ص: ۱۴۱) معاصرین میں اس کے تعلقات بوعلی سینا کے نامور شاگردوں امام غزالی، فلسفہ مشائی کے نامور عالم احوال الزماں ابوالبرز، رصد خانے کے ماہر ابو عالم مظفر اور مشہور ریاضی داں محمد بن احمد معموری بیہقی سے

بھی رہے، اور ان سے خیام کے علمی مباحثات ہوئے، ان کی تفصیل بھی لکھی ہے۔ خیام کی زندگی کے ان پہلوؤں سے واقفیت کے بعد یہ معلوم کرنے میں مدد ملے گی کہ وہ ایک معزز اور باوقار زندگی بسر کرتا رہا، اور یورپی مصنفوں کی اس کی یہ تصویر کس قدر گمراہ کن ہے کہ وہ شراب اور عورت کے پیچھے دیوانہ رہا۔

بعض مصنفوں نے شکایت کی ہے کہ خیام اپنے علم میں بخیل تھا، اسی لئے نہ اس نے بڑی بڑی تصنیفات کیں، اور نہ وہ طالب علموں اور شاگردوں کے ساتھ لطف سے پیش آیا۔ سید صاحب نے اس سے اتفاق نہیں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ وہ جس اعلیٰ منزل پر پہنچ گیا تھا اس میں اس کو درس و تدریس اور شاگردی و استادیت سب ہیچ نظر آتی تھی، پھر بھی انھوں نے اس کے دو تین شاگردوں کا پتا چلا لیا ہے، جن کے نام ابوالعالی عبید، حکیم علی اور محمد بن علی نظامی عروضی سمرقندی لکھے ہیں، پہلے دو تو کئی کتابوں کے مصنف ہوئے۔ نظامی عروضی اپنی کتاب چہار مقالے کی وجہ سے بہت مشہور ہوئے، وہ علم نجوم میں خیام کے شاگرد تھے (۵۵-۱۵۴)۔

سید صاحب نے خیام کی تصنیفات کی تلاش بڑی جانفشانی سے کی ہے، انھوں نے مختلف ماخذوں، کتابوں اور کٹیلاگوں کو چھانا تو ان میں خیام کی کتابوں کا ذکر ملا مگر انھوں نے بعض کتابوں کو خیام کی تصانیف تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ پھر اس کی اصلی اور واقعی تصانیف اور تحریرات کی تعداد دس متعین کی ہے، ان میں سے بعض تو جبر و مقابلہ، بعض ریاضیات، اقلیدس، زینج اور طبیعیات پر ہیں، لیکن سید صاحب نے ان سب کا مطالعہ کیا، اور ان کی نوعیت اور حیثیت بتائی ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ سید صاحب کو ان تکنیکی کتابوں سے کیسے دل چسپی ہوئی، اور پھر یہ لکھنے کو جی چاہتا ہے کہ ان کا علمی ذہن ایک طلسم ہوش رہا ہے، جس کے ذریعے سے ان کے علم میں طرح طرح کی رنگینیاں دیکھنے میں آتی ہیں۔ خیام کی ان تصانیف کے نام پڑھنے سے بعض ناظرین کو وحشت ہوگی، مگر صرف ان کے نام معلوم کرنے سے اس کے اعلیٰ رتبہ کے متعین کرنے میں مدد ملے گی اور پھر سید صاحب نے ان کو

سمجھ کر جس طرح سمجھانے کی کوشش کی ہے اس سے ان کے معائنہ نظر کا بھی اندازہ ہوگا۔ ان پر تفصیلی تبصرہ تو سید صاحب کی کتاب میں پڑھا جاسکتا ہے، ہم یہاں خیام کی اصلی تصانیف کے ناموں کے ساتھ ان کے تبصرے کا محض خلاصہ سید صاحب ہی کے الفاظ میں پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ تاکہ سید صاحب کے ذریعے سے خیام کے علم و فن کے کمالات کا جواظ ظہار ہوا ہے اُس کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

۱۔ رسالہ مکعبات: مربع اور مکعب چیزوں کے اضلاع دریافت کرنے کے جتنے طریقے اہل ہند کو معلوم تھے اور جو معمولی استقرا پر مبنی ہیں او وہ ایک سے لے کر ۹ تک کے مربعات ہیں۔ یعنی ایک دو تین مربعات اور اسی کے مفردات جیسے دو کو تین میں ضرب دے کر حاصل ضرب لیا جائے، خیام نے اس طریقہ حساب کے صحیح ہونے اور اس سے صحیح مطلوب حاصل کرنے کے طریقے بتائے ہیں اور اس پر بہت سی قسموں کا اضافہ بھی کیا ہے۔

۲۔ جبر و مقابلہ: اس میں اس فن پر پہلے کے لوگوں نے جو غلطیاں کی ہیں، ان کی اصلاح کی ہے اور جو اگلے لوگ حل نہ کر سکے تھے، ان کو اپنی تحقیق سے حل کیا ہے۔

۳۔ زیچ مسلک شاہی: اس میں اپنی تاریخ جلالی کے اصول بیان کئے ہیں۔

۴۔ رسالہ مصادرات اقلیدس: اس میں اقلیدس کی ان شکلوں کی مشکلات حل کی گئی ہیں جن کا ثبوت ایک دوسرے کے ثابت ہونے پر موقوف ہے۔

۵۔ رسالہ طبیعیات و لوازم الامکنہ: اس میں مکان کے لوازم و خصائص طبعی کا ذکر ہے۔

۶۔ میزان الحکم و رسالہ معرفة مقدار الذہب والفضة: اس میں

سونے اور چاندی سے ملا کر بنائے ہوئے جسم میں ہر ایک کے وزن کو متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۷۔ رسالہ کون و تکلیف: بوعلی سینا کے دو شاگردوں نے خیام سے یہ دو سوالات کئے تھے کہ خدا نے دنیا اور جنوں اور انسانوں کو کیوں بنایا اور انسانوں کو عبادت بجالانے کی تکلیف کیوں دی؟ خیام نے پہلے سوال کی جواب کے سلسلے میں یہ لکھا ہے کہ تمام فلسفہ کا نچوڑ صرف تین سوالات ہیں: (۱) کیا یہ ہے؟ (۲) اگر ہے تو کیا ہے؟ (۳) اور کیوں ہے؟ اور پھر بتایا ہے کہ ہر وہ شے جو دنیا میں موجود ہے، وہ انیت (موجودیت) اور ماہویت (ماہیت) ہے۔ کبھی خارج نہیں ہو سکتی۔ البتہ خارج سے بعض وجود بے نیاز ہو سکتے ہیں اور اس کی صورت یہ ہے کہ موجود کی دو قسمیں ہیں، ایک واجب الوجود اور دوسری ممکن الوجود، علت اور سبب کا سوال ضرور ہے کہ یہیں جا کر رُکے اور ایک ایسی علت پر جا کر انتہا ہو جس کی پھر کوئی علت نہ ہو، یہ شان واجب الوجود کی ہے اور ممکن الوجود کے تمام اسباب و علل بالآخر علت العلل ہیں، یعنی اسی واجب الوجود پر جا کر ختم ہوتے ہیں۔ واجب الوجود جس طرح اپنے وجود کی علت سے بے نیاز ہے، اسی طرح اس کے اوصاف و صفات اور افعال بھی علل و اسباب سے مستثنیٰ ہیں۔ اس لئے یہ سوال ہی بے معنی ہے کہ اس نے کیوں بنایا اور ہست کیا، یہ واجب الوجود کے جوہر و کرم کا نتیجہ ہے کہ یہ دنیا ہست ہے اور ہم موجود ہیں۔

دوسرے سوال کا یہ جواب دیتا ہے کہ عبادات سے یہ فوائد حاصل ہوتے ہیں کہ نفس انسانی کو شہواتِ نفسانی سے احتراز ہو اور قوتِ عقلیہ کے پرورش پانے کا موقع حاصل ہو۔ نفس کو امورِ الہیہ اور امورِ معاد و آخرت میں غور و فکر کا عادی بنایا جائے کہ وہ اس دارِ ناپائیدار کے طلسمات سے نکل کر جناب حق اور ملکوتِ ربانی کی طرف توجہ اور التفات کرے۔ اس سے یہ بھی فائدہ ہے کہ اس عالم میں امن و امان، نظم و اطمینان اور عدل و انصاف اور باہمی اجتماعی تعاون و مشارکت پیدا ہو اور نظامِ عالم حکمتِ ربانی کے مطابق قائم رہے۔ اس رسالہ کے تتمہ میں بعض اور سوالات کے جواب ہیں، یہ سوالات یہ ہیں،

اس دنیا میں تضاد کیوں ہے؟ خیر و شر کیوں ہے؟ حشر و نشر کیوں ہے؟ باقی میں بقاء ہے یا اس سے الگ کوئی چیز ہے؟ خیام نے ان سوالات کے بھی جوابات دئے ہیں، جن کا صرف خلاصہ یہ ہے۔

پہلے سوال کے جواب میں لکھتا ہے کہ موجودات عالم میں تضاد کا ہونا اس کی ماہیت کے لوازم میں سے ہے، جس میں کیوں کا سوال نہیں ہو سکتا، موجودات کو باہم متضاد کسی بنانے والے نے نہیں بنایا بلکہ وہ بجائے خود متضاد ہیں۔ سیاہ و سفید کو باہم متضاد خدا نے نہیں بنایا، بلکہ وہ درحقیقت خود باہم متضاد ہیں، مگر ان کا خارج میں وجود نہ بھی ہو اور وہ صرف ذہن و وہم ہی میں پائے جائیں، تو بھی متضاد ہی ہو کر پائے جائیں گے، اس لئے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ان کو خدا نے متضاد بنایا۔ اللہ تعالیٰ نے اشیاء کو بحیثیت اشیاء کے بنایا، ان اشیاء میں باہم نسبت اتحاد کی ہے، یا تضاد کی، یہ کسی بنانے والے کے بنانے سے نہیں ہے، بلکہ از خود ہے۔ اس لئے ان کی مجموعیت اور پیدائش خدا کی طرف بالذات منسوب نہیں بلکہ بالعرض ہے۔ اس کے بعد خیام کہتا ہے کہ خدا نے سیاہی کو اس لئے نہیں بنایا کہ یہ سپیدی کی ضد ہے۔ بلکہ اس لئے بنایا کہ یہ بھی ممکن الوجود چیز ہو سکتی تھی، اس لئے اس کو ہو سکنے کا موقع عنایت فرمایا۔

خیر و شر کے جواب میں کہتا ہے کہ عالم میں شر کو خدا نے بالذات نہیں بنایا، موجودت کی پیدائش کے بعد اس کا از خود ہو جانا ضروری تھا۔ خدا محض خالقِ خیر ہے۔ دنیا میں درحقیقت صرف خیر ہے، خیر سے شر کا وجود عرضاً اور تبعاً ہے۔ خدا نے اس کو بالذات پیدا نہیں کیا، بلکہ اشیاء کو پیدا کیا، ان اشیاء کے ساتھ جو ان کے ضروری لوازم تھے، وہ بھی بالعرض پیدا ہو گئے، اس کے بعد کہتا ہے کہ اگر کوئی یہ کہے کہ پھر خدا نے ایسی چیز کیوں بنائی جس کی نسبت وہ جانتا ہے کہ اس کو عدم اور شر لازم ہے! تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہر شے میں خیر کے جتنے پہلو ہیں، ان کے مقابلے میں شر کا پہلو بمنزلہ صفر ہے۔ مثلاً سیاہی میں ایک ہزار پہلو خیر کے ہیں تو ایک شر کا، ایسی حالت میں ایک شر کے خیال سے ایک ہزار خیر کو ناپید

کرنا خود شریعہ تھا۔

آخری سوال کے متعلق کہتا ہے کہ یہ بحث فضول ہے۔ جب وجود کے متعلق یہ تسلیم ہے کہ وجود اور موجود خارج میں ایک ہیں، گو ذہن میں الگ الگ ہوں، تو یہی صورت بقا کی نسبت کیوں نہیں ہو سکتی؟ وجود اور بقاء میں صرف اسی قدر فرق ہے کہ وجود مطلق ہستی ہے اور بقا ایک مدت معینہ تک کی ہستی کو کہتے ہیں (ص: ۱۹۹)۔

۸۔ رسالہ موضوع علم کلی: اس رسالے کی بحث کا حاصل یہ ہے کہ وجود کا تصور بدیہی ہے۔ وجود کے ثبوت کے لئے کسی دلیل کی حاجت نہیں۔ وجود عین موجود ہے۔ کلی موجود فی الخارج نہیں، موجود فی الخارج صرف جزئیات ہیں۔ واجب الوجود اور ممکن الوجود کا اشتراک محض لفظی ہے، دونوں جگہ وجود کی حقیقت مختلف ہے۔

۹۔ رسالہ فی الوجود: یہ چند صفحات کا رسالہ ہے جس میں وجود کی فلسفیانہ بحث ہے۔ اس کی پہلی فصل میں جوہر، جسمیت (مرکب)، محیط، عمل اور نفس کی تعریفیں اور تقسیمیں ہیں۔ پھر عقل، نفس اور افلاک کی ترتیبی تخلیق کی بحث ہے۔ دوسری فصل میں افلاک، امہات، (عناصر) اور مواد (غضریات) کا اور ان کے باہمی علت و معلول ہونے کا بیان ہے۔ تیسری فصل میں عقل و نفس کے ادراک کا ذکر ہے، چوتھی میں ملکات خمس اور اغراض کا، پانچویں میں واجب الوجود، ممکن اور ممتنع کی تعریف ہے، چھٹی میں جوہر و عرض اور آثار و خصائص کی بحث ہے، اور ساتویں میں اس وقت کے چار گروہ متکلمین، حکمائے اسماعیلیہ اور صوفیاء کے اصول (مسلک) پر مختصر تبصرہ ہے۔

۱۰۔ رسالہ وصف و موصوف: یہ سات صفحات کا عربی رسالہ ہے، اس میں اولاً یہ بیان ہے کہ اوصاف و لوازم کا ثبوت اپنے موصوف اور ملزوم کے لئے کیونکر ہوتا ہے، اور وجود کا ثبوت موجود کے لئے کس طرح ہوتا ہے۔ اوصاف و لوازم کے

اقسام ذاتی اور عرضی کی تعریف بھی ہے، پھر سارے رسالے میں یہ بحث ہے کہ ممکنات کا وجود موجود فی الخارج نہیں، اور زائد بر ذات ہے وہ صرف مفہوم انتزاعی ہے۔ ممکنات کی اصلیت عدم ہے اور وجود واجب الوجود کے اثر سے خارج سے ان کو ملتا ہے۔ اس عام بحث کے علاوہ اس رسالے سے یہ بھی ثابت ہے کہ چیزوں کی حقیقت تک پہنچنے کے لئے فکر و مراقبہ اور ریاضت کی ضرورت ہے۔ (ص: ۳۰۶)

سید صاحب کو خیام کی ان کتابوں سے ایسی دل چسپی ہوئی کہ انھوں نے مذکورہ بالا فہرست کے شروع کے چار رسالوں کو چھوڑ کر بقیہ اور تصانیف کو بڑی محنت سے ایڈٹ کر کے ان کے پورے متن کو اپنی کتاب میں منسلک کر دیا ہے۔ اس طرح جن ناظرین کو ان کی تلاش ہوگی وہ انھیں سید صاحب کی اس کتاب میں مل جائیں گی۔ یہ خیام سے سید صاحب کے گہرے شغف کا بھی ثبوت ہے۔ ان کی تلاش میں انھوں نے جو محنت کی ہے اُس کی پوری تفصیل بھی کتاب میں ملے گی۔ اور پھر جہاں جہاں فلسفیانہ بحث آئی ہے، اس میں سید صاحب امام غزالی، ابن سینا اور ہیوم کے حوالے دے کر خود بھی ایک بڑے فلسفی کی طرح اُبھرے ہیں۔ ”سیرۃ النبی“ میں جا بجا ایسی بحثیں آگئی ہیں جن کو قلم بند کرنے میں سید صاحب نے جس خوش سلیقگی کا ثبوت دیا ہے اس سے خیام کا فلسفہ سمجھنے اور سمجھانے میں اُن کو بڑی مدد ملی ہے۔

سید صاحب اپنی اس کتاب میں نجوم و ہیئت اور فلسفہ کی تحقیق و تلاش کے ماہر نظر آتے ہیں لیکن جب وہ شاعر خیام کے عنوان سے اپنے قلم کی بہار دکھاتے ہیں تو پھر وہ شعر و ادب کے بہت بڑے ماہر دکھائی دیتے ہیں، شاعر خیام کی حیثیت سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ خیام کے ابتدائی سوانح نگار اس کا ذکر شاعر کی حیثیت سے مطلق نہیں کرتے۔ کہیں کہیں اس کے چند عربی اشعار اور فارسی کی دو ایک رباعیوں کا ذکر آ گیا ہے۔ رباعی گو کی حیثیت سے مشرق میں اس نے کوئی بڑا مرتبہ نہیں پایا لیکن جب فخر جبر اللہ نے اس کی



رباعیات کا ترجمہ انگریزی میں کیا تو وہ صرف شاعر ہی کی حیثیت سے جانا گیا۔

سید صاحب کو اب چوں کہ خیام کا مطالعہ رباعی گو کی حیثیت سے کرنا تھا، اس لئے اس سلسلے میں انھوں نے عربی و فارسی میں رباعی گوئی کی پوری تاریخ لکھ دی ہے، اس کی وجہ تسمیہ کیا ہے، مختلف ادوار میں اس کے کیا کیا نام رکھے گئے۔ اس کی ایجاد کب ہوئی، فارسی میں کون بڑے بڑے رباعی گو شاعر گزرے ہیں اور اس کی مقبولیت کے کیا اسباب ہوئے۔ ان تمام باتوں کو تقریباً اس کتاب کے چالیس صفحے میں لکھا ہے۔ کتاب کے اس حصے کو ”معارف“ میں شائع کیا گیا، تو اس سے علمی حلقے میں بڑی دل چسپی پیدا ہوئی تھی۔ آج اس کو لکھے ہوئے نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن آج بھی یہ حصہ پڑھا جائے تو یہ شعر و ادب کا ایک شاہکار سمجھا جائے گا۔

اس کے بعد سید صاحب نے خیام کی رباعیات کے قدیم حوالے کی تفتیش کی ہے، پھر اس کی رباعیات کی فہرست بنائی ہے اور گہرے مطالعے، مقابلے اور موازنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ان قدیم نسخوں میں خیام کی رباعیات کے ساتھ دوسرے شعراء کی رباعیاں مل گئی ہیں۔ اور ان کی نشاندہی بھی کی ہے۔ اس تغلیط کے سات اسباب بتائے ہیں:

۱۔ خیام کی رباعیات صوفیوں کی مجلس حال و قال میں چھٹی صدی ہجری کے اواخر میں پہنچ چکی تھیں۔ اس طرح حکیم خیام صوفی خیام کی صورت میں تبدیل ہو گیا۔ صوفیوں نے اس کی رباعیات میں صوفیانہ رباعیوں کی آمیزش کر دی۔ دوسری طرف رند بادہ پرست جو مذہب اباحت کے پیرو تھے وہ بھی خیام کے معتقد ہو گئے، ان رندوں نے اباحی خیالات اور مستی درندی کو خیام کی رباعیوں کے ساتھ بڑھانا شروع کر دیا، ایک اس کو صوفی صافی یعنی مذہبی صوفی ثابت کرنا چاہتا تھا۔ دوسرا رند ابالی! مگر درحقیقت حکیم خیام نہ یہ تھا، نہ وہ، بلکہ وہ حکیم متعسف تھا، اور اس کا تصوف اگر تھا تو حکیمانہ تصوف تھا، مذہبی نہیں (ص: ۲۷۱)۔

۲۔ بعض لوگوں نے خیام کی حکیمانہ رباعیوں کا جواب لکھا، کسی نے جواب کے ساتھ سوال بھی لکھ دیا۔ وہ سوال و جواب دونوں خیام کے نام میں درج ہو گئے۔

۳۔ خیام کے مضامین پر دوسرے شعراء نے ہم معنی اشعار کہے۔ جامعین نے تشابہ کے دھوکے میں سب کو خیام کے سر تھوپ دیا۔

۴۔ کسی مناسب موقع پر خیام کی کوئی رباعی کسی مشہور آدمی نے نام بتائے بغیر پڑھی یا لکھی۔ ناواقف سننے والوں اور دیکھنے والوں نے سمجھا کہ یہ رباعی اسی قائل کی تصنیف ہے۔

۵۔ خیام کی چند خمریہ رباعیوں کے سبب سے دوسروں کی خمریہ رباعیاں بھی اس کی طرف منسوب کر دی گئیں۔

۶۔ بعض نے دھوکہ کھا کر خیام کی رباعیوں کو حافظ کی طرف منسوب کر دیا ہے حالانکہ رباعی گوئی میں حافظ کا کوئی درجہ نہیں۔

۷۔ جن رباعیوں میں کوئی تخلص نہیں تھا، وہ بھی خیام سے منسوب ہو گئیں۔

پھر ان ایشیائی اور یورپی مصنفوں کی کوششوں کا بھی تجزیہ کیا ہے، جنھوں نے خیام کی اصل رباعیات کو دوسرے شاعروں کی رباعیات سے الگ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس تجزیے میں انھوں نے اس کی بھی نشاندہی کی ہے کہ فارابی، ابوالحسن خاقانی، عراقی، ابوسعید، ابوالخیر، ابن سینا، عبداللہ انصاری، عطار، افضل کاشی، سنائی، جلال الدین رومی، فخر الدین رازی، سیف الدین باخرزی، نجم الدین رازی، نصیر الدین طوسی، سراج الدین انوری، مغربی، تبریزی اور کمال اسماعیل کی رباعیاں، خیام کی رباعیوں سے مل گئی ہیں۔ جس طرح سید صاحب نے ہر رباعی کا مطالعہ اور موازنہ کر کے ان کو خیام کی رباعیوں سے الگ کر کے دکھایا ہے، اس سے ان کی تحقیقی ادبی اور شعری دیدہ وری کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

ان رباعیوں کے مطالعے کے بعد خیام کے مذہب، مشرب اور مسلک پر بہت ہی محققانہ اور عالمانہ بحث کرتے ہیں اور بڑے وثوق کے ساتھ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس

کا مذہب اسلام تھا لیکن مشائیت اور اشراقی، فلسفیانہ اسلام، جس کا خاکہ فارابی اور بوعلی سینا کے یہاں نظر آتا ہے بہ ہر حال وہ مسلمان تھا، خدا اور سوال کا قائل تھا، نماز پڑھتا تھا، حج بھی کیا، مرض الموت کے آخری لمحوں میں بوعلی سینا کی کتاب، الہیات شفا کا مطالعہ کر رہا تھا، جب وہ واحد اور کثیر کی بحث پر پہنچا تو اس پر یہ اثر ہوا کہ اٹھ کھڑا ہوا، لوگوں کو بلا کر وصیت کی، پھر نماز پڑھی، اس درمیان میں نہ کچھ کھایا نہ پیا، آخر عشاء کی نماز پڑھ کر سجدہ کیا اور سجدہ میں بار بار یہ کہتا جاتا کہ خدایا تو جانتا ہے کہ میں نے امکان بھر تجھ کو پہچانا تو مجھے بخش دے، یہی التجا تیرے دربار میں میرا وسیلہ ہے، یہ کہہ کر یہ طوطی خوش نوا ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ (ص: ۳۹۷)

سید صاحب نے یہ سب کچھ مستند حوالوں سے ثابت کر کے لکھا ہے کہ خیام کے ایک صحیح مسلمان ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے! لیکن اسی کے ساتھ سید صاحب نے اس پر بھی تفصیلی بحث کی ہے کہ وہ مسلمان ضرور تھا لیکن جیسا کہ پہلے لکھا ہے وہ فارابی اور ابن سینا کے مذہبی خیالات سے متاثر تھا، اسی لئے مسلمان ہونے کے ساتھ ایک حکیم تھا، مگر متکلم حکیم نہ تھا، فلسفی حکیم بھی نہ تھا، اسماعیلی حکیم بھی نہ تھا، اگر تھا تو صوفی حکیم۔ اور اسی طریق کو وہ پسندیدہ اور صواب جانتا تھا، اس کا تصوف مذہبی نہیں، بلکہ حکیمانہ تھا، یعنی اس کے سامنے انبیاء کے احوال نہیں، بلکہ حکماء کے حالات اور خیالات تھے۔ (ص: ۳۱۴)

اس طرح وہ فلسفیانہ تصوف کا قائل تھا، خدا اور اس کی ذات، پھر نبوت اور رسالت کے متعلق اس کے وہی حکیمانہ خیالات تھے، جو بوعلی سینا کے یہاں ہیں (ص: ۳۲۰)، اسی لئے وہ بھی انسانیت کا کمال معرفت الہی کو جانتا تھا (ص: ۳۲۱) مگر اسی کے ساتھ وہ خدا کی کلی معرفت کے امکان کا قائل بھی نہ تھا، اور یہ سمجھتا تھا کہ یہ انسان کی دسترس سے باہر ہے۔ پھر خدا کے عالم کل ہونے کا بھی وہ قائل تھا، اور وہ اس پر یقین رکھتا تھا کہ خدا کے تمام کام بھی خیر محض ہیں، اسی لئے وہ مرجئیت کے خیالات بھی رکھنے لگا تھا، یعنی وہ اس کا قائل تھا کہ خدا اپنی توحید و معرفت کے بعد کسی کو عذاب نہیں دے گا، گنہگاروں

کے تمام گناہ اپنے کمال مہربانی سے معاف کر دے گا کیونکہ اس کو کسی سے کینہ اور دشمنی نہیں ہے، وہ خیر محض ہے (ص: ۳۲۴) وہ جبر کا بھی قائل نہ تھا، یعنی اس کا جبر مذہبی استدالات پر مبنی تھا، بلکہ فلسفیانہ دلائل پر، یعنی وہ جدید افلاطونی فلسفہ مشائیت کے مطابق تھا، وہ زہد و ورع اور پاکیزگی و طہارت کی بھی دعوت دیتا رہا، لیکن یہ بھی مذہبی نہیں، بلکہ یونان و اسکندریہ کے زاہد خشک فلاسفوں کی تعلیم کے مطابق ہے۔ (ص: ۲۶۰-۲۵)

سید صاحب نے یہ جو کچھ لکھا ہے اس کی سند میں وہ خیام کے رسالوں کے علاوہ اس کی رباعیات بھی پیش کرتے جاتے ہیں، جن کو وہ خیام کی اصلی رباعیات سمجھتے ہیں، خیام کے ان حکیمانہ اور فلسفیانہ خیالات کے ساتھ سید صاحب نے اس کے پیشرو اور معاصر حکمائے اسلام کے حکیمانہ خیالات پر بڑی پر مغز بحث کی ہے، وہ لکھتے ہیں اس وقت تک متکلمین اسلام کے مختلف فرقے ہو چکے تھے مثلاً حنبلیہ، مالکیہ، حنفیہ وغیرہ (ص: ۳۰۰)، خیام ان میں سے کسی سے متاثر نہ ہوا، پھر حکماء کے تین گروہ ہو گئے، ایک وہ جو صرف حکیمانہ خیالات رکھتے تھے، لیکن دنیا طلب اور عیش پرست تھے، جیسے بوعلی سینا وغیرہ، دوسرے وہ جن کے خیالات اور اخلاق زاہدانہ تھے، یہ اسکندریہ کے افلاطونی حکیموں اور یونان کے رواقی فلسفیوں کی طرح رہے، اور حکیمانہ اصول اور خیالات کے مطابق خشک فلسفیانہ زندگی بسر کرتے رہے۔ وہ ریاضیات شاقہ کے ذریعہ سے تزکیہ نفس اور ترقی روح کے مدارج ڈھونڈتے تھے ان کو فلسفی صوفی کہتے تھے، تیسرے وہ تھے جو فلسفیانہ خیالات کے ساتھ ایک امام کی اطاعت مطلقہ کے قائل تھے، وہ اس امام کی اطاعت کو نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ یہ لوگ باطنیہ اور اسماعیلیہ اور تعلیمیہ کہلاتے تھے (ص: ۳۰۱) خیام ان تینوں میں سے کسی میں نہ تھا، وہ صوفی حکیم تھا، جیسا کہ اس کے رسالے کلیات الوجود سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں سید صاحب نے حکمائے اسلام، ابن سینا، فارابی اور ابن مسکویہ کے فلسفیانہ خیالات اور پھر فلسفیانہ تصوف اور مذہبی تصوف پر بڑی فاضلانہ بحث کی ہے، جس سے ظاہر ہوگا کہ ان موضوعات پر بھی ان کی نظر گہری تھی۔ ان تمام مباحث کا لب لباب یہ

ہے کہ خیام صوفی حکیم ضرور تھا، لیکن وہ بعلی سینا اور فارابی کے خیالات سے بھی متاثر رہا، وہ مسلمان بن کر زندگی بسر کرتا رہا۔

پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنی رباعیات میں شراب کا ذکر بار بار کیوں کرتا رہا؟ اس کا بڑا تفصیلی جواب سید صاحب نے ”خیام کی شراب“ کے عنوان سے دیا ہے۔

پہلے تو وہ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ حافظ، ابوالحسن علی باخرزی، حکیم سنائی، ابوسعید ابوالخیر وغیرہ نے بھی شراب پر اشعار کہے ہیں، لیکن وہ خیام کی طرح بدنام نہیں۔ پھر دوسروں کی خمریات کی بہت سی رباعیاں دی ہیں، جو خیام کے نامہ اعمال میں داخل کردی گئی ہیں، پھر اُس کی بعض ایسی رباعیاں درج کی ہیں، جو بالکل سادہ اور معصوم ہیں، لیکن جب یہ دوسرے نسخوں میں نقل کی گئی ہیں، تو ان میں شراب کی آمیزش کردی گئی ہے۔

خیام کی شراب کی ایک قسم اخلاص کی بوتل میں بند ہے۔ صوفی شعراء میں یہ رسم ہوگئی تھی کہ رندی کے ان ظاہری لوازم جام و ساغر و بادہ کو اخلاص اور باطنی نیکوکاری کے معنوں میں اور تسبیح و سجادہ اور دستار کو فریب ملاقات اور تلمیس و نفاق کے معنوں میں بولتے تھے، خیام کی بہت سی رباعیوں میں بھی یہی شراب بھری ہے۔

خیام کے پیالہ میں ایک ایسی شراب بھی نظر آتی ہے، جس کا نام بادہ حقیقت ہے۔ وہ شراب کو غیر مرمی و غیر محسوس حقیقت، روح حق، جذبہ روحانی اور معرفت قلب کے معنوں میں بھی استعمال کرتا ہے، مگر عام طور سے لوگ خیام کی اس شراب کو دنیا کی ملکہ شراب ہی سمجھتے ہیں۔ خیام جب اپنی رباعیات میں شراب، نور ماہ، صراحی، پیالہ اور گل کوزہ کا ذکر کرتا ہے، تو ان سے پینے کا نہیں بلکہ دیکھنے کا کام لیتا ہے اور جب ان کے ٹوٹنے پھوٹنے کا ذکر آتا ہے تو ان کے ذریعہ سے وہ زوال اور تعمیر کی تشبیہوں اور استعاروں کو ادا کرتا ہے، ان کا تعلق مستی و سرشاری سے نہیں ہوتا۔

سید صاحب یہ بھی لکھتے ہیں کہ شاعر کے شعر میں ایسی لچک ہوتی ہے کہ جس مذاق کا آدمی اسے جس خیال کو دل میں رکھ کر پڑھتا ہے، اسی کے مطابق اسے معنی شعر میں

نظر آتے ہیں، اس سلسلے میں یہ مثال بھی دی ہے کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے سامنے جب خیام کی رباعی پڑھی جاتی تو وہ رو پڑتے اور ان پر حال طاری ہو جاتا تھا۔

سید صاحب نے خیام کی شراب کی قسموں کی جو نوعیت بتائی ہے، اس کی تائید میں اس کی رباعیات بکثرت پیش کی ہیں، اور اپنے دعوے کے ثبوت میں بعض رباعیوں کے معانی و مطالب بتا کر ان پر بحث کی ہے۔

کتاب کے آخری باب کا عنوان ”جعلی خیام“ ہے۔ اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ بعض حلقوں میں یہ کہا جاتا ہے کہ خیام بہت لا اُبالی تھا، جو شب و روز مست پڑا رہتا تھا، عالم خمار میں جو کچھ بک دیتا، وہ رباعی بن جاتی تھی، وہ تناسخ کا بھی قائل تھا، اور وہ تمام موجودات کے ساتھ خدا کو بھی ہم قرار دیتا تھا، وغیرہ وغیرہ۔ سید صاحب نے ان تمام باتوں کی تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ ساری باتیں خیام پر سراسر الزام اور بہتان ہیں، جعلی خیام میں تو یہ باتیں نظر آئیں گی، اصلی خیام میں نہیں پائی جائیں گی، اور اپنی اس کتاب کا خاتمہ خیام کی ان ستائیس رباعیوں پر کیا ہے، جن سے بقول ان کے قطرہ آب حیات ٹپکتا ہے۔

اس کتاب میں نسخہ جدیدہ رباعیات خیام کا متن بھی دیدیا گیا ہے، جو کہ اس مخطوطہ کی نقل ہے جو مشہور کا تب سلطان علی المتوفی ۹۱۹ھ کا لکھا ہوا ہے۔

آخر میں یہ کہنا ہے کہ اس کتاب کو شروع سے آخر تک پوری محنت سے پڑھنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ لیکن جو اباب ذوق اس کو پوری محنت سے پڑھنے کی تکلیف گوارا کریں گے وہ اس میں سید صاحب کی ذہنی کار فرمایوں، علمی کاوشوں اور قلمی کرشمہ سازیوں کے مختلف حصوں سے محفوظ ہوں گے۔ انتہائی عرق ریزی سے علمی تلاش، تجسس اور تحقیق کس طرح کی جائے، اس میں اس کے اعلیٰ نمونے ملیں گے۔ غلط قسم کی تحقیقات کی تردید کیسے کرنی چاہئے، اس کی مثالیں بھی اس میں پڑھی جاسکتی ہیں، اگر کسی کو نجوم، ہیئت، فلسفہ اور حکمائے اسلام کے حکیمانہ خیال سے دلچسپی ہے، تو یہ بھی اس کے مطالعے سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اگر کوئی رباعی کی تاریخ، اس کے دوسرے نام اور اس کے ارتقاء اور مشہور رباعی گو

شعراء کے کارناموں کو جاننا چاہتا ہے تو اس کے لئے بھی اس میں بہت سی خاطر خواہ چیزیں دستیاب ہو جائیں گی۔ اسی کے ساتھ اس میں جعلی، رندلا اُبالی، بادہ پرست، تناسخ کے قائل، خدا کے منکر خیام کے بجائے نجوم، ریاضیات طب اور رصد خانہ کے ماہر خیام کے علاوہ مسلمان، نماز کا پابند، حج کا فریضہ ادا کرنے والا، آخر زندگی میں اللہ تعالیٰ کی بخشائش کا خواستگار اور صوفی خیام کی نئی دریافت ملے گی۔ اصلی خیام کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں ملے گی۔ غرض تحقیق و تدقیق اور باوقار انداز بیان کے جس معیار کے ساتھ یہ کتاب جانچی جائے گی یہ دنیا کی اعلیٰ پائے کی کتابوں میں شمار کئے جانے کے لائق سمجھی جائے گی۔

آخر میں یہ بھی کہنا ہے کہ سید صاحب ماہر حدیث بھی تھے، اس لئے محدثانہ اصول کے مطابق روایت و درایت کے بجد قائل تھے۔ اپنی ہر تحقیق کو اول روایت و درایت کے اصول پر پرکھتے، پھر کہیں کسی نتیجے کا استنباط کرتے۔ وہ اپنی تحقیق میں گہرائی اور گیرائی سے کام لیتے تھے، فرمایا کرتے کہ مولانا شبلیؒ فرماتے تھے کہ چیونٹیوں کے منہ سے شکر کے دانے چن چن کر مٹھائیاں تیار کرنا اور تحقیق کرنا دونوں برابر ہیں۔ وہ اچھے انشا پرداز بھی تھے مگر اپنی انشا پردازی کی خاطر تحقیق کو قربان نہیں کرتے، اگر ان کی تحقیق کی خاطر ان کی انشاء پردازی قربان ہو جاتی تو ان کو زیادہ فکر نہ ہوتی۔ مگر ان کی برابر یہ کوشش رہتی کہ تحقیق کی گرانی اور زبان و بیان کا بہتر سے بہتر اسلوب برابر قائم رہے۔ خیام میں انداز بیان کا جو وقار ہے اس سے اردو کے اسلوب میں وزن پیدا ہوا ہے۔

## حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندویؒ (۱)

صدر محترم و معزز حاضرین!

اس وقت آپ کے سامنے یہ خاکسار ملی جلی کیفیات کے ساتھ کھڑا ہے، اس سرزمین میں آکر اس پر شکر گزاری کے جذبے کی کیفیت اس لئے طاری ہے کہ یہاں کے سابق حکمران خاندان کی فیاضی اور کرم گستری دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ کی تاسیس اور فروغ میں معاون ہوئی، جس کے بانی و ناظم حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ تھے، پھر یہیں ان کے بڑے بھائی کو مجددیہ سلسلے کے فیوض و برکات حاصل ہوئے، اور یہیں خود ان کی زندگی کے کچھ آخری ایام گزرے، اور اب یہیں ان کے محبوب شاگرد اور اسی تعلق سے میرے برادر عزیز مولانا محمد عمران خاں ندویؒ لازہری اس شاندار اجتماع میں ان کی یادوں کی قدیل کو فروزاں کر رہے ہیں، خاکسار کے دل میں مولانا حافظ محمد عمران خاں ندویؒ لازہری کی گونا گوں خوبیوں کے احساس کے ساتھ ان کا بے پناہ احترام اس لئے بھی ہے کہ انھوں نے سطوت دین مبین کی خاطر ”تاج المساجد“ کی از سر نو تعمیر کر کے آئندہ نسلوں کو یہ سبق سکھایا ہے کہ وہ تاج محل کی طرح کوئی دوسری عمارت تو نہیں تعمیر کر سکتے، لیکن محنت، ریاضت اور جوش و ولولہ سے اُن کی طرح اپنی عملی زندگی کا تاج محل بنا سکتے ہیں، مگر اس وقت ان سے یہ خاکسار گلہ مند بھی ہے کہ ایک مورنا تو ان کو بارگاہ سلیمان میں پیش کر کے اس کے اوپر اس کی قوت تحمل سے زیادہ بار ڈال دیا ہے، اس کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اس بارگاہ کے جلوہ ہائے

(۱) یہ مضمون دارالعلوم تاج المساجد میں حضرت سید صاحب پر منعقد ہونے والے سیمینار میں پڑھا گیا (طلحہ)

صدرنگ کو یہاں کیسے دیکھے اور دکھائے، اس کے لئے الفاظ کے جن اور پری کوتاہی میں لانے کی ضرورت ہے، جو اس کے بس کی بات نہیں، اس کے لئے تحریر بھی بلیقہ صفت ہونی چاہئے، جو اس کے لئے ممکن نہیں، اس لئے وہ اپنے آپ سے کہہ رہا ہے:

نگاہ شوق میسر نہیں اگر تجھ کو ترا وجود ہے قلب و نظر کی رسوائی

مگر آپ کے سامنے کچھ کہنا ہے، اس لئے ہم یہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس بارگاہ کے تاجدار کیا تھے، ہم کو کیا دے گئے، اور ہم ان سے کیا درس لے سکتے ہیں؟

ان کی ولادت پٹنہ ضلع (اب نالندہ ضلع بہار) کے ایک گاؤں دیسنہ میں ۱۸۸۲ء میں ہوئی، ان کی تاریخ ولادت سنہ ہجری سے اس مصرع سے نکالی گئی:

شدہ مہر تاباں ز برج کمال

برج کمال کا یہ مہر تاباں کراچی میں ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء میں غروب ہوا، ان کی وفات کو بتیس سال گزر چکے ہیں، لیکن ان کو دیکھنے والے ابھی بہت سے لوگ موجود ہیں، اس مجلس میں بھی ہیں، ان کو ان کا سروقد، نیلے کے پھول جیسا ان کا سفید چہرہ، اس پر چودھویں رات کے چاند کی چاندنی جیسی ان کی ڈاڑھی، عقیق کی کٹوریوں کی طرح ان کی آنکھیں، گوری چنبیلی جیسی ان کی جبیں، جسم پر ڈھلی ہوئی ان کی شیروانی اور اس کے اوپر وزن و وقار کے خوبصورت تاج جیسا ان کا عمامہ یاد ہوگا، ان کو دیکھنے والوں کی آنکھیں اب بھی دیکھتی ہوں گی کہ وہ چلتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ سنجیدگی ان کے یسار اور متانت ان کے یمین میں ہے، بزرگی ان کے اوپر چتر ڈالے ہوئے ہے، اور عظمت ان کے سامنے کو کبے ہوئے ہے، ان کے دیکھنے والوں کو یہ بھی یاد ہوگا کہ وہ بولتے تو علم ان کے منہ کو چومتا، ہنستے تو ان کے قلب کی پاکیزگی ان کی ہنسی کی آواز میں سنائی دیتی، کسی سے ملتے تو ملنے والا اپنے کو لطف و کرم کے حصار میں محصور پاتا، جن عزیزوں کو ان کی گھریلو زندگی کی مجلسوں میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا تو وہ دیکھتے کہ جب وہ اپنے بچوں کے درمیان میں ہوتے تو یہ بچے اپنے سامنے دلبری کی کوثر اور شفقت کی تسلیم بہتہ دیکھتے، انھوں نے اپنی پوری زندگی

میں اپنے کسی بچے یا بچی کو خشمگین آنکھیں نہیں دکھائیں، اپنے ملازم کو بھی کبھی نہیں ڈانٹا، انھوں نے داغ جگر لالہ کی طرح زندگی بسر کرنے کو زیادہ ترجیح دی، دوسروں کی باتیں سن کر بیمار پڑ سکتے تھے، مگر ان سے الجھ کر اپنے کو شرمسار کرنا پسند نہ کرتے تھے، وہ کہتے کہ میں کسی کو برا نہیں سمجھتا، جب تک کہ وہ خود اپنے کو برا ثابت نہ کر دے۔

وطن میں ہوتے تو اپنی بے تکلفی سے اپنے ہم وطنوں پر اثر ڈالتے کہ وہ ان ہی کے لئے ہیں، ان کے دادا بزرگوار میں بڑا زہد و اتقا تھا، آداب و تہذیب کے لئے بھی مشہور تھے، اس کا اثر ان کی زندگی پر بھی پڑا، ان کے بڑے بھائی ان کی کمسنی کے زمانے میں عورتوں کی مجلس میں حضرت اسماعیل شہید کی تقویۃ الایمان پڑھوایا کرتے تھے، جس کا اثر ان کے ذہن پر ایسا پڑا کہ ان کا بیان ہے کہ علم کلام کے مسائل، اشاعرہ و معتزلہ کے نزاعات، غزالی، رازی اور ابن رشد کے دلائل یکے بعد دیگرے نگاہوں سے گزرے، مگر اسماعیل شہید کی تلقین بہر حال اپنی جگہ پر رہی۔ (۱)

ان کے خاندان میں صرف مذہبی تعلیم رہی، لیکن ان کے گاؤں کے لوگ زیادہ تر انگریزی زبان کے ذریعے سے اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم پا رہے تھے، ان کا وقت گاؤں میں ایسے ہی ہم وطنوں کے ساتھ گزرتا، اس لئے غیر شعوری طور سے ان پر قدیم و جدید دونوں رنگ چڑھے۔

وہ اپنے گاؤں سے نکل کر پھلواڑی شریف پٹنہ کی خانقاہ مجبیہ میں مزید تعلیم کے لئے آئے، یہاں اس کے سجادہ نشین حضرت شاہ محی الدین کے زیر سایہ رہے، خانقاہ میں مجلس سماع بھی ہوتی تھی جس سے ان کو شعر و سخن کا چسکہ پڑا، یہیں انھوں نے مولانا عبدالحلیم شرر کا ناول ”منصور موہنا“ پڑھ کر ختم کیا تو پھوٹ پھوٹ کر روئے، یہی آنسو آگے چل کر ان کے لئے علم کا منصور اور فضل کی موہنا بن گئے، پھلواڑی شریف کے بعد در بھنگہ کے مدرسہ امدادیہ میں رہ کر کچھ دنوں تعلیم پائی، یہاں انھوں نے طلبہ کی انجمن میں تعلیم نسواں پر ایک مضمون

(۱) مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں ص: ۷

پڑھا جو پٹنہ کے ہفتہ وار اخبار ”الپنج“ میں چھپا، یہ مضمون ان کے لئے سم سم کا جادو بن گیا، جس کے بعد ان کے لئے مضمون نگاری کے دروازے برابر کھلتے رہے، اسی زمانے میں گاؤں کی انجمن ”الاصلاح“ میں ایک نظم پڑھی، جس کے دو شعر یہ تھے:

اب کہاں قرطبہ و اندلس و بیت الحمرا سوتے ہیں چین سے اسلاف درون تربت  
زیور علم سے آراستہ فرمائیے روح قوم کے ہاتھوں میں دے دیجئے شمع عزت  
ایسی نیک ساعت میں یہ دعا مانگی تھی کہ ان کی زندگی کا مقصد یہی رہا کہ قوم کے  
ہاتھوں میں شمع عزت دے دیں، مگر اس کے لئے اپنی نثر نگاری ہی کو ذریعہ بنایا، شاعر بن  
سکتے تھے، مگر اس کی طرف بہت کم توجہ کی۔

جب وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء آئے تو کچھ دنوں کے بعد ان کی صلاحیت سے متاثر ہو کر مولانا شاہ سلیمان پھلوارؒ نے وہاں کے ایک جلسے میں یہ پیشین گوئی کی کہ ان شاء اللہ ایک سلیمان بہار کی سر زمین میں علم اور دین کی خدمت کے لئے موجود رہے گا، جب مولانا شبلی نعمانیؒ اس ادارہ سے وابستہ ہوئے تو ان کو ایسا محسوس ہوا کہ:

زندگی کچھ اور شے ہے، علم ہے کچھ اور شے

اور وہاں کی یہ فضا کہہ رہی تھی کہ جس طرح علامہ ابن تیمیہؒ کو حافظ ابن قیمؒ مل گئے تھے اسی طرح مولانا شبلی نعمانیؒ کو ایک جان نثار شاگرد مل گیا، اسی طالب علمی کے زمانے میں انھوں نے پورے سوز و جگر اور سوز و دماغ سے شاہ عبدالعزیزؒ محدث دہلویؒ کا رسالہ ”عجالة نفعہ“ حافظ ذہبیؒ کی تذکرۃ الحفاظ، حافظ ابن حجرؒ کی فتح الباری، امام مالکؒ کی موطا، ابن ندیم کی الفہرست، حاجی خلیفہ کی کشف الظنون، ابن خلکان کی وفیات، شہرستانی کی الملل والنحل، ابن حزمؒ کی فصل الملل والنحل، ابن رشد کی کشف الأدلہ، اور شاہ ولی اللہؒ کی حجۃ اللہ البالغہ کا مطالعہ کر کے بہت کچھ حاصل کیا، مگر لکھتے ہیں کہ بالآخر علامہ ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن قیمؒ کی تصنیفات نے ہر نقش کو مٹا ڈالا، اور ہر رنگ کو بے رنگ کر دیا (۱)، اور جب ان کی دستار بندی

کے موقع پر ان کی ایک برجستہ تقریر سے متاثر ہو کر مولانا شبلی نعمانیؒ نے اپنا عمامہ اتار کر ان کے سر پر رکھ دیا تو اس علم کی کلاہ کو مہر عالم کتاب بنانے کی ذمہ داری سے برابر دبے رہے۔

مولانا شبلی نعمانیؒ نے ان کو جب دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ترجمان رسالہ ”الندوہ“ کے علمی کاموں میں شریک کیا تو ان کے علمی ذہن کے دریچے کھلتے گئے، انھوں نے اس میں مضمون نگاری کر کے نہ صرف اپنے کو دریافت کیا، ان پر یہ بھی ظاہر ہوا کہ:

علم دولت بھی ہے، قدرت بھی ہے، عزت بھی ہے

اس رسالہ میں انھوں نے قرآنیات میں ”قضا و قدر اور قرآن مجید“، ”الفرقان والفلسفۃ الجدیدۃ“ اور ”مسئلہ ارتقاء“ حدیث میں ”علم الحدیث“، ”امام بخاری“، ”موطا امام مالکؒ“ اور ”طبقات ابن سعد“، تاریخ میں ”فرماں روا یان اسلام کا دربار“، ”خواتین اسلام کی بہادری“، عربی زبان و ادب میں عربی کی مشہور کتاب ”نہایۃ الارب فی فنون الادب“ کی بیس جلدوں پر تبصرہ، ہیئت و نجوم میں ”علم ہیئت اور مسلمان“، ”اسلامی رصد خانے“، متفرقات میں ”برنا با کی انجیل“ اور ”مستشرقین کی خدمات“ اور طرح طرح کے عنوانات پر مضامین لکھے، جن سے ان کے ذوق کی رنگارنگی اور ان کی آئندہ کی علمی زندگی کی درخشانی کی شہادت ملی، اس رسالے کے ان کے تمام مضامین کو جمع کر کے شائع کیا جائے تو کئی جلدیں ہو جائیں، لیکن علم کے شاہین نے ان کے مجموعے شائع کرنے کی کبھی فکر نہیں کی، اس لئے کہ وہ ان کو اپنے علمی لہو کو گرم رکھنے کا محض بہانہ سمجھتے رہے، ان کی نظر علم کے نیلگوں ”آسمان بے کرانہ“ کی طرف اٹھی رہی، دارالمصنفین کی طرف سے ”حیات امام مالکؒ“ کے نام سے جو بعد میں کتاب شائع ہوئی، اس میں ”الندوہ“ ہی کے وہ مضامین ہیں جو انھوں نے ۱۹۰۷ء میں کئی قسطوں میں لکھے تھے، ان کے لکھنے کے وقت ان کی عمر تینیس سال کی تھی، مگر اس کا مطالعہ کرتے وقت یہ معلوم ہوگا کہ کسی سن رسیدہ اور تجربہ کار مصنف کی محنت و کاوش کا یہ نتیجہ ہے، اس کے لکھنے کا مقصد فقیہ مدینہ الرسول ﷺ امام دارالہجرۃ اور بانی اول فن حدیث کو صرف خراج عقیدت پیش کرنا تھا، دارالمصنفین ہی کی طرف سے ان کے

مضمون ”خواتین اسلام کی بہادری“ کو بھی ایک رسالے کی صورت میں شائع کیا گیا تو اس کے بہت سے ایڈیشن نکلے، اس کے انگریزی ترجمہ کے دوبارہ ایڈیشن نکل چکے ہیں، وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں کچھ دنوں مدرس بھی رہے، اس زمانے میں عربی کی دوریڈریں، ”دروس الادب“ کے نام سے لکھیں، چاہ زمزم کی طرح اس کا فیض اب تک جاری ہے، اسی زمانے میں عربی کی ”لغات جدیدہ“ لکھ کر لغت نویسی سے بھی اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔

اس زمانے کی ملی سیاست متاثر ہو کر مولانا ابوالکلام آزاد کے مشہور ہفتہ وار جریدہ ”الہلال“ کی ادارت میں بھی شریک ہوئے، اس میں ان کے کچھ مضامین میں ابوالکلامیت پائی جاتی ہے، مگر اسی میں ان کے جو علمی مضامین شائع ہوئے تو یہ اندازہ ہوا کہ صحافت نگاری میں علمی رنگ کیسے پیدا کیا جاسکتا ہے، ”الہلال“ کی ادارت سے تھوڑے دنوں تک وابستہ رہنے کے بعد پونا کالج میں مشرقی زبان کے معلم ہو گئے، اپنے شفیق استاد مولانا شبلی نعمانی کی وفات کے بعد ان کی وصیت کے مطابق اعظم گڑھ آ گئے، تو اپنے استاد کے تخیل دار المصنفین کو ان کی محبت کے سرور اور اپنے شوق کے ناز و نیاز بلکہ خونِ جگر سے علم کا قرطبہ، فن کا الحمراء، اور فضل کا بیت الحکمۃ بنادیا، یہاں انھوں نے بتیس سال رہ کر اس طرح زندگی گزاری کہ دیکھنے والے کہتے رہے کہ ان کی امیدیں قلیل لیکن مقاصد جلیل ہیں، دارالمصنفین کے درو دیوار سے اب بھی ان ہی کے تب و تاب جاودانہ کی آواز بلند ہوتی رہتی ہے، یہاں کی محنت شاقہ سے ان کا جسم کبوتر کا تن نازک بن گیا تھا لیکن ان کا علمی جگر شاہین کا جگر بنتا چلا گیا۔

یہاں سے ۱۹۱۶ء میں رسالہ ”معارف“ نکالنا شروع کیا، اس میں اپنے شذرات کے ذریعہ سے کبھی ساقی لالہ فام بن کر زندگی کا جام مے پلایا، کبھی یم زندگی اور رم زندگی دونوں کو قابو میں لانے کا سبق پڑھایا، کبھی اپنی نظر و فکر سے خوب و ناخوب کی تمیز دلائی، کبھی مسلمانوں میں ملی حمیت، سیاسی غیرت اور ایمانی حرارت پیدا کرنے میں ان کے قلم کی صدمیقیت، فارقت اور مرتضویت رونما ہوتی رہی، یہ شذرات ان کے طرح طرح کے

خیالات کے گل و گس و سوسن و سترن بھی ہیں۔

معارف میں مختلف عنوانات سے ان کے جو مضامین شائع ہوئے وہ انیس سو صفحات پر مشتمل ہیں، مذہبی بھی ہیں، کلامی بھی، تحقیقی بھی، تاریخی بھی، ادبی بھی، سیاسی بھی، تنقیدی بھی اور تعزیتی بھی، ”معارف“ میں لکھنے کے ساتھ ملک کے مختلف رسالوں اور اخباروں میں بھی بہ کثرت مضامین لکھتے رہے، جن سے ان کی محنت بلکہ سخت کوشی کا اظہار ہوتا ہے، لیکن اسی نے ان کی علمی زندگی کو انگیں بنائے رکھا تھا۔

ان مضامین کے مجموعے شائع کرنے کی کوئی فکر نہیں کی، بہت اخیر میں اردو زبان و ادب پر جو مضامین لکھے تھے، ان کو ”نقوش سلیمانی“ کے نام سے شائع کرایا، اپنے معاصر مشاہیر کی وفات پر، جنوے لکھے تھے ان کو بھی ”یاد رفتگان“ کے نام سے مرتب کرایا، بعض حلقوں میں ان کی ”نقوش سلیمانی“ ہی کی بدولت ان کو صاحب طرز ادیب اور انشاء پرداز تسلیم کیا گیا ہے، لیکن ان کی اور تصانیف غور سے پڑھی جائیں تو ان میں وہ اور بھی بہتر قسم کے انشاء پرداز نظر آئیں گے، شعر و ادب پر تحریر تو خود ہی لکھتی، سرکشی، سنبھلتی اور بل کھا کر نکلتی چلی جاتی ہے، مگر قلم کو پھول کی پتی بنا کر گہرے علوم و فنون کے ہیرے کا کاٹنا بڑا مشکل کام ہے، حضرت سید صاحب نے اپنی تمام تصانیف میں علمی ہیرے کے جگر کو اپنے قلم کے پھول کی پتی سے جس طرح کاٹا ہے اسی میں ان کی انشاء پرداز کی اصلی کمال نظر آتا ہے۔

ان کے تعزیتی مضامین کا مجموعہ ”یاد رفتگان“ کے نام سے شائع ہوا تو یہ ان کے معاصر مشاہیر کے تذکرے کی حیثیت سے ابھی تک پڑھا جاتا ہے، اسی کے ساتھ ان کا سینہ پُر داغ ان کی تحریروں میں لالہ کا خیابان بھی بن گیا ہے۔

دارالمصنفین میں ان کی پرشور، پرسوز لیکن پر بہار تصنیفی زندگی کی ابتداء ان کی ”تاریخ ارض القرآن“ کی دو جلدوں کی اشاعت سے ہوئی ہے، وہ جب کسی تصنیف کا آغاز کرتے تو ان کے ذہن کے سامنے تین ارباب کمال ہوتے: ابن خلکان، مولانا شبلی نعمانی اور نظام حیدر آباد کے وزیر اعظم نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی، تاریخ ابن خلکان

کا مطالعہ اپنی طالب علمی سے لے کر آخر وقت تک کرتے رہے، وہ اس کی اس بات سے متاثر تھے کہ وہ جو کچھ لکھتا ہے بڑی محنت سے لکھتا ہے، روایت پر اعتبار کر کے درایت سے کام لیتا ہے، جو باتیں خلاف عقل ہوتی ہیں ان کو بالکل نہیں چھوڑتا، پھر اس کی عبارت میں لطافت اور بیان میں حسن ہوتا ہے (۱)، ان کے استاد مولانا شبلی نعمانی کی بھی یہ تعلیم رہی کہ معلومات کو ہر کونے سے اس محنت سے ڈھونڈو کہ پھر کوئی کونہ خالی نہ رہ جائے، اس عنوان پر اگر پہلے کسی نے کچھ لکھا ہو تو اس سے مضمون بالکل الگ رہے، یا اس سے بڑھ جائے، جملے کے ساتھ عبارت کی چستی، طرز ادا کی شگفتگی، اور تشبیہ و استعارات کی ندرت ہاتھ سے نہ جائے (۲)، انھوں نے اپنے استاد کی وفات پر جو نوحہ لکھا تھا، اس کی جہاں اور حلقوں میں تعریف ہوئی، وہاں حیدرآباد سے نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی نے ان کو لکھا کہ عرض ہنر اس وقت تک نہیں کرنا چاہئے جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ اب اس ہنر میں میرا کوئی حریف نہیں ہو سکے گا (۳)، یہ لکھ کر حضرت سید صاحب رقم طراز ہیں کہ یہ نکتہ میرے لئے رہنما ثابت ہوا۔

وہ جو کچھ لکھتے بڑی محنت سے لکھتے، سہل انگاری ان کی تصنیفی شریعت میں معصیت تھی، انداز بیان اور تحریر کے وزن، وقار اور حسن کا لحاظ رکھتے، اس وقت تک چھپنے کے لئے کوئی چیز نہ دیتے جب تک کہ ان کو اپنے عرض ہنر پر پورا اطمینان نہ ہو جاتا۔

”تاریخ ارض القرآن“، گو ان کی ابتدائی تصنیف ہے، لیکن یہ کہنے میں تامل نہیں کہ اس کے عرض ہنر میں ان کا اب تک کوئی حریف نہیں ہو سکا، ان کو قرآن مجید سے عشق رہا، اسی لئے انھوں نے اس کی سرزمین کی قوموں کو اپنا محبوب موضوع بنایا، عام طور سے قرآن مجید کو لوگ پند و موعظت اور عبرت و بصیرت کا محض صحیفہ سمجھتے ہیں، لیکن حضرت سید

(۱) رسالہ الندوہ اکتوبر و نومبر ۱۹۰۸ء

(۲) معارف اپریل ۱۹۵۰ء

(۳) یادِ فنکال ص: ۷۸

صاحب نے ”تاریخ ارض القرآن“ لکھتے وقت اس کو تاریخ و سیر کا ایک بہت ہی اہم ماخذ بھی بنا دیا ہے، اسی کے ساتھ اس کے لکھنے میں زبور، توریت، انجیل، پھر یونانی، یورپی اور عرب مؤرخوں کی تصانیف، جغرافیہ کی کتابوں، آثار قدیمہ کے انکشافات اور کتبات کو جس طرح استعمال کیا ہے، اور ان سے جو تاریخی نتائج استنباط کئے ہیں وہ تلاش و تجسس، تفصص، نظر اور فکر کے ایسے نمونے ہیں جن سے آج کل کے مستشرقین بھی استفادہ کر سکتے ہیں، یہ دونوں جلدیں ۱۹۱۵ء اور ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئیں، اس وقت ان کی عمر ۳۴ سال کی تھی۔

ان دونوں جلدوں کی اشاعت کے ساتھ اپنے استاد مرحوم کی سیرۃ النبی ﷺ کی ترتیب و تہذیب بھی پوری جاکا ہی سے کی، ان کے احترام میں ان کے مسودے پر انگلی رکھتے ہوئے ڈرتے تھے، اگر کہیں ایسی گستاخی کرنی پڑی تو بقول ان کے خواب میں چونک جاتے تھے (۱)، پھر بھی کچھ مقامات پر اضافہ کی ضرورت پڑی لیکن کامل احتیاط کی کہ شاگرد کا کوئی لفظ استاذ کی عبارت میں ملنے نہ پائے، اس لئے ان جزوی اضافوں کو قوسین کے اندر جگہ دی، اس کی پہلی اور دوسری جلد کی اشاعت سے خوش تھے کہ استاد مرحوم کے ہاتھ میں حسن عقیدت کے جو پھول سیکڑوں چمن کدوں سے چن کر آئے تھے، ان کو وہ قوم کی نذر کر رہے ہیں، اور آستانہ نبوت پر بھی چڑھا رہے ہیں، اس کی پہلی جلد ۱۹۱۸ء اور دوسری جلد ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی۔

۱۹۲۰ء میں ان کی سیرت عائشہؓ شائع ہوئی، جس میں نسوانیت کی عفت، محبت، طہارت، اطاعت، خشیت الہی اور دوسرے فضل و کمال کا جملہ عروسی سجایا گیا ہے، اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوگا کہ نسوانیت کو کیسے معراج حاصل ہو سکتی ہے اور دنیا کیسے اس کے سامنے جھک سکتی ہے، یہ کتاب ہر مسلمان عورت کی سیرت کے روئے تاباں کے غازہ کا کام دیتی رہے گی، مدینہ منورہ کے ایک استاد نے راقم سے کہا کہ اس پایہ کی کتاب اب تک عربی میں نہیں لکھی گئی، اس کے لکھنے میں کسی تاریخ کا سہارا نہیں لیا گیا ہے، احادیث نبویؐ

(۱) سیرۃ النبی ج: ۱، ص: ۱ (دبیاچہ)



ہی کو تاریخ بنادیا گیا ہے، ان ہی کے سہارے یہ سوانح عمری ایسی مرتب ہو گئی ہے جو بے شمار تاریخی کتابوں کے ذریعے سے نہیں لکھی جاسکتی تھی، اس میں طبقات ابن سعد، تذکرۃ الحفاظ ذہبی، تہذیب ابن حجر، فتح الباری، قسطلانی، نووی، صحیح مسلم، ابوداؤد اور مسند امام احمد بن حنبل وغیرہ سے استفادہ کیا گیا ہے، لیکن زیادہ تر زور صحیح بخاری پر دیا گیا ہے، لکھتے ہیں کہ اس میں حضرت عائشہؓ کے حالات بہت متفرق اور منتشر تھے، لیکن ان کو ڈھونڈ کر اس طرح یکجا کیا جس طرح چیونٹیوں کے منہ سے شکر کے دانے کوئی چنے (۱)، انھوں نے روایت و درایت کے اصولوں کی پابندی میں بڑی احتیاط کی ہے، درایت کے سلسلے میں حضرت عائشہؓ کے اس اصول کو بڑی اہمیت دی ہے کہ روایت کلام الہی کی مخالف نہ ہو، اسی کو سامنے رکھ کر اس کتاب میں بکثرت ایسی روایتوں کو رد کیا ہے جو ان کے اصول و درایت پر پوری نہیں اترتی تھیں، جن حدیثوں کو رد کیا ہے اس سے گزشتہ ۶۵ سال میں علمائے صالحین کو کوئی اختلاف نہیں ہوا، جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کتاب پوری تحقیق کے ساتھ لکھی گئی ہے، البتہ حضرت عائشہؓ کی شادی کے وقت ان کی جو عمر بتائی ہے، اس سے کچھ اختلاف ضرور پیدا ہو گیا ہے، لیکن حضرت سید صاحبؒ کو آخر وقت تک اس پر اصرار رہا کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہی معتبر احادیث کی رو سے صحیح ہے، پھر سوانح نگاری کے فن کے جس معیار سے یہ کتاب جانچی جائے، اس پر یہ پوری اترے گی، حضرت سید صاحبؒ نے طبری، اور ابوالفداء کی بعض روایتوں کی جو تکذیب ابن عبدالبر کی استیعاب، ابن اثیر کی اسد الغابہ، اور سیوطی کی تاریخ کی روشنی میں کی ہے، اس سے ان کی دقت نظر کا اندازہ ہوتا ہے، پھر واقعہ افک اور جنگ جمل کے واقعات کا جس موثر انداز میں تجزیہ کیا ہے، اس کی تاثیر سے متاثر ہوئے بغیر ناظرین نہیں رہ سکتے۔

اس کتاب کے انداز بیان کی خوبی یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کی زندگی کے جو بھی واقعات قلمبند کئے گئے ہیں، وہ آنکھوں دیکھا حال جیسا بین معلوم ہوتا ہے، تمام معلومات

میں ایسا تسلسل ہے کہ سارے واقعات موتیوں کی لڑیاں دکھائی دیتی ہیں، کتاب ختم کرنے کے بعد ناظرین محسوس کریں گے کہ انھوں نے دنیا کی ایک بہت ہی جلیل القدر خاتون، ناصرۃ اسلام کی مریم، کاشانۃ نبوت کی ملکہ اور فضل و کمال کے ایک بے مثال پیکر کے نہ صرف حالات پڑھے، بلکہ قرآن مجید، حدیث اور علم کلام کے بہت سے اسرار سے بھی واقف ہو کر اپنے ایمان کی سلامتی اور ذہن کی جلا کا بھی سامان کر لیا ہے، پھر مودب، متین، با وزن اور با عظمت اسلوب سے بھی مخطوط ہوتے رہے۔

سیرت عائشہؓ کے بعد ”سیرۃ النبیؐ“ کی تیسری جلد ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی، جو خالص حضرت سید صاحبؒ کی تصنیف ہے، اس میں معجزات پر مباحث ۸۶۸ صفحے میں ہیں، ان میں ۸۳ صفحے مولانا عبدالباری ندویؒ کے لکھے ہوئے ہیں، اس میں تاثرات فلکیہ، علل خفیہ، قوت کمالیہ، قوت نفسیہ، تاثرات نفسانیہ، مکالمۃ الہی، وحی، نزول، ملائکہ، عالم رؤیا، مشاہدات، مسموعات، معراج، معراج کے اسرار، اعلانات، انعامات، شق القمر، اور شق صدر پر جو کلامی اور فلسفیانہ رنگ کے مباحث ہیں ان کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی علمی معرفت، دینی بصیرت، تحقیقی دیدہ وری کس طرح اوج کمال کی طرف بڑھ رہی تھی، معجزہ کی غامض بحث میں ہم کو یہ یقین دلایا ہے کہ نبوت کا اصلی معجزہ یہ ہے کہ نبی زنگ آلودہ نفوس اور سیہ کار قلوب کو جلا دیتا ہے، لوگوں کو کتاب و حکمت اور اخلاق کی تعلیم دیتا ہے، اچھی باتوں کو پھیلاتا ہے، برائیوں سے روکتا ہے، طبیات کو حلال اور خباثت کو حرام کرتا ہے، قوموں کے بوجھ کو اتارتا ہے، نیکو کاروں کو بشارت سناتا ہے، بدکاروں کو عذاب الہی سے ڈراتا ہے، اور ظلمت کدہ عالم میں وہ چراغ بن کر چمکتا ہے، خوارق عادات معجزہ نبوت کے ظاہری آثار ہیں، جو صرف وہ لوگ طلب کرتے ہیں جن کے دل کی آنکھیں اندھی ہوتی ہیں، اور جو تعصب و عناد اور جہل کے باعث حق کے ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ کو معجزہ بنی اسرائیل کے مقابلہ میں نہیں بلکہ فرعون کے مقابلے میں دیا گیا، حضرت عیسیٰؑ سے ان کے حواریوں نے نہیں بلکہ یہودیوں نے معجزہ طلب کیا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ نے نہیں، بلکہ ابولہب اور ابو جہل نے معجزہ مانگا، اسی لئے قرآن مجید نے طلب معجزہ کو کفار کی طرف منسوب کیا ہے، لیکن سید صاحبؒ نے اس کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ اس کے یہ معنی نہیں کہ انبیاء علیہم السلام ظاہری آیات اور مادی نشانات سے خالی ہیں، انبیاء علیہم السلام کو باطنی آیتوں کے ساتھ ظاہری حصہ بھی ملتا ہے، قرآن مجید نے اکثر انبیاء علیہم السلام کے سوانح و واقعات کے ضمن میں ان کے ظاہری آثار و فضائل کو بھی تفصیل سے بیان کیا ہے، لیکن یہ مادی اور ظاہری نشانات نبوت کی اصلی حقیقت سے خارج ہیں، سید صاحبؒ نے ان نکتوں کو قرآن مجید کی آیتوں کے ذریعے سے اچھی طرح سمجھایا ہے، پھر سحر و معجزہ کا فرق اور ساحر و پیغمبر میں امتیاز بتا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کا ذکر کیا ہے، ان میں پہلے تو ان معجزانہ واقعات کی تفصیل لکھی ہے جو بہ نص صریح اشارۃ قرآن مجید میں مذکور ہیں، پھر ان معجزات کا ذکر ہے جو صحیح اور مستند روایات سے ثابت ہیں، اور پھر ان معجزات پر بھی بحث ہے جن کو بعض محدثین اور ارباب سیر نے اپنی کتابوں میں جگہ دی ہے، مگر محدثانہ اصول کی بنا پر وہ تمام تر کمزور اور غیر مستند ہیں، حضرت سید صاحبؒ نے اس پر زور دیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش گاہ الہی سے جو معجزات عطا ہوئے ان میں سب سے بڑا معجزہ قرآن مجید ہے، اور انبیاء علیہم السلام کے معجزات وقتی اور عارضی تھے، ہوئے اور ہو کر مٹ گئے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ اعظم قرآن مجید قیامت تک دنیا میں قائم اور باقی رہے گا، اور قیامت تک نئے لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا رہے گا، اس معجزہ کے متعلق خود اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہ اعلان کیا ہے کہ تمام جن و انس مل کر بھی چاہیں کہ اس جیسا قرآن بنائیں تو نہیں لاسکتے، دنیا ہمیشہ اس کی مثالیں پیش کرنے سے عاجز اور درماندہ رہے گی۔ (۱)

اس جلد کے لکھنے میں ان کا اصلی ماخذ قرآن مجید اور احادیث صحیحہ ہیں، قرآن مجید کی آیتوں کے تدبر میں اپنے ہی فہم و ادراک پر زیادہ بھروسہ کیا ہے، تفسیروں کا سہارا نہیں

لیا، احادیث میں صحیح بخاری، صحیح مسلم، ترمذی، ابوداؤد، سنن ابن ماجہ، نسائی، مؤطا امام مالک، مسند احمد بن حنبل، مستدرک حاکم، شرح مواہب اور جوامع الکلم کے حوالے جا بجا دیئے گئے ہیں، توارۃ، اور متی کی انجیل بھی ان کے زیر نظر رہیں، ابن اسحاق اور ابن ہشام بھی ان کے سامنے رہے، ابن حزم کی الملل والنحل کا بھی ذکر ہے، واقدی کا بھی حوالہ آیا ہے، ابن تیمیہ، امام غزالی، ابن رشد، یعقوبی، کندی، فارابی اور بوعلی سینا کے بعض مباحث پر بھی نقد و تبصرہ ہے، مولانا رومی کے اشعار تو بکثرت نقل کئے گئے ہیں، وجود ہستی، وجود عقلی اور وجود خیالی کی بحث میں امام غزالیؒ کا ایک طویل اقتباس نقل کیا گیا ہے، امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات کے بھی اقتباسات دیئے گئے ہیں، حضرت شاہ ولی اللہؒ کی ”حجۃ اللہ البالغہ“ سے عالم مثال کے پورے باب کا ترجمہ دیا گیا ہے، ان کی ”الفوز الکبیر“ کا بھی حوالہ آیا ہے، طبری، سیوطی اور بیہقی کی تاریخوں کے علاوہ ایڈورڈ گبن کی تاریخ زوال روم، ہیکل کی ونڈرس آف لائف کا بھی ذکر ہے، ان ماخذوں کے ذکر کرنے کا منشا یہ ہے کہ حضرت سید صاحبؒ نے اپنے استاذ محترم کی اس نصیحت پر پورا عمل کر دکھایا کہ معلومات کو ہر کونہ اور ہر گوشہ سے اس محنت سے ڈھونڈو کہ پھر کوئی کونہ خالی نہ رہ جائے، اور پھر اس کتاب کے مباحث کی بعض باتوں سے چاہے کتنا ہی اختلاف کیا جائے لیکن اس کے عرض ہنر میں بھی ان کا اب تک حریف نہیں پیدا ہو سکا ہے۔

ان کی مشہور تصنیف ”خطبات مدراس“ ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئی، یہ ان کے آٹھ خطبات کا مجموعہ ہے، جو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے مختلف پہلوؤں پر مدراس میں دیئے تھے، اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ انسانیت کی تکمیل صرف انبیائے کرام علیہم السلام کی سیرتوں سے ہو سکتی ہے، عالمگیر اور دائمی نمونہ صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے، کسی زندگی کا کامل نمونہ اور ہر نقص سے بری ہونا، اس وقت تک ثابت نہیں ہو سکتا جب تک اس کی زندگی کے تمام اجزاء سامنے نہ ہوں، پیغمبرؐ اسلام کی زندگی کا ہر لمحہ پیدائش سے وفات تک ان کے زمانے کے لوگوں کے سامنے رہا، آپ ﷺ کی زندگی

کامل کہی جاسکتی ہے، اس لئے کہ آپ ﷺ میں تمام انبیاء کی خصوصیات جمع کر دی گئی تھیں، ان کو عمل کر کرے دکھایا، بحیثیت ایک عملی پیغمبر کے آپ کی سیرت درحقیقت قرآن پاک کی عملی تفسیر ہے، اور انبیاء علیہم السلام کے پیغامات کسی خاص زمانہ اور قوم کے لئے تھے، وقتی تھے، دائمی نہ تھے، لیکن آپ ﷺ کا پیغام آخری تھا، اور تمام دنیا کے لئے تھا، اس لئے رب العالمین نے آپ ﷺ کو رحمۃ للعالمین کہا، آخری باب میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اسلام میں نجات کا معیار دو چیزوں پر رکھا گیا ہے، ایمان اور عمل صالح پر، ان تمام باتوں کے لکھنے میں ان ہی ماخذوں کا سہارا لیا گیا ہے، جن سے سیرۃ النبی لکھی جا رہی تھی، اور جو باتیں لکھی گئی ہیں وہ ناقابل رد منطقیا نہ دلائل سے قلمبند ہوئی ہیں، لیکن اس کی اصلی خوبی انشاء پر دازانہ انداز بیان ہے، جس کا مطالعہ کرتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی مرقع آرائی کرنے میں حضرت سید صاحب کا قلم مانی کا موئے قلم بن گیا ہے اور آپ ﷺ کی سیرت کی نقش آرائی میں بہزاد کی مصوری کا رنگ پیدا ہو گیا ہے، اس کو پڑھتے وقت کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارک سے حضرت سید صاحب کی شیفگی کے گنبد مینائی پر ان کے سوز پنہاں کا چراغاں ہو رہا ہے، پوری کتاب پڑھنے کے بعد قارئین کو یہ کہنے میں تاہل نہیں ہوگا کہ:

شہد مضمون تصدق ہے ترے انداز پر

دنیا کے ادب و انشاء کے شاہکار کی کوئی فہرست تیار ہوگی تو اس میں یہ کتاب ضرور شامل کی جائے گی۔

۱۹۲۹ء میں ان کی دوسری مشہور کتاب ”عرب و ہند کے تعلقات“ شائع ہوئی،

اس کو پڑھ کر یہ کہنے میں تاہل نہ ہوگا کہ اگر ابن خلکان یا ابن خلدون یا یورپین مؤرخوں میں ایڈورڈ گنن، یا موسیو لیبیان یا ایچ۔ جی۔ ویلس اس موضوع پر لکھتے تو شاید اس سے بہتر نہیں لکھ سکتے تھے، اس میں یہ دکھایا گیا ہے، کہ پہلے عرب اور ہندوستان کے درمیان تجارتی علمی اور مذہبی تعلقات کے دودھ اور شہد کے دریا کس طرح بہتے تھے، حضرت سید صاحب

نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کو خوشگوار بنانے میں جہاں اور بہت سی تحریریں لکھیں وہاں اسی مقصد کی خاطر یہ کتاب بھی لکھی، ان کو برابر دکھ رہا کہ ہندوستان کی یونیورسٹیوں کی تاریخ کی کتابوں میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسی باتیں جمع کی جاتی ہیں جن سے ہندو مسلمان کے جذبات میں مزید اشتعال پیدا ہو، اور دونوں کا اتفاق آئندہ مشکل سے بڑھ کر محال ہو جائے، حالانکہ اس ملک کی تاریخ میں ایسے واقعات کی کمی نہیں جن کے پڑھنے سے دونوں کے درمیان اختلاف کے بجائے محبت پیدا ہوتی، مگر بازاری قدر دانی کے تابع مصنف و کتب فروش اپنی ذاتی عارضی کامیابی کے ساتھ ملکی اور قومی بھلائی کی قیمت کی پرواہ نہیں کرتے۔ (۱)

یہ کتاب ہندوستان کے ان مؤرخوں کے لئے ایک نمونہ ہے جو واقعی دل سے اس ملک میں جذباتی ہم آہنگی کے قائل ہیں، اس کے لکھنے میں حضرت سید صاحب نے اپنی عمر کے ۲۴ برس صرف کئے، اس سے ان کی تصنیفی زندگی کے سوز دماغ اور سوز جگر کا بھی اندازہ ہوگا، اور یہ بھی کہ علمی نگاہ میں شباب و مستی و ذوق و سرور و رعنائی ہوتی ہی علمی کمال کا حاصل ہونا ممکن ہے، اس کے لکھنے میں عرب سیاحوں، جغرافیہ نویسوں، تاجروں، جہازرانوں، مؤرخوں، ادیبوں اور شاعروں کی تحریروں سے جس طرح استفادہ کیا گیا ہے اس سے اندازہ ہوگا کہ کونہ کونہ سے معلومات ڈھونڈنے میں کیا ریاضت کرنی پڑتی ہے۔

۱۹۳۱ء میں ان کی ”عربوں کی جہاز رانی“ شائع ہوئی، اس میں وہ چار خطبے ہیں جو حکومت بمبئی کے شعبہ تعلیم کی دعوت پر دیئے گئے تھے، یہ بڑا ہی خشک موضوع تھا، قرآن پاک میں جہاز رانی کے متعلق جس قدر الفاظ اور دریا کے تلاطم وغیرہ کے جتنے مناظر و کیفیات ہیں، ان سے اس کتاب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اہل عرب اس فن سے پورے طور سے واقف تھے، حضرت سید صاحب ماہر قرآنیات ہونے کی وجہ سے قرآن پاک کو طرح طرح سے بڑی لذت کے ساتھ اپنی کتابوں اور تحریروں میں ماخذ بناتے رہے، اواگر

(۱) خطبہ صدارت آل انڈیا ہسٹری کانگریس شعبہ ازمینہ وسطی مدراس۔

ان تمام سورتوں اور آیتوں کو ایک ساتھ جمع کر دیا جائے جو ان کی مختلف تحریروں میں زیر بحث رہی ہیں تو اس سے ظاہر ہوگا کہ کلام پاک کا زیادہ تر حصہ ان میں منتقل ہو گیا ہے، عربوں کی جہاز رانی کے سلسلے میں اپنی تحقیقی دیدہ وری سے یہ بھی دکھایا ہے کہ انھوں نے سمندروں کی پیمائش کس طرح کی، ان کے نقشے کس طرح مرتب کئے، جہاز رانی کے کیا کیا قوانین مدون کئے، لائٹ ہاؤس کہاں کہاں بنائے، قطب نما کس طرح ایجاد کیا، جہاز رانی کے کارخانے کہاں کہاں قائم کئے، ڈوبے ہوئے جہازوں کو نکالنے کے لئے کون کون سے آلات بنائے، بحریات پر کون کون سی کتابیں لکھیں، ان سب کی تفصیلات پڑھنے سے یہ بھی اندازہ ہوگا کہ حضرت سید صاحب کا ذہن مسلمانوں کے کمالات دکھانے میں کس کس سمت میں پرواز کرتا رہا۔

۱۹۳۳ء میں ان کی ”سیرۃ النبیؐ“ کی جلد چہارم شائع ہوئی، جو ۸۸۸ صفحات پر مشتمل ہے، اس وقت ان کی عمر ۵۳ سال کی ہو چکی تھی، لیکن ان کا قلم روز بروز رعنا اور جوان ہوتا جا رہا تھا، اس جلد کا موضوع منصب نبوت ہے، نبوت کی فلسفیانہ حقیقت کی تشریح امام غزالیؒ نے معارج القدس اور حضرت شاہ ولی اللہؒ نے ”حجۃ اللہ البالغہ“ میں کی ہے، حضرت سید صاحبؒ نے ان کو سامنے رکھ کر منصب نبوت کی فلسفیانہ حقیقت کو جس انداز میں ظاہر کیا ہے، اس کو پڑھنے میں اردو داں اہل ذوق کو وہی لطف ملے گا، جو عربی دانوں کو امام غزالیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کی مذکورہ کتابوں میں ملتا ہے، نبوت کی حقیقت، نبی کی ضرورت، نبی کی عصمت، نبی کی محبوبیت، مصلحین کے اقسام، بعثت کے لئے کسی قوم کا انتخاب، نبوت کے لوازم اور خصوصیات، درسی استعداد، غیبی علم، غیر مادی علم، غیب کی حقیقت، وحی، مملکت نبوت، وحی متلو اور وحی غیر متلو، الہام، اجتہاد، آیات اور ملکوت کی رویت وغیرہ جیسے غامض موضوعات کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے بیسویں صدی کا ذہن جس زبان، اسلوب اور طرز ادا کا طلب گار ہے، حضرت سید صاحبؒ نے وہی پیرایہ اختیار کر کے اس کو مطمئن کیا ہے، ان تمام باتوں کو متکلمانہ انداز سے سمجھانے کے ساتھ ہی ساتھ ان مباحث

میں جب وہ مجوسیت کی مزدکیت یہودیوں کی یہودیت، عیسائیوں کی عیسائیت، ہندوؤں کی ہندویت اور بودھوں کی بدھ مت کا ذکر کر کے نوشیرواں، قباذ، خسرو، قسطنطین جسٹین اور یزدگرد وغیرہ کی حکمرانی کی کچھ تفصیل لکھتے ہیں تو منتکلم کے بجائے مؤرخ نظر آتے ہیں، اسی کے ساتھ ظہور اسلام کے پہلے عرب میں جو شرک، جنات کی الوہیت، اور تین سوساٹھ بتوں کی پرستش، شیاطین، بھوت پریت اور کہانت کے جو تخیلات تھے ان کو قرآن کی آیتوں اور احادیث صحیحہ کے ذریعے سے پیش کرنے کے بعد یہ دکھایا ہے کہ اس ظلمت شب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خورشید نبوت طلوع ہوا تو ظلمت شب کا نور ہو گئی، پھر تبلیغ نبویؐ کے اصول اور کامیابی کے سلسلے میں اس کی وسعت، تنظیم، قدرتی ترتیب، دعوت بالقرآن، موانع کے ازالے کے عنوانات سے جو بحث کی ہے اس سے قارئین کو معلوم ہوگا کہ اسلام کی ہمہ گیر تعلیمات کس طرح انسان کی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہوتی گئیں۔

پھر اس جلد میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان کیسا ہو، توحید اور اس کے ایجابی اصول و ارکان کیا ہونے چاہئیں، ان پر جو مباحث ہیں، ان کا طرز استدلال ایسا ہے کہ اس سے متشقف علماء، ذہین متکلمین، جدت پسند معتزلیں اور نمار توحید سے محمور صوفیائے کرام کو بھی اختلاف نہیں ہوا، عام قارئین کو تو اپنے ذہن کی تاریکی میں چاندنی پھیلتی ہوئی دکھائی دے گی اس میں توحید پر جو باب ہے اس کو پڑھ کر مستشرقین کو بھی سوچنا پڑے گا کہ عیسائی پادریوں نے تثلیث کو جس طرح معممہ بنا دیا ہے، اس کا حل دراصل توحید کی اس تعلیم میں ہے جو اسلام میں دی گئی ہے۔

۱۹۳۳ء میں ان کی علمی تحقیقات کا اعلیٰ ترین معیار ان کی کتاب ”خیام“ کی اشاعت سے ظاہر ہوا، اس کا فاضلانہ حصہ وہ ہے جس میں خیام کے ماخذوں پر نقد و تبصرہ ہے، خیام پر فرانسیسی، روسی، انگریز مستشرقین نے جو کچھ لکھا ہے اس پر اپنی رائے کے مقابلے میں ان کی رائے کو رد کر کے ان ماخذوں کے نام لکھے ہیں جو صحیح ترتیب زمانی کے لحاظ سے قابل اعتبار ہیں، خیام کے حالات زندگی کے سنین بہت ہی ناصاف اور گنجلک

تھے، ان کو صاف متفق کیا، پھر اس کی ذات سے جو من گھڑت قصے منسوب ہو گئے ہیں اس کی تردید پورے وثوق کے ساتھ کی ہے، اس کے نام، مولد، ولادت اور وفات کے سنیں بھی متعین کئے ہیں، ان کے اساتذہ اور تلامذہ کی بھی تفصیل لکھی ہے، جو رباعیات اس کی طرف منسوب ہو گئی ہیں، ان کو غلط ثابت کر کے اس کی اصلی رباعیات کی طرف توجہ دلائی ہے، یورپ میں وہ عام طور سے ایک رند مشرب، عورتوں کے پیچھے دیوانہ رہنے والا، مذہب کا تمسخر کرنے والا، ابلیس کا سفیر اعظم، عظیم کافر اور ایرانی بد معاش قسم کا شاعر سمجھا جاتا ہے، لیکن حضرت سید صاحب نے اپنی غیر معمولی تحقیقات سے اس کتاب میں یہ ثابت کیا ہے کہ فلسفہ و حکمت میں بوعلی سینا کے بعد اسی کا درجہ تھا، گو اس کو خود علم نجوم سے عقیدت نہ تھی لیکن وہ اپنے منجمنہ کمالات کی وجہ سے مشہور تھا، وہ سلجوقی حکمران ملک شاہ کا طبیب بھی تھا، علوم عقلیہ کا بھی ماہر رہا، فن قراءت میں ید طولی رکھتا تھا، اس کو ہندی ریاضیات سے بھی واقفیت تھی، اس نے جبر و مقابلہ، اقلیدس، طبیعیات، فلسفہ اور تصور وجود پر رسالے لکھے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا علم ایک بحر ذخار تھا، جس کی علمی موجیں اور لہریں مختلف سمتوں میں امنڈتی رہیں، اس نے حج بھی کیا، نماز بھی پڑھتا تھا، خدا اور رسول ﷺ کا قائل تھا، مگر حکیم تھا، متکلم حکیم نہ تھا، فلسفی حکیم بھی نہ تھا، اسماعیلی حکیم بھی نہ تھا، مگر تھا تو صوفی حکیم، اس کتاب کی اشاعت سے اس کے متعلق تمام اصحاب نظر کے سوچنے کا ڈھنگ ہی بدل گیا۔

۱۹۳۳ء میں ان کی ”سیرۃ النبیؐ“ جلد پنجم شائع ہوئی، جس میں اس کی تشریح کی گئی ہے کہ اسلام میں عبادات کی حقیقت کیا ہے، اس کے اقسام کتنے ہیں؟ ان میں کیا مصلحت و حکمت رکھی گئی ہے، عمل صالح کیا ہے، اس میں نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، جہاد کی مختلف قسموں، تقویٰ، اخلاص، توکل، صبر، شکر پر قرآن مجید اور احادیث کی روشنی میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس میں اختلافی رنگ پیدا نہیں ہونے پایا ہے، فقہی مسائل کو بھی کلامی انداز میں اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ فقہاء اور متکلمین دونوں مطمئن نظر آتے ہیں، ان مباحث میں باتیں وہی ہیں جو چودہ سو سال سے لکھی جا رہی ہیں لیکن ان کے لکھنے کا انداز کچھ ایسا

ہے کہ پڑھنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو چیزیں اب تک نہیں معلوم تھیں وہ اب معلوم ہو رہی ہیں، یہ محض پیش کرنے کا اعجاز ہے۔

ان کی ”سیرۃ النبیؐ“ جلد ششم ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی، جس کے ۸۷۲ صفحات ہیں، اس میں اخلاق کی اہمیت بتائی گئی ہے، اور بہت ہی حسین پیرایہ میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اسلام کے ارکان پنجگانہ یعنی ایمان، نماز، روزہ، حج، اور زکوٰۃ کے نام الگ الگ جو کچھ ہوں، مگر ان کے بنیادی مقاصد میں اخلاقی تعلیم کا راز مضمر ہے، اگر ان عبادات سے یہ روحانی اور اخلاقی ثمرہ ظاہر نہ ہو تو وہ احکام کی محض لفظی تعمیل ہے، مگر عبادات کے جوہر و معنی سے یکسر خالی ہیں، وہ درخت ہیں جن میں پھل نہیں، وہ پھول ہیں جن میں خوشبو نہیں، وہ قالب ہیں جن میں روح نہیں، پھر اسلام کے فلسفہ اخلاق سے متعلق جہاں اور باتیں لکھی ہیں وہاں یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ اسلام کے اخلاق کا فلسفہ یہ بھی ہے کہ جو شخص کسی کے ساتھ برائی کرے اور اس کے ساتھ اتنی ہی برائی کی جائے تو یہ عدل ہے، اور اس کو چھوڑ دینا، معاف کر دینا اور درگزر کرنا یہ احسان ہے، اسلام میں ان دونوں کے الگ الگ مراتب ہیں، قانون عدل کو جماعت اور سلطنت کے ہاتھ میں دیا گیا ہے، یہ کسی ایک شخص کا کام نہیں ہے، مگر احسان ہر شخص کے ہاتھ میں ہے، یہ محض شخصی معاملہ ہے، پھر قانون اور اخلاق کی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ دنیا میں امن و امان اور عدل و انصاف کے قیام اور فتنہ و فساد اور برائیوں کے انسداد کے لئے دو چیزیں ہیں، قانون اور اخلاق، گوان دونوں کا منشاء ایک ہی ہے مگر ان کے منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے راستے مختلف ہیں، ان دونوں میں کچھ نہ کچھ کمی ہے، اس کی تلافی ایک دوسرے سے ہوتی ہے، قانون برائیوں کو تو روک دیتا ہے، مگر دل میں اس برائی کی طرف سے کراہت کی کوئی روحانی کیفیت نہیں پیدا کر سکتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں عدل، احسان، قانون اور اخلاق کی جامعیت ہے، توراۃ محض قانون ہے، انجیل محض اخلاق ہے، مگر اسلام نے قانون اور اخلاق دونوں کے درمیان حد فاصل قائم کر کے ہر ایک کی حد مقرر کر دی ہے، اور اپنی شریعت کی کتاب میں

قانون کو قانون کی جگہ اور اخلاق کو اخلاق کی جگہ رکھ کر انسانیت کو تکمیل تک پہنچا دیا، موسوی، عیسوی اور محمدی اخلاقی تعلیمات میں باہم جو باریک فرق ہے، وہ اسی قانون اور اخلاق کی علیحدگی اور ترکیب کا نتیجہ ہے (۱)۔ سید صاحب نے اس کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ انتظام اور سزا کا اصول نہ ہو تو جماعت کا نظام قائم نہیں رہ سکتا، لیکن اگر عفو کا اصول نہ ہو تو روح کی بلندی اور اخلاق کی پاکیزگی جیسی کوئی چیز نہ رہے، اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ سزا اور انتقام تو حکومت کے ہاتھ میں رہے، اس کے اجراء میں رحم نہ کیا جائے اور امیر و غریب، بڑے چھوٹے میں تفریق نہ ہو، تاکہ جماعت اور ملک کا نظام قائم رہے، مگر اسلام میں عفو کی بھی اہمیت ہے، تاکہ اس سے شخصیت کے مدارج کمال کا ذریعہ پیدا ہو اور اشخاص کی روحانی پاکی اور اخلاق کی بلندی برابر ترقی کرتی رہے۔

پوری کتاب میں علاحدہ علاحدہ عنوانات سے فضائل اخلاق، رذائل اور آداب اخلاق کی تفصیلات ہیں، فضائل اخلاق کو ربوبیت، ملکوتیت اور نبوت کے محاسن قرار دیئے ہیں، رذائل اخلاق کو شیطان کے خصائص بتائے ہیں، اس میں جو باتیں بتائی گئی ہیں ان کی تائید کے لئے فوراً قرآن کی آیتیں اور حدیثیں پیش کر دی گئی ہیں، اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی کے واقعات بھی قلمبند کرتے جاتے ہیں، تاکہ معلوم ہو کہ آپ ﷺ نے جو کچھ کہا سب سے پہلے خود اس کو کر دکھایا، مثلاً اگر غریبوں اور مسکینوں کی امداد و اعانت کا حکم دیا تو پہلے خود اس فرض کو ادا کیا، خود بھوکے رہے، دوسروں کو کھلایا، اگر آپ ﷺ نے اپنے دشمنوں اور قاتلوں کو معاف کرنے کی نصیحت کی تو پہلے خود اپنے دشمنوں اور قاتلوں کی معاف کیا، آپ ﷺ کی حیثیت ایک انسان، ایک باپ، ایک شوہر، ایک دوست، ایک خانہ دار، ایک کاروباری تاجر، ایک افسر، ایک واعظ، ایک قاضی، ایک سپہ سالار، ایک بادشاہ، ایک مرشد، ایک زاہد اور آخر میں ایک پیغمبر کی نظر آتی ہے، ہر حیثیت سے آپ ﷺ اپنے قول و عمل میں مکمل نظر آتے ہیں، دوسرے مذاہب کے لوگ انسانوں کو اپنے ہادیوں

اور رہنماؤں کی تعلیمات اور احوال سناتے ہیں، اور ان کی پیروی کی دعوت دیتے ہیں مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو نہ صرف آپ ﷺ کے اقوال و نصائح بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی نمونوں اور کارناموں کو پیش کرتے ہیں، آپ ﷺ خود کامل ہوئے تو دوسرے ناقصوں کو کامل بنایا، خود پاک ہوئے تو دوسرے ناپاکوں کو بھی دھو کر پاک کیا، یہ جلد تو اس لائق ہے کہ روزانہ اس کے کسی نہ کسی حصہ کا مطالعہ کیا جائے، غیر مسلم اپنے تعصب کی عینک اتار کر اس کو پڑھیں تو ان کو بھی معلوم ہوگا کہ اس سے بہتر اخلاقی تعلیمات نہیں دی جاسکتی ہیں۔

۱۹۳۹ء میں بچوں اور عورتوں کے لئے بہت ہی سلیس اور آسان زبان میں رسول اللہ ﷺ کی سیرت ”رحمت عالم“ کے نام سے لکھی، جو ایسی مقبول ہوئی کہ معلوم نہیں اس کے اب تک کتنے ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

ان کو اپنی گونا گوں مشغولیتوں اور دلچسپیوں میں اپنی آخرت کا بھی خیال برابر رہا، اور وہ دعا گور ہے:

غم امروز بھلا دے غم فردا دے دے

اسی کیفیت میں اپنے کو مٹا کر حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے آستانے پر جھک گئے، جس کے بعد ان کی طبیعت کا رنگ بدل گیا، جیسا کہ ان کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے:

عالم کے تماشے نہیں اب جاذب دل ہیں ہر لذتِ ہستی کا مزہ بھول گیا ہوں

اس زمانے میں ان پر جو کیفیات طاری رہیں ان کا اظہار اپنی کچھ نظموں اور غزلوں میں بھی کیا ہے، اس سے پہلے بھی مختلف عنوانات سے کچھ اشعار کہے تھے اور داد بھی حاصل کی، لیکن انھوں نے اپنے استاد محترم مولانا شبلی نعمانیؒ کے متعلق لکھا ہے کہ ان کی اردو شاعری خود رد پودا ہے، نہ انھوں نے اس میں کسی سے اصلاح لی اور نہ جم کر شاعری کی، اور نہ کبھی اردو شاعری کو عزت اور شہرت کا ذریعہ سمجھا (۱)، یہی بات ان کے لئے بھی کہی جاسکتی

ہے، وہ فن عروض میں بڑی مہارت رکھتے تھے، اس کے سہارے جب کبھی طبیعت موزوں ہوتی یا کسی واقعہ سے متاثر ہوتے، یا خاص سبب سے ان کی جذبات میں تلاطم پیدا ہوتا، تو نظمیں اور غزلیں کہہ لیتے، ڈاکٹر اقبالؒ نے ان کو یہ مشورہ دیا تھا کہ مولانا شبلیؒ کی طرح نظمیں لکھا کریں، مگر اپنی تصنیف و تالیف کے غیر معمولی انہماک میں اس کی طرف توجہ نہ کر سکے، یوں تو وہ اپنی پوری زندگی میں بارگاہِ الہی میں زبان حال سے کہتے رہے:

مری دنیا میں تیری پادشاہی

مگر روحانی انقلاب کے بعد ذکرِ حلی و خفی اور رشد و ہدایت میں ان کو لذتِ ہستی ملنے لگی، اور ان کی جو روحانیت ان کی مانند حرمِ پاک طبیعت کے اندر دبی ہوئی تھی وہ اچھی طرح ظاہر ہونے لگی اور لوگ اُن کی طرف ایک مُرشدِ کامل کی حیثیت سے رجوع کرنے لگے تھے، مگر حضرت تھانویؒ کے آستانے پر جھک جانے کے باوجود اپنے استاذِ محترم مولانا شبلی نعمانیؒ کی یاد برابر تازہ رکھی، ان کی یہ وصیت تھی کہ جب وہ تمام کاموں سے فارغ ہو جائیں تو ان کی سوانحِ عمری لکھ دیں، اسی کی تعمیل میں ۱۹۴۳ء میں ان کی ضخیم تصنیف ”حیاتِ شبلی“ تیار ہوئی جس میں انھوں نے اپنے جلیل القدر استاد کی خدمت میں اپنی شیفٹنگی کا نذرانہ پیش کیا ہے، اس میں نہ صرف ان کی زندگی کے کمالات و اجتہادات کا احاطہ کیا گیا ہے، بلکہ ان کے دور کی پوری علمی تاریخ بھی سمٹ آئی ہے۔

”سیرۃ النبیؐ“ جلد ہفتم ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی، وہ معاملات اور سیاسیات پر اسلام کی تعلیمات ایک علیحدہ جلد میں پیش کرنا چاہتے تھے، مگر اپنی خرابی صحت کی وجہ سے مکمل نہ کر سکے، اس کے کچھ ابواب لکھے تھے، ان ہی کو ترتیب دے کر شائع کر دیا گیا ہے، اس کے عنوانات یہ ہیں: معاملات، اسلام میں حکومت کی حقیقت و اہمیت، عہدِ نبویؐ میں نظامِ حکومت، سلطنت اور دین کا تعلق، سلطنت اور ملکیت کی حقیقت، امتِ مسلمہ کی بعثت، قوتِ عاملہ یا قوتِ آمرہ، حاکم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے، یہ جلد نامکمل سہی، پھر بھی ان ملکوں کے لئے جہاں کے حکمران اپنے کو اسلامی فرماں روا کہتے ہیں، اس کی بہت سی

باتیں مشعلِ ہدایت بن سکتی ہیں۔

حضرت سید صاحبؒ کی ”سیرۃ النبیؐ“ کی پانچوں جلدوں کا جائزہ جلد ہفتم کو چھوڑ کر جس حیثیت سے بھی لیا جائے گا ان کے عرضِ ہنر میں کسی قسم کی کمی نہ پائی جائے گی، مولانا شبلی نعمانیؒ نے ”سیرۃ النبیؐ“ لکھنی شروع کی تھی تو ان پر یہ خیال غالب رہا کہ یہ ایسی ہو کہ اس کی بلندی کو کوئی اور کتاب نہ پہنچ سکے، حضرت سید صاحبؒ نے اپنے استاد کی اس خواہش کو پورا کر دکھایا، ان جلدوں کی گونا گوں خوبیوں میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ بقول خود حضرت سید صاحبؒ ان کے لکھنے میں ان کی اپنی کوشش یہی رہی کہ قدم اس راستے سے نہ ہٹے جو صراطِ مستقیم ہے، اور وہ سرِ رشتہ نہ چھوٹے جو ہر مسلمان کا عروۃ الوثقیٰ ہے (۱)، اور یہ جلدیں ان کے لئے زادِ راہِ سفرِ آخرت ہیں، انہوں نے خود بڑے فخر سے لکھا ہے کہ:

”سیرۃ النبیؐ کی بحث میں قرآن پاک میری عمارت کی بنیاد ہے اور حدیثِ نبویؐ

اس کے نقش و نگار ہیں، اور یہی دونوں میرا سرمایہ اور یہی میرے زادِ راہ ہیں، ایک

اصل ہے، دوسرا نقل، ایک وحیِ جلی ہے، دوسرا خفی، ایک دلیل ہے، دوسرا نتیجہ،

جس کو یہ ایک دُفطر آئے وہ احوال ہے، لا حول ولا قوۃ الا باللہ“ (۲)۔

ان چند جملوں میں ان کی ”سیرۃ النبیؐ“ کی پوری نوعیت سامنے آ جاتی ہے، وہ کلامِ پاک اور احادیثِ مقدسہ کے سہارے جو کچھ لکھتے اس کو اپنے کلامی رنگ کی تحریروں سے مؤثر بنا دیتے، وہ جب توحید، ذاتِ باری تعالیٰ، صفاتِ باری تعالیٰ، نبوت، حقیقت، وحی، ملائکہ، معجزہ، روح، معاد، جبر اور قدر جیسے مسائل پر بحث کرتے ہیں تو اعلیٰ قسم کے متکلم نظر آتے ہیں، جب یہ کہا جائے کہ ان کے متکلمانہ مباحث سے ہر زمانے میں فکر و نظر کی جلا ہوتی رہے گی، تو اس پر یقین کر کے اپنے ذہن کی عفتِ مآبی کا ثبوت ضرور دیا جائے، ان جلدوں کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ابنِ اسحاق، ابنِ ہشام اور طبری کی کتابیں زیادہ تر

(۱) دیباچہ سیرۃ النبی جلد ہفتم

(۲) مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں ص: ۱۲

مغازی، اخلاق نبویؐ اور شمائل نبویؐ پر مشتمل ہیں، لیکن یہ پانچویں جلدیں ان نامور مصنفین سے بہت آگے بڑھ کر اسلامی تعلیمات کی دائرۃ المعارف بن گئی ہیں، ان کو لکھتے، وقت حضرت سید صاحبؒ کو خیال رہا کہ مباحث و عقائد میں سلف صالحین کے مسلک سے علیحدگی نہ ہو، اسی کے ساتھ انھوں نے فقہاء میں کسی ایک مجتہد کی تقلید نہ کی بلکہ دلائل کی تنقید کے بعد فقہاء کے کسی ایک مسلک کو ترجیح دی ہے، لیکن کبھی کوئی ایسی رائے اختیار نہیں کی جس کی تائید ائمہ فہم میں سے کسی ایک نے بھی نہ کی ہو، خصوصیت کے ساتھ مسائل کی تشریح میں حافظ ابن تیمیہؒ، حافظ ابن قیمؒ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تحقیقات پر اکثر اعتماد کیا، ایسا بھی ہوا کہ دو چار دفعہ ایک تحقیق کے بعد ہی نئی تحقیق سامنے آئی اور ان کو اپنی غلطی ظاہر ہوئی تو بعد کے ایڈیشن میں اس کے مطابق تبدیلی کر دی (۱)۔ یہ ان کی انتہائی تصنیفی دیانت داری کا ثبوت ہے، حدیث کی صحیح روایتوں کو قلمبند کرنے میں اصول و فروع قائم کر کے ان کے تجزیہ کرنے میں روایت و درایت کی پوری احتیاط کی۔

جہاں تک ماخذوں کا تعلق ہے تیسری اور چوتھی جلدوں کے مباحث میں مشاہیر کی بعض کتابوں کے تھوڑے بہت حوالے ضرور ہیں، ورنہ تمام تر قرآن پاک اور صحاح ستہ ہی کو ماخذ بنا کر سارے مباحث قلمبند کئے گئے ہیں، اگر دوسرے مذاہب سے کہیں موازنہ اور مقابلے کی ضرورت پڑی ہے تو مناظرانہ رنگ اختیار کرنے کے بجائے یہ دکھایا گیا ہے کہ اسلام کی تعلیم تمام عالم کی اصلاح کے لئے کس قدر ضروری اور کافی ہے۔

ان جلدوں کا بہت بڑا فیض یہ بھی ہے کہ اس سلسلے کی اشاعت سے پہلے اس موضوع پر اردو میں کوئی قابل قدر کتاب نہ تھی، اس کے بعد چھوٹی بڑی کتابیں نئے نئے دعوؤں کے ساتھ ان ہی جلدوں کو سامنے رکھ کر لکھی جا رہی ہیں، اور سیرت کا عظیم الشان ذخیرہ ہماری زبان میں پیدا ہوتا جا رہا ہے، ان جلدوں نے یہ بھی تصنیفی درس دیا ہے کہ عنکبوتی رنگ اختیار کر کے مواد اور تحریر کے صرف جالے نہ تنے جائیں، یا نملی رنگ اختیار

کر کے مواد کا صرف ڈھیر نہ لگایا جائے بلکہ نئی رنگ اختیار کر کے علوم و فنون خصوصاً اسلامی علوم و فنون کے پھولوں سے رس نچوڑ کر نظر و فکر کے شہد کا ایک انبار لگا دیا جائے۔

ان کی ”سیرۃ النبیؐ“ میں بہت سے مباحث ہیں، ان میں معجزہ کی لازمی شرط نبوت، دوزخ کی ابدیت وغیرہ ابدیت، برزخ کی معصومیت پر کچھ جزوی اختلافات ہوئے، ورنہ پوری کتاب اب تک مذہبی افکار اور جدید علم کلام کی چمنستان اور سنبلستان بنی ہوئی ہے، یہ پوری جلدیں مسلمانوں کا دستور حیات ہیں، ان کی زندگی کی کیمیائے سعادت میں مستشرقین کے زہر کا تریاق بھی ہے۔

پھر ان جلدوں میں اسلوب اور طرز ادا کا جو طاقتور انداز اختیار کیا گیا ہے وہ بھی ان کی بڑی خوبی ہے، یہ قرآن پاک کی آیتوں کا گلزار بنی ہوئی ہیں، احادیث مقدسہ کا لالہ زار بھی ہیں، فقہی رموز و نکات کا مرغزار بھی ہیں اور کلامی مباحث کا سمن زار بھی ہیں، لیکن ان کا مطالعہ کرتے وقت محراب و منبر کے مواعظ کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی، بلکہ ان میں وہی طرز استدلال ہے، وہی فصاحت و بلاغت کی شیوا بیانی ہے، جملوں کے دروبست اور الفاظ و تراکیب کے انتخاب کا وہی حسن ذوق، زبان کی وہی زور آوری اور انشاء پر دازی کی وہی لالہ کاری ہے، جس کا طالب بیسویں صدی کا ذہن ہے، ان میں اردو زبان کا وہی پیرایہ بیان نظر آتا ہے جس سے دنیا کی ترقی یافتہ زبانیں اپنے غوامض اور دقائق کو شگفتہ اور رفتہ انداز میں پیش کیا کرتی ہیں۔

ان کی انشاء پر دازی کا جو ہر ان کی اور تصانیف میں بھی چمکتا نظر آئے گا، ”تاریخ ارض القرآن“ کے خشک موضوع کو اردو کے جس پیرایہ بیان کا متحمل بنایا ہے یا ”سیرت عائشہؓ“ میں وزن اور وقار جس طرح ان کے قلم کو چومتے دکھائی دیتے ہیں، یا ”خطبات مدراس“ میں ادب و انشاء کا جو سنبلستان دیدہ زیب بن گیا ہے، یا عرب و ہند کے تعلقات میں عمیق تحقیق کے ساتھ زبان و بیان جو ہر کا ب ہے، یا خیام میں نقد و تبصرہ کے ساتھ جو باطل اور پر شکوہ انداز تحریر ہے، یا رحمت عالم میں بچوں کے لئے جو سلیس اور آسان زبان



اختیار کی گئی ہے، یا حیاتِ شبلیٰ میں فنِ سوانح نگاری کے ماتحت جو اسلوب ہے، یا ان کے متفرق مضامین اور ”معارف“ کے شذرات میں قلم کی جو بوقلمونی ہے، ان تمام تحریروں، کارناموں کا تجزیہ ادب و انشاء کے فن کے لحاظ سے کیا جائے تو ان کے قلم کی سکندری اور صاحبِ قرانی کا صحیح اندازہ ہوگا، ان کے ادب و انشاء کو محض ان کی نقوشِ سلیمانی یا یادِ رفتگان میں محبوس اور مقید نہ کر دیا جائے۔

دارالمصنفین کی علمی زندگی کے ساتھ وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے لئے بھی لزوم مالا یلزم رہے، یہیں انھوں نے عروسِ علم کی مشاطگی سیکھی تھی، یہیں انھوں نے اس کے گیسوئے تابدار کو اور تابدار بنانے کا خواب زریں دیکھا تھا جس کی تعبیر ان کی پوری زندگی رہی، اس لئے دارالمصنفین اگر ان کے علم کا نمکدہ تھا تو ندوہ ان کے ذہن کا عشرت کدہ بنا رہا، دارالمصنفین کے علمی مشاغل سے تھک جاتے تو ندوہ پہونچ کر تازہ دم ہو جاتے، وہ اس کے معتمدِ تعلیم بھی آخر وقت تک رہے، ان کی یادوں کی قدیل نہ صرف ندوہ کے سلیمانیہ ہاسٹل میں فروزاں ہے بلکہ اس کے درودیوار میں ان کا وہ سوزدروں پنہاں ہے جو وہ اس کے لئے رکھتے تھے، بھوپال چھوڑنے کے بعد ان کی دلی خواہش تھی کہ وہ اپنی آخری زندگی ندوہ کے عشرت کدہ میں گزاریں، مگر مصلحتِ خداوندی سے یہ ممکن نہ ہو سکا، اور وہ کراچی گئے تو وہیں سپردِ خاک ہوئے۔

دارالمصنفین اور ندوہ کی دلچسپیوں کے ساتھ وہ ملک کی علمی و ادبی سرگرمیوں سے بھی برابر وابستہ رہے، انجمن ترقیِ اردو، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی، ہندوستانی اکیڈمی، اور کل ہند تاریخی کانگریس کی علمی و ادبی مجلسوں کی صدارت بھی کی، اور ان میں جو خطبات دیئے وہ نظر و فکر کے لئے شمعِ ہدایت ہیں، پھر اسلام کے ضمیر اور سفیر بن کر اسلام کا پیام پہنچانے کی خاطر ملک کے ہر گوشے میں پہنچے، اور اپنی تقریروں سے مسلمانوں میں وہ درد پیدا کرنے کی کوشش کی جس کی کسک ان کی تمنا کے مطابق لازوال ہو، مسلسل سفر سے وہ اکثر سخت بیمار بھی پڑ جاتے تھے، مگر اپنے ساقی سے آبِ نشاط انگیز مانگ کر اپنی زندگی

کے لئے پھر آبِ حیات کا سامان پیدا کر لیتے، بھوپال کے نواب حمید اللہ خاں کی دعوت پر وہاں اس لئے قیام کیا کہ اس ریاست کے دارالقضاء اور عربی مدارس کو اپنی نگرانی میں لے کر خالص مذہبی اور شرعی رنگ میں کر دیں۔

وہ اپنے زمانے کی سیاسی تحریکوں میں بھی کبھی کبھی حصہ لیتے رہے، خلافت تحریک میں ان کی دلچسپیاں زیادہ رہیں، وہ مولانا محمد علی جوہر کے ساتھ ایک وفد میں لندن بھی گئے، اور وہاں سے انھوں نے جو خطوط لکھے وہ ”بریدِ فرنگ“ کے نام سے شائع ہو گئے ہیں، اس سے خلافت تحریک کے علاوہ سیاست اور بین الاقوامی سیاست میں ان کی گہری نظر کا اندازہ ہوگا، وہ خلافت کانفرنسوں کے مختلف اجلاسوں کی صدارت بھی کرتے رہے، کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی ہوئے، جمعیت العلماء کے اجلاسوں کی بھی صدارت کی، فلسطین کانفرنس کے بھی صدر ہوئے، سیاست میں ان کے مسلک کا اندازہ اس لطیفے سے ہوگا کہ ایک بار پٹنہ میں ڈاکٹر سید محمود نے ہندوستانی کمیٹی کا جلسہ کیا، تو اس میں سید صاحب اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی مدعو کئے گئے، جاڑے کا زمانہ تھا، سید صاحب گرم شروانی پہنے ہوئے تھے، اور اسی کی کشتی نما ٹوپی بھی سر پر تھی، جو اس زمانے میں گاندھی ٹوپی کہلاتی تھی، اس کے اوپر عمامہ باندھے ہوئے تھے، مغرب کی نماز کے لئے جلسہ ملتوی کیا گیا تو سید صاحب وضو کرنے لگے، عمامہ اتارا، ان کی ٹوپی دیکھ کر مولانا ابوالکلام آزاد نے ان کو مخاطب کر کے تفریحاً کہا کہ اچھا مولانا آپ نے مذہب اور قومیت دونوں کو ساتھ جمع کر رکھا ہے، سید صاحب نے برجستہ جواب دیا، مگر مذہب اوپر ہے، اور قومیت نیچے ہے، ان کی سیاست بھی اس نہج کی تھی، جس سیاست سے مذہبی بیگانگی پیدا ہونے کا خطرہ رہا، اس سے وہ دور رہے، سیرۃ النبی کے مصنف کی حیثیت سے کبھی اس کے قائل نہیں ہو سکتے تھے کہ خدا اور قیصر الگ الگ ہیں، اس لیے دونوں کے حقوق الگ الگ ادا کئے جائیں، اس برصغیر میں پاکستان کی تحریک کا زمانہ بڑا ہنگامہ خیز اور خون ریز رہا، حضرت سید صاحب نے اس میں عملی حصہ تو نہیں لیا، لیکن ان کا دل دھڑکتا رہا کہ اس انقلاب کے بعد معلوم نہیں اس

برصغیر کے مسلمانوں کی زندگی کا نہج کیا ہو، ان کی خواہش تھی کہ پاکستان بننے سے پہلے اسلامی سیاسیات اور اسلامی اقتصادیات کا خالص اسلامی حل مسلمانوں کے سامنے رکھا جائے، اور اس کے قبول و عمل کی دعوت دی جائے، جس سے اسلام کی نشاۃ ثانیہ ہو، اور مسلمان مسلمان بن کر دنیا میں ظاہر ہوں، وہ اپنی دور رس نگاہوں کی بدولت اس رائے پر اس وقت بھی پہنچ گئے تھے کہ اس قسم کا اسلامی حل سامنے رکھے بغیر کسی گوشہ میں مسلمانوں کی ایک سلطنت کا اضافہ ہو گیا تو ضروری نہیں کہ اس سے اسلام کا پیام زندہ ہو جائے اور مسلمان پھر مسلمان بن جائیں، زیادہ سے زیادہ جو خوش کن خواب نظر آ سکتا ہے، وہ یہ کہ ہم کو ایک اور طویل و عریض عراق، شام یا مصر مل جائے گا، مگر اس سے اسلام کی بے کسی اور غربت میں کچھ کمی نہیں آ سکتی ہے، اسی کے ساتھ تقسیم ہند کے بعد ان کو ان صوبوں کے مسلمانوں کی بھی فکر رہی جہاں وہ اقلیت میں ہیں، ان کو یہ خطرہ دکھائی دیا کہ کہیں وہ حکومت سے اپنی محکومانہ وفاداری کا اظہار کر کے اپنے علوم و فنون، زبان، طور طریق، پرسنل لاء، تمدن اور تہذیب سے بے گانہ نہ ہو جائیں، اپنی زندگی میں جن خطرات کا اظہار کیا تھا اس کا تجزیہ آج بھی پاکستان اور ہندوستان میں اچھی طرح کیا جاسکتا ہے، وہ پاکستان گئے، کیسے گئے؟ کیوں گئے؟ اور وہاں جا کر کیا کیا؟ اس کی علاحدہ المناک داستان ہے، وہ گئے، لیکن وہاں جا کر ان کی دنیا ہی بدل گئی، بقول ان کے ہندوستان بھلائے نہیں بھولا۔

آخر میں یہ کہنا ہے کہ اظہار ان کی زندگی خالصۃً علمی معلوم ہوتی ہے، اور واقعی وہ بحر العلوم اور قلمرو علم کے تاجدار تھے، مگر ایک عزیز معاصر نے اس کی طرف توجہ دلائی ہے کہ:

”مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت یہ کہنا کہ وہ ایک بہت بڑے محقق، نامور مصنف، بلند پایہ عالم اور صاحب طرز انشاء پرداز تھے، ایک عام اور معمولی پیرایہ بیان ہے، جس سے مولانا کا اصل مقام اور رتبہ متعین نہیں ہوتا، اور نہ ان کا صحیح حق ادا ہوتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی میں ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی کے ذہن و فکر اور یہاں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں خواہ طرز قدیم کا ہو

یا طرز جدید کا، نصف صدی کے اندر مذاق تصنیف و تالیف، طریق فکر و استدلال اور تہذیبی امیال و اعمال کے اعتبار سے جو عظیم الشان انقلاب ہوا ہے مولانا رحمۃ

اللہ علیہ کی شخصیت اور ان کے علمی و عملی کارناموں کو اس میں بڑا دخل ہے۔“ (۱)

یہ صحیح ہے، ان کے معاصروں میں تین بڑی قدآور شخصیتیں تھیں، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر اور علامہ محمد اقبال، اپنے زمانہ کے یہ تینوں عبقری حضرات سید صاحب کی عبقریت اور قدآوری سے متاثر رہے، مولانا ابوالکلام آزاد نے ”الہلال“ اور ”البلاغ“ میں رعد کی طرح کڑکٹی ہوئی اپنی تحریروں کے ذریعے سے مسلمانوں کو اخوت دینی، مودت ملی اور اتحاد اسلامی کا پیام دیا، وہ حضرت سید صاحب کے کچھ ایسے گرویدہ ہو گئے کہ ان کو صدیقی العزیز سے مخاطب کرتے رہے، آخر میں ”الہلال“ اور ”البلاغ“ دونوں کی ادارت ان کے سپرد کرنے کے لئے تیار ہو گئے تھے، مولانا محمد علی جوہر نے سیاست میں اپنے دل شکستہ کے ساتھ ملت کی غمخواری کر کے یہ بتایا کہ گفتار میں کردار میں اللہ کا برہان کیسے بنا جاسکتا ہے، وہ بھی اپنی سیاست میں حضرت سید صاحب کے عملی اور علمی عہدوں کے جویاں رہے، علامہ محمد اقبال اپنی شاعری میں عشق کلام اللہ اور عشق رسول اللہ کا پیام دے کر مفکر اسلام ہوئے اور نوجوانوں کو یہ سکھایا کہ اسلام کی ضیاء باری کے مقابلے میں ان کے سامنے جدید تہذیب و تمدن کی نئی روشنی نور نخب سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی، وہ ایک مسلمان کو مرد مسلمان اور مرد مومن بن کر اپنی زندگی کے کارواں کو جادہ پیما پر دیکھنا چاہتے تھے، وہ بھی اپنے تمام افکار کے ساتھ حضرت سید صاحب کے بارے شیفہ رہے، اور جب اپنے خطوط میں ان کو استاذ الکمل لکھتے ہیں یا جب ان کو جوئے شیر اسلامیہ کرد (۲) کہتے ہیں (۳) یا جب ان کو سید العلماء اور علم و فضل کا ایک ایسا دریا قرار دیتے ہیں جس سے

(۱) معارف سلیمان نمبر ص: ۱۵۷

(۲) اقبال نامہ ص: ۱۹۶ و ۱۹۷

(۳) معارف سلیمان نمبر ص: ۲۸

سیکڑوں نہریں نکلی ہیں اور ہزاروں سوکھی کھیتیاں سیراب ہوئی ہیں (۱) یا جب وہ ان سے بڑے احترام اور محبت سے مسلسل طویل خط و کتابت کرتے ہیں تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان کے اس علم، فضل، دانش، حکمت اور بصیرت کے قدرداں اور قائل تھے، جن سے ہندوستان کا اسلامی ذہن و فکر متاثر ہو رہا تھا، ان کی تحریروں کا مطالعہ غور سے کیا جائے تو ان میں مولانا ابوالکلام آزاد کی اخوت دینی، مودت ملی اور اتحاد اسلامی کا پیام بھی ہے، مولانا محمد علی جوہر کی سیاست کی ایمانی حرارت بھی ہے، اسد اللہی بھی ہے، حق گوئی اور بے باکی بھی ہے، علامہ محمد اقبالؒ کا عشق کلام اللہ اور عشق رسول اللہ بھی ہے، اور پھر ان کے مرد مسلمان اور مرد مومن کا تخیل تو ان کے یہاں اپنے سدرۃ المننتی پر ہے، وہ عملی سیاست کے میدان کارزار میں اتر کر تو مسلمانوں کے رہنما نہیں بنے، لیکن مولانا شبلی نعمانیؒ نے اسلام کی حشمت، شوکت اور سطوت کا ایک محاذ بنایا تھا، اس پر جب وہ تلوار سے زیادہ طاقت و قلم لیے اللہ کو پیارے ہوئے تو ان کے شاگرد رشید حضرت سید صاحبؒ فوراً اس محاذ پر پہنچ گئے، اور اپنے مضامین کے لشکر اور طاقتور اسلحہ سے زیادہ قوی تصانیف سے اس محاذ کو اپنی آخری زندگی تک سنبھالے رکھا، مولانا شبلی نعمانیؒ کی حدی خوانی اور رجز خوانی کو بلند تر اور تیز تر کیا۔ انہوں نے جو کتابیں لکھیں یا ادار المصنفین میں اپنی نگرانی میں اسلامی تاریخ، شعر، ادب، فلسفہ، تذکرہ اور تراجم پر جو کتابیں لکھوائیں ان میں یہی حدی خوانی اور رجز خوانی ملے گی، پھر یہ اسلامی علوم و فنون کا ایک ایسا سرچشمہ بھی ہے جس سے اس برصغیر کے اسلامی ذہن کی روشن ضمیری، خود اعتمادی، اور خود شناسی کی پوری آبیاری ہو رہی ہے، اور جب انگریزوں کے چکاچوند کر دینے والے تمدن سے مسلمان مرعوب اور مسحور ہو کر مذہب سے بے گانہ ہو رہے تھے، تو ان کی بیگانگی جہاں اور ذرائع ابلاغ سے دور ہوئی وہاں حضرت سید صاحبؒ کی تحریروں اور کتابوں سے بھی ان کی تشکیک اور بے راہ روی کا رخ مڑ گیا، اور جب ان کا تاریک ذہن منور ہوتا گیا تو وہ حضرت سید صاحبؒ کے اس درس سے متاثر ہوئے کہ قرآن

مجید کے بحر ناپیدا کنار میں غواصی کر کے اس کے آبدار موتیوں سے زندگی کو کیسے جگمگایا جاسکتا ہے، احادیث مقدسہ کو سمجھ کر وہ کیسے آیات الہی کے نگہبان ہو سکتے ہیں، فقہی مسائل کو کیسے متنازع فیہ ہونے سے بچایا جاسکتا ہے اور کلامی مباحث کا صحیح ادراک کر کے پیکر کہنہ کو قائم رکھتے ہوئے اس میں نئی روح کیسے پیدا کی جاسکتی ہے، اس سلسلے میں انہوں نے جو جوئے شیر اسلامیہ بہائی، اس میں اب تک ان کا کوئی حریف نہیں ہو سکا۔ اسی لیے علامہ محمد اقبالؒ نے ان کو اپنے ایک مکتوب میں یہ بھی لکھا تھا کہ:

”آپ قلندر ہیں، اور وہ قلندر ہیں جن کی نسبت اقبالؒ نے یہ کہا ہے:

قلندراں کہ بہ راہ تو سخت می کوشند      ز شاہ باج ستانند و خرقة می پوشند  
بہ جلوت اند و کمندے بہ مہر و مہ چچند      بہ خلوت اند و زمان و مکان در آغوشند  
دیں جہاں کہ جہاں تو جلوہا دارد      ز فرق تابہ قدم دیدہ و دل و گوشند  
بروز نرم سراپا جو پرنیاں و سریر      بروز زم خود آگاہ و تن فراموشند  
آپ اس جماعت کے پیش خیمہ ہیں، اس جماعت کا دنیا میں عنقریب پیدا ہونا  
قطعاً اور یقینی ہے۔“ (۱)

ہم کو اور آپ کو اس کا جائزہ بھی لینا ہے کہ ایسی جماعت پیدا ہوئی کہ نہیں، اور اس کے پیش خیمہ حضرت سید صاحبؒ کس حد تک تھے؟

## ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے (۱)

خاکسار کی عقیدت:

اس خاکسار سے اگر کوئی یہ پوچھے کہ تم نے اپنی زندگی میں اپنی آنکھوں سے کس انسان کو سب سے بہتر دیکھا، اور کس کو سب سے اچھا ماہر قرآنیات، سب سے اچھا ماہر حدیث، سب سے اچھا متکلم، سب سے اچھا مؤرخ، سب سے اچھا سیرت نگار اور سب سے اچھا انشا پرداز پایا تو میں یہی عرض کروں گا کہ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو۔ کسی کو حق ہے کہ اس رائے سے اختلاف کرے، لیکن اس کے بعد اس کی اور اس خاکسار کی راہیں الگ الگ ہوں گی۔

اس خاکسار نے حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی نجی، خانگی، بیرونی، علمی اور روحانی زندگی کے مختلف جلووں کو برسوں تک دیکھا ہے، ان کی تھوڑی سی بھی عکاسی کرنا اپنی کج بیانی کی بنا پر ممکن نہیں، پھر بھی لکھنے کو جی چاہتا ہے کہ ان کے چہرہ پر نظر پڑتی تو سنجیدگی و متانت کے پھول بکھرے نظر آتے، اس کی سپیدی ایسی تھی جیسے کنول کا وہ رنگ ہو جو ابھی کھلا نہیں ہے، بلکہ کھلنے والا ہے، اس کے اوپر داڑھی ایسے دکھائی دیتی جیسے کسی صناع نے ریشم کے خوبصورت، نرم اور باریک دھاگوں میں اپنی پوری صنعت گری دکھائی ہو، آنکھوں کی پلکیں کہیں کہ کسی فسق و فجور کی طرف بھولے سے بھی نہ اٹھی ہوں گی، لب

(۱) یہ مقالہ بہار اردو اکادمی، پٹنہ کے اس سیمینار میں پڑھا گیا، جو ۲۷/۳۰ دسمبر ۱۹۸۴ء میں استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی صد سالہ سالگرہ کی تقریب منانے کی لئے منعقد ہوا تھا۔

ایسے تھے جیسے کسی ناروا بات کے لئے کبھی نہ کھلے ہوں گے، پیشانی کشادہ تو نہ تھی بلکہ دیکھنے والے کہہ سکتے تھے کہ یہ حقیقت منتظر کو لباس مجاز میں دیکھنے کے لئے شاید سجدوں میں ہزار بار تڑپتی رہی ہوگی، کاندھے جھکے جھکے تھے، جیسے کسی بار کو اٹھائے ہوئے ہیں، اور اس سے ان کا جسم دب گیا ہے، ان کے ہمنشین اور ہم جلس کہتے کہ یہ بار علم کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے، ان کی انگلیاں دیکھ کر بے ساختہ یہ کہنا پڑتا کہ یہ صرف قلم پکڑنے کے لئے ہی بنائی گئی ہیں، وہ چلتے تو معلوم ہوتا کہ وزن و وقار ان کے قدموں کو چوم رہے ہیں، وہ کھانا تناول فرماتے تو لقمے اٹھاتے وقت ایسا معلوم ہوتا کہ اللہ کی دی ہوئی نعمت کے شکر گزار ہو کر یہ لقمے منہ میں ڈال رہے ہیں، کھاتے وقت کام و دہن کی ستر پوشی کا خیال رکھتے، کبر سنی پر عینک لگانے لگے تھے، عینک کی کمائی پسند کرنے میں اپنے حسن ذوق کا ثبوت دیتے، اور جب وہ آنکھوں پر لگاتے تو ان کے رخِ زیبا کی وجہ سے خود عینک میں زیبائش پیدا ہو جاتی، لباس آخر آخر وقت تک بہت ہی صاف، مطہر اور پاکیزہ زیب تن کرتے، کبھی شکن بھرے یا ملگجے کپڑے نہیں دیکھے گئے، شروانی بہت اچھی سلی ہوئی پہنتے جیسے وہ ان کے جسم پر ڈھال دی گئی ہو، شیروانی کے کپڑے ہی کی کشتی نما ٹوپی ہوتی، اس کے اوپر خود صافہ باندھتے، تو ایسا معلوم ہوتا کہ اس کی بدولت حسن، متانت اور وقار کا تاج ان کے سر پر رکھ دیا گیا ہے، پٹنہ ہی کے ایک جلسہ میں مغرب کے وقت صافہ اتار کر وضو کرنے لگے، وہاں مولانا ابوالکلام آزادؒ بھی تشریف فرماتے تھے، جب سید صاحبؒ نے صافہ اتارا تو اس کے اندر سے کشتی نما ٹوپی جو نظر آئی تو مولانا ابوالکلام آزادؒ نے دیکھ کر فرمایا: اچھا مولانا! آپ نے مذہب اور قومیت دونوں کو ساتھ جمع کر رکھا ہے، حضرت سید صاحبؒ نے برجستہ جواب دیا: مگر مذہب اوپر ہے، اور قومیت نیچے ہے، یہ سن کر مولانا ابوالکلام آزادؒ اور دوسرے لوگ ہنس پڑے، سید صاحبؒ کی سیاسی زندگی کا یہی مسلک رہا، ان کو اپنے آبائی گاؤں سے بھی بڑی محبت رہی، اس کے کوچے ان کے لئے کوچے نہ تھے، بلکہ اوراق مصور تھے، یہاں کی ہر شکل ان کو تصویر نظر آتی، چھٹیوں میں یہاں آتے اور جب

جانے لگتے تو دیکھنے والے ان کی آنکھوں کو اشکبار پاتے، ان کا آبائی گھر قدیم وضع کا بنا ہوا تھا، لیکن اس سے بڑی محبت کرتے، اس کے اندر داخل ہوتے تو ان پر وہی کیفیت طاری ہوتی جو شاہجہاں کو اپنے دہلی دروازہ سے اپنے لال قلعہ میں داخل ہونے میں ہوتی ہوگی، بچپن میں ان کے بڑے بھائی گاؤں کی عورتوں کی اصلاح کی خاطر پردے کی آڑ سے وعظ کہا کرتے، اس موقع پر وہ ان سے مولوی اسماعیل شہید کی تقویۃ الایمان بھی پڑھوایا کرتے تھے، اس کتاب کی افادیت کا اثر ان کے ذہن پر آخر وقت تک چھایا رہا، اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں کہ ”اس کو پڑھ کر جن باتوں نے جڑ پکڑ لی تھی، وہ اپنی جگہ سے ہل نہ سکیں، علم کلام کے مسائل، اشاعرہ اور معتزلہ کے نزاعات، غزالی، رازی اور ابن رشد کے دلائل یکے بعد دیگرے نگاہوں سے گزرے، لیکن حضرت مولانا اسماعیل شہید کی تلقین بہر حال اپنی جگہ قائم رہی۔“

### ابتدائی تعلیم:

دیسہ سے نکل کر اپنی ابتدائی تعلیم کے لئے پھلواری شریف کی خانقاہ کے مدرسہ میں پہونچے، اپنی آئندہ زندگی میں اس کو اس طرح یاد کرتے رہے، جیسے کوئی دلگیر نہیں، بلکہ عاشق بامراد کو چہ یار کو یاد کرتا ہے، حضرت مولانا شاہ محی الدین مرحوم کے ساتھ ان کا قیام تھا، اور زیر درس کتابوں میں شاگردی کی سعادت بھی حاصل کی، اس نسبت پر ان کو برابر فخر رہا، وہ فرماتے کہ ان کا بزرگانہ تبسم ان کی آنکھوں کے سامنے برابر رہا، یہیں شاہ سلیمان پھلواری سے منطق کے ابتدائی درس بھی پڑھے، ان کی وفات پر معارف میں جو نوحوہ کیا تو انھوں نے ان کے وعظ، نغمہ پر شور، اعتزال سے ان کی برہمی، اہل بیت سے ان کی محبت، ان کے سنجیدہ چٹکلے، ظریفانہ نکتے اور ان کی شیریں بیانی وغیرہ کا جس طرح ذکر کیا ہے اس کو پڑھ کر اس کے ناظرین ایک دلاویز افسانہ کی افسانویت اور تغزل کی موسیقیت کا لطف اٹھائیں گے، انھوں نے در بھنگہ میں کچھ دن

قیام کیا تو اسی زمانہ میں پٹنہ کے ہفتہ وار اخبار ”السنج“ (۲۱ جون و ۲۵ جولائی ۱۹۰۲ء) میں ”خاتونوں کی تعلیم“ کے عنوان سے ان کا ایک مضمون کیا شائع ہوا کہ اس سے ان کی دہلی ہوئی مضمون نگاری کی صلاحیت جو ابھری تو پھر ابھرتی چلی گئی، پھر ندوہ میں داخل ہو گئے، بہار کی محبت یوپی سوغات میں لے گئے، اس لئے اپنے نام کے ساتھ بہت دنوں تک بہاری لکھتے رہے، اور گوان کی پوری زندگی یوپی میں گزری، لیکن وہ بہار کو کبھی نہ بھولے، جب کبھی یہاں کی کوئی قابل قدر شخصیت دنیا سے رخصت ہوئی تو آنسو بہا کر اپنی سوگواری کا اظہار کیا، اسی لئے مولوی عبدالغنی صاحب دارثی، مولانا شاہ بدرالدین صاحب سجادہ نشین پھلواری، مولوی ابوالحسنات ندوی، جناب شاد عظیم آبادی، مسٹر مظہر الحق بیرسٹر، صلاح الدین خدا بخش، سر علی امام، سرفخر الدین، جناب شاہ سلیمان صاحب پھلواری، مولانا سجاد، حافظ فضل حق آزاد عظیم آبادی، شاہ محی الدین پھلواری اور مولانا عبدالرؤف دانا پوری پر جو تعزیتی تحریریں لکھی ہیں، ان کے قلم کے جواہر ریزے کہے جاسکتے ہیں۔

بہار کے نوجوان ادیبوں کے نام ان کا جو پیام ہے، اس سے کیسی دلسوزی اور بہار سے شیفنگی کا اظہار ہوتا ہے۔

### علامہ شبلی کی شاگردی:

دارالعلوم ندوہ آئے اور علامہ شبلی پران کی نظر پڑی تو ان کو علم کی موج ہوا پچپاں نظر آئی، اور ان کا دل کہہ رہا تھا کہ شاید کہ علم کی بہار آئی اور اپنے ساتھ علم کی زنجیر بھی لائی، رفتہ رفتہ مولانا شبلی پران کی نظر اس طرح پڑنے لگی جیسے افلاطون پر ارسطو کی نظر پڑی ہوگی، مولانا شبلی کی افلاطونیت سے ان کی ارسطویت کی چنگاری سلگتی رہی، یا یوں کہئے کہ ان کو ایک ساتی مل گیا، جو جلباب ظلمانی کی مے پلانے لگا، اس طرح کہ اسی کے ساتھ چراغ نور ایمانی سے ان کی خرد میں نور پیدا ہونے لگا۔

علامہ شبلیؒ کی نگاہ جو ہر شناس دیکھ رہی تھی کہ اس علم کے عالم ناسوت میں ایک طائر نظر آ رہا ہے جو کیا عجب، علم کالا ہوتی بن کر اس فضا میں جبروتی و ملکوتی بھی بن جائے، ایک جلسہ میں اپنے اس شاگرد کی ایک برجستہ تقریر سے ایسے مسحور ہوئے کہ غایت محبت میں اپنے سر سے عمامہ اتار کر شاگرد کے سر پر باندھ دیا، باندھتے وقت زبان حال سے کہہ رہے تھے کہ اس کو علم کی کلاہ مہر عالم تاب ہونا ہے اور یہ ہو کر رہی، خود حضرت سید صاحبؒ اس کے بار سے دبے رہے، اور انھوں نے اپنی شاگردی کا حق جس طرح ادا کیا وہ غزل کے تغزل سے کم نہیں رہا۔

### مضمون نگاری:

ندوہ کی طالب علمی کے زمانہ میں لاہور کے رسالہ ”محزن“ (دسمبر ۱۹۰۲ء) میں آخر وقت کے عنوان سے ایک مضمون لکھا، پھر علی گڑھ منتھلی میں مذہب (نومبر ۱۹۰۵ء) اہل اندلس کے اخلاق اور عہدے (نومبر ۱۹۰۵ء) کلیہ دمنہ (اگست ۱۹۰۶ء) طبعیات (اکتوبر ۱۹۰۶ء) کے عنوانات سے جوان کے مضامین چھپے تو پھر باب علم اور وا ہوتا گیا، مولانا شبلیؒ کی نگرانی میں ”الندوہ“ میں مضامین لکھنے شروع کئے، طرح طرح کے نئے نئے عنوانات منتخب کر کے اپنے علمی دماغ کی زرخیزی اور ذہن کی بلند پروازی کا ثبوت دیا، ان کے علاوہ اور کچھ نہ لکھتے تو ان ہی مضامین کے سبب وہ با عظمت اہل قلم کی صف میں کھڑے کئے جانے کے لائق تصور کئے جاتے، مگر اپنی زندگی میں عام مقالہ نگاروں کی طرح کبھی ان کے مجموعے شائع کرنے کی خواہش ظاہر نہیں کی، اگر وہ شائع کئے جاتے تو کئی جلدوں پر مشتمل ہوتے، اسی طرح جب مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ کچھ دنوں ”الہلال“ میں کام کیا تو اس میں بھی بہت سے مضامین ”الہلال“ کے رنگ میں لکھے، ”البلاغ“ میں بھی ان کے مضامین شائع ہوتے رہے، ان کے مجموعے بھی شائع نہیں ہوئے، حالانکہ وہ چاہتے تو یہ آسانی سے شائع ہو سکتے تھے، کیونکہ دارالمصنفین کے

قیام میں اس کے پریس کا عملہ ان ہی کے ماتحت کام کرتا رہا، مگر ان کو یہ خیال رہا کہ ان چیزوں سے بہتر چیزیں ابھی پیش کرنی ہیں، اس لئے اپنے اس ابتدائی دور کی چیزوں کی اشاعت پسند نہیں کی۔

### دارالمصنفین:

۱۹۱۵ء میں جب اپنے استاد کی وصیت کے مطابق دارالمصنفین آئے اور اس کی میز پر بیٹھے ہوئے دکھائی دیتے، تو لوگ اپنی چشم بینا سے دیکھتے کہ وہ علم و فن کے تخت طاؤس پر بٹھائے گئے ہیں، اسلام کا مینا کار اور مصرع کا رتاج ان کے سر پر رکھ دیا گیا ہے، ان کے دائیں طرف تلاش و تحقیق کے ماہی مراتب، بائیں طرف محنت و ریاضت کے عصا و علم ہیں، سامنے عالمانہ نکتہ رسی، مؤرخانہ دیدہ وری اور ناقدانہ ژرف نگاہی کی نہر بہشت بہہ رہی ہے، اور وہاں ان کی نظروں کے سامنے ایک بساط نشاط پر جلوہ افروز ہیں، اور شراب علم کا شیشہ و ساغر لئے ساری فضا میں کیفیت میخانہ پیدا کر رہے ہیں، اپنی نظر و فکر کی رنگارنگی کا چتر بھی ان کے سر پر ڈالے ہوئے ہیں، اور اپنی تحریر کے اسلوب اور انداز بیان کا کوکبہ بھی دکھا رہے ہیں۔

حضرت سید صاحبؒ اپنی میز پر سے اٹھ کر اپنے معاصروں ہم جلیسوں، ہم نشینوں اور شاگردوں کے بیچ میں آ کر بیٹھ جاتے تو معلوم ہوتا کہ طہارت، نظافت، شرافت، تمکنت، عظمت، پاکیزگی، سنجیدگی، احترام کا پیکر محسوس سامنے ہے اور فضا میں یہ آواز گونج رہی ہے کہ:

زنگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

اور یہی سارے اوصاف ان کی تحریروں اور کتابوں میں نظر آئیں گے۔

### معارف کا اجرا:

۱۹۱۶ء سے ان کی ادارت میں معارف ٹکلنا شروع ہوا، معارف میں ان کے

شذرات سے، ان کی تحریروں کے اسلوب کی بوقلمونی دکھائی دے گی، شذرات کے معنی سونے کے ٹکڑے ہیں، اور یہ واقعی شذرات ہیں، انھوں نے معلوم نہیں کس کس طرح نظر و فکر، جذبات و احساسات، علم و فن اور حکمت و معرفت کا سونا پگھلایا، ان میں کہیں دل کی دھڑکنیں ہیں، کہیں ان کے سینہ کے اندر جو کھٹک سی رہی وہ جس طرح غم منزل بنتی رہی اس کا پرتو بھی ان میں دکھائی دے گا، ان تمام چیزوں کو قلمبند کرتے وقت ان کی کوشش رہتی کہ کہیں سے انا کی بونہ آئے، وہ اپنی تحریروں کو حتی الامکان نیش خار سے آلودہ نہیں کرتے، ان کو شرافت اخلاق کے موتیوں سے جھلملاتے دیکھنا پسند کرتے، البتہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کوئی تحریر دیکھتے تو پھر اس کا جواب لکھنے میں ان کا قلم بے قابو ہو جاتا، پھر اس سے ایسی زہریلی تحریر نکل پڑتی جو بقول ان کے سات سمندر کا پانی بھی اس زہر کو ازل نہیں کر سکتا تھا، عام طور سے ان کے شذرات ان کی تحریر کے ایجاز کے اعلیٰ نمونے بھی ہیں۔

معارف میں انھوں نے شذرات کے ۱۱۹۲ اور مضامین کے ۱۹۰۰ صفحات لکھے، ان میں قرآن مجید اور حدیث، تاریخ، کلام، فقہ، ادب اور شعر و شاعری سب پر مضامین ہیں، قرآنی علوم پر جب کوئی مضمون لکھتے تو معلوم ہوتا کہ ان کے علم و فن کے شالیمار میں قرآن پاک کی آیتوں کی نہر بہشت بہہ رہی ہے، احادیث پر کوئی تحریر قلمبند کرتے تو ظاہر ہوتا کہ اس شالیمار میں حدیث کے رموز و نکات کے گلکدے دکھائی دے رہے ہیں، کلامی رنگ کی کوئی چیز لکھتے تو ان کے خیالات کے سوسن و یاسمین کھلتے نظر آتے، تاریخ کا کوئی موضوع اختیار کرتے تو تحقیق و تدقیق کے سرو شمشاد نظر افروز ہوتے، شعر و ادب پر کچھ لکھنے کی طرف مائل ہوتے تو نکتہ سنجی اور نکتہ وری کے پھول بکھرے دکھائی دیتے، معاصر مشاہیر کی موت پر نوحہ کرتے تو ان کی سوگواری اور غم ناک کی گھٹائیں چھائی دکھائی دیتیں، کسی کانفرنس کے لئے خطبہ لکھتے تو یہ ان کے نظر و فکر کا شیش محل بن جاتا۔

## حیات امام مالکؒ:

دارالمصنفین کے اشاعتی کاموں کے سلسلہ میں اپنی مختصر تصنیف ”حیات امام مالکؒ“ شائع کی، یہ ان کی اپنی طالب علم کے زمانہ کے وہ مضامین ہیں جو الٰہندوہ میں لکھے تھے، یہ ان کی کوئی باضابطہ تصنیف نہیں، بلکہ ایک نامکمل کتاب ہے، لیکن اس کی مانگ اب تک جاری ہے، اس میں امام مالکؒ سے جو اپنی عقیدت ظاہر کی ہے، اس سے بعض لوگوں کو غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی کہ وہ مالکی ہو گئے ہیں، لیکن آخر وقت تک وہ حنفی ہی رہے، یہ ان کی رواداری اور فراخ دلی تھی کہ دوسرے مسلک کے ائمہ میں جو خوبیاں تھیں ان کا اعتراف برابر کرتے رہے، ان کو امام مالکؒ سے عقیدت اس لئے ہوئی کہ وہ فقیہ مدینۃ الرسول، امام دارالہجرۃ، اور بانی اول فن حدیث تھے، اسی کے ساتھ مسلک حنفی کے علاوہ فقہ کے بقیہ تین مذاہب کے سلسلے ان ہی کی شاخیں ہیں، اسی کے ساتھ ان کو امام مالکؒ کی موطا سے بدرجہ غایت عقیدت رہی، اس لئے ان پر ایک مضمون لکھنے بیٹھے تو یہ اتنا پھیل گیا کہ پھر ایک کتاب بن گئی۔

## سیرۃ النبیؐ:

۱۹۱۸ء میں اپنے استاد مرحوم کی سیرۃ النبیؐ جلد اول مرتب کر کے ملک کے سامنے پیش کی، استاد کو آخر وقت تک اس کا غم رہا کہ اپنے حسن عقیدت کے جو پھول سینکڑوں چمن کدوں سے چن کر ان کے ہاتھ میں آئے تھے، ان کو آستانہ نبوت پر وہ خود نہیں چڑھا سکے تھے، لیکن لائق شاگرد نے اپنے استاد کی طرف سے اس کو شائع کر کے آستانہ نبوت پر استاد کی عقیدت کا گلہ ستہ چڑھایا، اور وہ خوش تھے کہ: شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

## ارض القرآن:

اس کی دوسری جلد کی اشاعت سے پہلے سید صاحب کی مشہور کتاب ”ارض القرآن“ کی پہلی جلد شائع ہوئی جو انھوں نے پونا کے قیام میں لکھی تھی، ”ارض القرآن“ کا موضوع بڑا خشک ہے، اس کے اندر جو عنوانات لکھے ہوئے ہیں، ان کو دیکھ کر ہمارے وہ ناظرین جو فسانہ آزاد اور فسانہ عجائب کے پڑھنے کے عادی ہیں ان کا ہاتھ تو اس کتاب کو چھونے کے لئے بھی تیار نہیں ہوگا، یا ایسے ناظرین جو ذرا بہتر ذوق رکھ کر مقدمہ شعر و شاعری یا سخندان فارس یا آب حیات پڑھتے ہوں، ان کی نظریں بھی اس کی طرف اٹھ کر کسی اور طرف مائل ہو جائیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں، یا ان سے اونچے ذوق رکھنے والے ناظرین اس کے اوراق کو الٹ پلٹ کر کے اس کو چھوڑ دیں تو ان سے بھی کوئی شکایت نہیں، یا وہ ناظرین جو مولانا شبلی کی تصانیف کی شیوہ بیانی اور شیریں گفتاری سے متاثر ہیں، وہ ان ہی کے شاگرد کی اس کتاب کو ایک بھاری پتھر سمجھ کر چوم کر چھوڑ دیں تو بھی ان سے کوئی گلہ نہیں، مگر جب کبھی اس کی تلاش ہوگی کہ دنیا کے مختلف زبانوں میں تحقیق کی دیدہ وری، نظر کی پہنائی، فکر کی گہرائی، اور محنت کی جگر کا دی سے کون کون سی کتابیں لکھی گئیں تو ”ارض القرآن“ کی دونوں جلدیں اس فہرست میں ضرور شامل کی جائیں گی۔

سید صاحب کو اپنی اسلامی حمیت و غیرت کی وجہ سے دکھ تھا کہ جرمن، فرانسیسی اطالوی اور انگریز مستشرقین تاریخ عرب قبل از اسلام پر محققانہ کتابیں لکھ رہے ہیں، اور غلط قسم کے نتائج اخذ کر کے لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں، مثلاً نولدکی نے یہ لکھا کہ قرآن میں جن قوموں کا ذکر ہے وہ غیر تاریخی ہیں، رابرٹسن اسمتھ اور آلکن نے عربوں کے ادعائے نسب سے انکار کیا اور بعض سبک مغز مصنفوں سے جرأت کے ساتھ یہ بھی لکھا کہ قرآن کے پہلے کا عرب قرآن کے بعد کے عرب سے ہزار درجہ بہتر تھا، سید صاحب نے اپنی ان

دونوں کتابوں میں ان مصنفوں کی تاریخی تحقیقات اور تلبیسات کا پردہ چاک کیا اور خود ان ہی کے کارخانوں سے بنے ہوئے ہتھیاروں سے ان کے حملوں کا جواب دیا۔

اس کتاب میں سید صاحب بڑی حد تک ابن قتیبہ دینوری، اور ابن جریر طبری نظر آتے ہیں، جنھوں نے تیسری صدی اور چوتھی صدی ہجری میں یہودی اور ایرانی مؤرخوں کی اسی قسم کی فتنہ پروری کا مقابلہ کیا تھا، کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھ جائیے، یہ نہیں معلوم ہوگا کہ کسی عربی مدرسہ کے سند یافتہ کی یہ لکھی ہوئی ہے، بلکہ تحقیق و تحریر دونوں کا انداز وہی ہے جو آج کل بڑی سے بڑی یونیورسٹیوں کے محققوں کا ہوتا ہے، انھوں نے اپنی اس ابتدائی تصنیف میں یہ ظاہر کر دیا تھا کہ تحقیق و تلاش میں سہل انگاری، تن آسانی اور گریز پائی، علم کے دین و مذہب میں معصیت ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ اس علمی معصیت سے وہ اپنے دامن کو برابر بجاتے رہے۔

## سیاسی دلچسپیاں:

اپنی علمی زندگی کی بے پناہ مصروفیتوں کے ساتھ ہندوستان کی ملی اور سیاسی تحریکوں میں بھی برابر حصہ لیتے رہے، جن میں ان کی ایمانی حرارت اور ملی غیرت زیادہ کارفرما رہی ہے، ہندوستان میں خلافت تحریک شروع ہوئی تو اس میں اور رہنماؤں کے ساتھ برابر کے شریک رہے، لیکن ان کی شرکت کی نوعیت یہ تھی کہ وہ اپنے قلم سے اس میں علمی اور تاریخی جلا دیتے، اور اس زمانہ میں خلافت عثمانیہ اور خلافت اور ہندوستان کے نام سے جو رسالے لکھے وہ تحقیقی اور تاریخی رنگ کے تھے، مگر اس تحریک میں بہت ہی معاون ثابت ہوئے، اور جب وفد خلافت کے ساتھ لندن گئے اور وہاں سے جو خطوط لکھے، وہ ”برید فرنگ“ کے نام سے شائع ہوئے ہیں، ان کو اب بھی کوئی پڑھے گا تو ان سے ان کی گہری سیاسی نظر، اور عمیق ملی فکر اور زمانہ کے حالات سے ان کے مضطربانہ جذبات اور بے قرارانہ احساسات کا اندازہ ہوگا۔



## سیرۃ النبیؐ جلد دوم:

وہ لندن ہی میں تھے تو ان کے استاد کی سیرۃ النبیؐ کی جلد دوم شائع ہوئی، سیرۃ النبیؐ کی پہلی جلد میں مودب شاگرد نے اپنے استاد کے مسودہ میں کسی قسم کی ترمیم کرنا پسند نہیں کیا تھا، لیکن جب یہ بار بار چھپنے لگی، تو وہ اپنے استاد کے تمام ادب و احترام کے ساتھ ہمت کر کے اس میں کہیں کہیں ترمیم و اضافہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا اہتمام کیا کہ جہاں کہیں کوئی اضافہ کیا تو اس کو ہلالین میں درج کیا۔

## سیرت عائشہ:

وہ لندن ہی میں تھے کہ ان کی کتاب ”سیرت عائشہ“ شائع ہوئی، مولانا شبلیؒ کا اصرار تھا کہ وہی یہ کتاب لکھیں، اس زمانہ میں ان کی اور مشغولیتیں تھیں، اس لئے انھوں نے استاد محترم کو اس کتاب کے لکھنے کیلئے کسی اور کا نام تجویز کیا، مولانا شبلیؒ نے ان کو یہ لکھ کر جواب دیا کہ ان کا قلم ادب شناس نہیں (مکاتیب شبلی حصہ دوم ص/۱۲۹) ان ہی سے یہ کتاب لکھنے کا اصرار کیا، یہ مولانا شبلیؒ کی بہت بڑی تحسین تھی، سید صاحب نے اپنی اس کتاب میں اپنے قلم کی اسی ادب شناسی کا ثبوت دیا ہے، پوری کتاب میں ادب و احترام بچھا ہوتا ہوا دکھائی دے گا، تمکنت قلم کو چومتی نظر آتی ہے، وقار ہر سطر میں سر تسلیم خم کئے ہوئے ہے۔

## سیرۃ النبیؐ جلد سوم:

یہ زمانہ خلافت کی تحریک اور ترک موالات کا تھا، ہندوستان کے اندر بڑا انتشار پھیلا ہوا تھا، برطانوی حکومت کی قہاری اپنی انتہا پر تھی، اسی کے ساتھ ہندو مسلمان کی محبت، یگانگت اور حب الوطنی کا سیلاب بھی رواں دواں تھا، سید صاحب سیاسی جلسوں کی صدارت کے لئے بلائے جاتے، اس کیلئے گرانقدر خطبات بھی لکھتے، لیکن

سیرۃ النبیؐ کی تدوین میں بھی مشغول رہے، ۱۹۲۴ء میں ان کی سیرۃ النبیؐ جلد سوم شائع ہوئی، اس کے کچھ صفحے تو مولانا عبدالباری ندویؒ کے لکھے ہوئے ہیں، بقیہ سید صاحبؒ کے ہیں، اس کا موضوع معجزات ہے، یہ کوئی دلاویز موضوع نہیں بلکہ خشک، مشکل اور سنگلاخ ہے، اس کے خالص مباحث میں اغلاق، اشکال اور ابہام کے پیدا ہونے کا خیال تھا، لیکن ان کو پیش کرنے میں سید صاحبؒ نے کچھ ایسا طاقتور انداز بیان اختیار کیا جس کو پڑھتے وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت تک سید صاحبؒ کی علمی معرفت اور تحقیقی نظر اپنے اوج پر پہنچ رہی تھی، ان کو قلمبند کرنے میں بھی ان کے قلم کی شگفتگی اور تحریر کی روانی ان کا پورا ساتھ دے رہی تھی، اس کا مطالعہ کرتے وقت یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ اردو زبان کو ایسا پیرایہ بیان مل رہا تھا جس سے اور دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی طرح اس میں بھی غوامض اور دقائق کو شگفتہ اور شستہ پیرایہ میں پیش کیا جاسکتا ہے، پوری کتاب میں کہیں تو متکلمانہ انداز ہے، کہیں فلسفیانہ رنگ ہے، کہیں تاریخی کوائف ہیں، کہیں منطقیانہ مباحث ہیں، لیکن شروع سے آخر تک ان کے قلم کی گلکاریاں اور تحریر کی معجز طرازیوں اپنی جگہ پر قائم رہتی ہیں اور اس کو پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جدید ذہن کو جن چیزوں کی تلاش ہے وہ سب اس کتاب کے اوراق میں مل رہی ہیں، اور خیالات کے انوار حلہ بہشتی بن کر دلوں کے اندر روحانی جلوس کی شکل میں چلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، اس کتاب کی ترتیب، واقعات کی تفتیش و تلاش اور مسائل و نظریات کی بحث و تحقیق میں جو محنت و کاوش اور دیدہ ریزی کی گئی ہے اس سے سید صاحبؒ کا علمی پایہ بہت بلند ہوا، اس میں کہیں ابن سینا، کہیں ابن رشد، کہیں ابن تیمیہ، کہیں ابن مسکویہ، کہیں مولانا رومی، کہیں شاہ ولی اللہ اور کہیں ارسطو اور افلاطون کی کتابوں کی ورق گردانی کرتے نظر آتے ہیں، لیکن اپنی ساری فکری اور نظری بحثوں کی اساس قرآن مجید اور احادیث پر رکھی ہے۔

## خطبات مدراس:

وہ ۱۹۲۵ء میں وفد حجاز کے صدر بن کر ابن سعود اور شریف حسین میں مصالحت کرانے کے لئے گئے، لیکن کامیابی نہ ہو سکی، ندوہ کے کاموں میں بھی مشغول رہے، لیکن اس سال ان کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی وہ تصنیف ہے جو ”خطبات مدراس“ کے نام سے مشہور ہے، یہ ان کے آٹھ خطبات کا مجموعہ ہے، اس وقت تک سیرۃ النبیؐ پر ان کا بڑا گہرا مطالعہ ہو چکا تھا، جس سے اس کے سارے پہلوؤں کے نہ صرف رمز شناس بلکہ عارف ہو گئے تھے، اس لئے جب ان خطبات کو لکھنے بیٹھے اور ان کو ختم کیا تو یہ کتاب ان کے مطالعہ کا عطر مجموعہ بن گئی اور شاید اس کو لکھتے وقت ان کو یہ احساس ہوا ہوگا کہ کوئی روحانی قوت بلکہ یزداتی طاقت ان سے یہ لکھوا رہی ہے، انداز بیان کے معیار کے لحاظ سے دنیا کی بہترین کتابوں کی فہرست تیار کی جائے تو اس میں یہ کتاب ضرور شامل کی جائے گی، یہ سیرۃ النبیؐ کے سلسلہ کی ہی ایک تصنیف ہے، لیکن جس انداز بیان اور انشاء پردازانہ خوبیوں کے ساتھ یہ لکھی گئی ہے، وہ اس کا امتیازی وصف ہے، اس کو پڑھتے وقت بڑے سے بڑا انشاء پرداز بھی یہ محسوس کرے گا کہ کہیں اس میں انشاء پرداز کی قوس و قزح نظر آرہی ہے، کہیں اس کی مہتابی چھٹکی ہوئی ہے، کہیں اسکی کوثر و تسنیم بہہ رہی ہے، کہیں زبان قلم کو چوم رہی ہے، کہیں زور بیان صاحبقرانی دکھا رہا ہے، کہیں نظم معری کا لطف دکھائی دے رہا ہے، ان خوبیوں کی بدولت پوری کتاب میں نبوت کا چمنستان آباد ہو گیا ہے، جس میں رسالت کے پھولوں کی روش لگی ہوئی ہے جو روح کو معطر معطر کرتی رہتی ہے۔

## سیاسی مشغولیتیں:

ان علمی کارگزاریوں کے ساتھ سیاسی مشغولیتیں بھی رہیں، مملکت میں اس سال جمعیتہ العلماء کا جو جلسہ ہوا اس کی صدارت بھی کی، اسی سال ہندو مسلمان کے تعلقات کی

نسبت دہلی میں مجلس خلافت کے خاص اجلاس میں مسلمانوں کے نقطہ نظر کو بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کیا، اس سے فراغت کے بعد وہ وفد خلافت کے ساتھ حجاز گئے، اس کے ممبر مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی اور شعیب قریشی بھی تھے، وہاں ایک موتمر ہوا تو اس کے نائب رئیس منتخب ہوئے اور صدر محترم کی غیر حاضری میں اس کی صدارت بھی کی، حجاز کے کتب خانہ کی سیر بھی کی اور معارف کے کئی نمبروں میں اس عنوان سے ایک طویل مضمون بھی لکھا، وہاں سے واپسی کے بعد مستشرقین کے خلاف قلمی جہاد میں مصروف ہوئے، عیسائی مضمون نگار ”مارگولیتھ“ سے زبردست علمی معرکہ بھی کیا، جو واقدی کی حیثیت ایک داستان گو سے زیادہ نہیں، اور اس کا شمار معتبر مؤرخین میں نہیں، تاریخ و سیر میں اس کا حوالہ دینا ایسا ہی ہے جیسا ملکہ ایلزبتھ کی سوانح میں رینا لڈس کا حوالہ دینا ہے۔

۱۹۲۷ء میں ایک یورپین اہل قلم نے لکھا تھا کہ مسلمان ارسطو کی گاڑی کے قلی تھے، اس کا ایک مدلل جواب دیا، پھر مسلمان عورتوں کے حقوق کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا جس میں یہ بتایا کہ عورتوں کے ساتھ جتنی بے انصافیاں تھیں ان سب کا خاتمہ آخری ربانی پیغام اور تکمیل دین نے کیا، اور ان کے واجبی حقوق دے کر ان کا درجہ بلند کیا۔ سفر:

اسی کے ساتھ ہندوستان کے مختلف گوشوں کا سفر بھی کرتے رہے، ۱۹۲۷ء کے وسط اپریل میں انجمن حمایت اسلام لاہور کی دعوت پر عہد رسالت میں اشاعت اسلام پر تقریر کی، پھر مجلس العلماء کی صدارت کے لئے ترچنا پل تشریف لے گئے، پھر ندوہ کا ایک اجلاس بھاو پور میں ہوا تو نواب صاحب بھاو پور سے پندرہ ہزار کی رقم منظور کرائی، جمعیتہ العلماء کے ایک جلسہ کی صدارت کے لئے پشاور بھی گئے، پھر حیرت ہوتی ہے کہ ریل کی پیہم مسافرت کے باوجود ان کے قلم کا مسافر بھی برابر رواں دواں رہا، معارف میں ان کی قلمی

سرگرمیاں جاری رہیں، سیرۃ النبیؐ کی تدوین کا سلسلہ بھی قائم رہا، پھر ملی کاموں میں اپنے قلم کے ذریعہ سے اپنی ملی حمیت کو بھی بروئے کار لاتے رہے۔

ساردو ایکٹ:

۱۹۲۸-۲۹ء میں ساردو ایکٹ کے خلاف سخت علمی جنگ کی، اور اپنے مضامین سے برابر یہ ظاہر کرتے رہے کہ کسی غیر اسلامی حکومت کو مسلمانوں کے نکاح و طلاق کے سلسلہ میں قانون بنانے کا حق نہیں، اور یہ صدا شاید پہلی بار اٹھائی کہ اگر آسمان کو دیکھ کر موسم کے انقلاب کی پیشین گوئی کی جاسکتی ہے تو موجودہ حالات کو دیکھ کر مجھ کو یقین ہے کہ اگر مسلمانوں نے اپنے مذہبی حقوق کی اوٹونومی کی تدبیر نہیں کی تو ان کی ممتاز ہستی اس ملک میں باقی نہیں رہ سکتی۔

عرب و ہند کے تعلقات:

۱۹۲۹ء کے مارچ میں ہندوستانی اکیڈمی کی دعوت پر الہ آباد جا کر عرب و ہند کے تعلقات پر لکچر دئے، جن میں ہندو مسلمان دونوں کو وہ زریں عہد یاد دلایا جو دونوں کو بین الاقوامی اور دوسرے گونا گوں تعلقات کے رشتہ میں جکڑے ہوئے تھے، اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ہندوستان اور عرب کے درمیان تجارتی تعلقات کا دجلہ، علمی تعلقات کا فرات اور مذہبی تعلقات کی گنگا جمن کس طرح بہتی تھی، یہ کتاب ہندو مسلمان کے خوشگوار تعلقات پیدا کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ ہے، انگریزوں نے جو یہ سبق پڑھایا ہے کہ مسلمان ہندوؤں کو کافر سمجھتے تھے، ان کو تلوار کے زور سے مسلمان بناتے تھے، ان سے جزیہ وصول کرتے تھے، ان کی عبادت گاہوں کو منہدم کرتے تھے، اس زہر کا تریاق اس کتاب میں ہوگا اور خدا جانے اس کے سہارے سے کتنی اور کتابیں تیار ہو گئیں۔

عربوں کی جہاز رانی:

حضرت سید صاحب وقت اور قلم دونوں کے اہل حق پر اس طرح سوار رہے کہ کبھی ان کو وقت کی کمی اور قلم کی سستی کی شکایت نہیں ہوئی، وقت اور قلم دونوں ان کے قابو میں

رہے، عرب و ہند کے تعلقات کی ترتیب کے دو سال کے بعد ان کی کتاب عربوں کی جہاز رانی شائع ہوئی، یہ مسمیٰ کے شعبہ تعلیم کی سرپرستی میں جو چار خطبے دئے گئے ان ہی کا مجموعہ ہے، اس میں پہلے لغات عرب اور کلام مجید سے عربوں کی بحری واقفیت اور ان کی جہاز رانی کا ثبوت دیا گیا ہے، اسلام کے شروع دور کے علاوہ بنو امیہ، بنو عباس، فاطمیین مصر اور بنی امیہ اندلس کے علاوہ افریقہ کے سواحل یعنی بحر روم کے جزائر، اس کے ساحلی ملکوں، سسلی، اسپین، مصر اور شمالی افریقہ میں عربوں کی جہاز رانی اور ان کے کارناموں کا ذکر ہے، اسی کے ساتھ بحر پیائی اور فن جہاز رانی میں عربوں کی علمی سرگرمیوں، ان کے ایجادات و اکتشافات، سمندروں کے بارہ میں ان کے علم، ان کی پیمائش، ان کی کتابوں میں بحری نقشوں، لائٹ ہاؤس، میل کے نشانات، جہاز رانوں کے رہنما ستاروں، سمندری ہواؤں کی کیفیت، قطب نما کی ایجاد ترقی، ان کے ایجاد کردہ فلکی آلات، جہاز رانی کے کارخانوں، مصنوعی بحری لڑائیوں، ڈوبے ہوئے جہازوں کے نکالنے، جہاز کے ساز و سامان کی پوری تفصیلات وغیرہ اس کتاب میں پڑھی جاسکتی ہیں، جہاز رانی کے سلسلہ میں عربوں نے جو چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے ہیں ان کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔

### قلمی جہاد:

ان تصنیفی سرگرمیوں کے ساتھ معارف میں مضامین کے ذریعہ ان کا قلمی جہاد بھی رہا، انگریزی اخبار اسٹیمین میں واقعہ کر بلا پر ایک نہایت قابل اعتراض مضمون نکالا تو سید صاحب نے اس کے خلاف احتجاج کیا، پنجاب یونیورسٹی کے نصاب میں ڈاکٹر وائل کی کتاب ”تاریخ اقوام اسلامیہ“ اور ڈاکٹر نکلسن کی ”تاریخ ادبیات عربی“ داخل ہوئی تو انہوں نے وہاں کے ارباب علم کو اس کی طرف توجہ دلائی، ان دونوں کتابوں میں اسلام، پیغمبر اسلام اور صحابہ کرامؓ کے متعلق نہایت گمراہ کن نظریات اور لغو اعتراضات ہیں، جن کو ایک مسلمان سننا بھی گوارا نہیں کرتا، اس احتجاج پر یہ کتاب پنجاب یونیورسٹی نے نکال دی گئی،

اسی طرح جب رسالہ نگار، لکھنؤ نے مذہب پر دلائل مضامین لکھے تو اس کے خلاف بھی آواز بلندی، جس کے بعد ایڈیٹر نگار کو توبہ نامہ لکھنا پڑا۔

### سیرۃ النبیؐ جلد چہارم:

۱۹۳۲ء میں ان کی کتاب سیرۃ النبیؐ جلد چہارم شائع ہوئی، یہ آٹھ سو اٹھاسی صفحات پر مشتمل ہے، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ سید صاحبؒ کے قلم کی تیز روی اور سبک خرامی کسی طور پر کم ہوتی نظر نہیں آتی تھی، اس وقت ان کی عمر ۵۲ سال ہو چکی تھی، لیکن قلم پہلے سے زیادہ جوان اور رعنا ہو گیا تھا، اس لئے کہ:

عشق ہم را ہست وہم خود منزل است

اس عشق میں منزل تک پہنچنے میں اپنی ساری عمر گزاری، اس کے ٹائٹل پر تو یہ لکھا ہے کہ یہ منصب نبوت پر مشتمل ہے، لیکن اس میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت دنیا اور عرب کی مذہبی و اخلاقی حالت، تبلیغ نبوت کے اصول اور اس کی کامیابی کے اسباب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبرانہ کام کی تفصیل بتائی گئی ہے، اور ان کے بعد اسلام کے عقائد یعنی ایمان کے مختلف پہلو، برزخ، قیامت، جزاء، سزا، دوزخ، جنت، قضا، قدر پر مباحث ہیں، یہ مباحث بڑے نازک ہیں، اس خازن سے گذرنا آسان نہیں، لیکن ان کے لکھنے میں سید صاحبؒ نے اپنی محتاط طبیعت کی وجہ سے کسی خاص فرقہ کی ترجمانی نہیں کی ہے، بلکہ اس کے لکھنے میں ہر موقع پر قرآن پاک سے استناد کو سب سے آگے رکھا ہے، احادیث صحیحہ سے پورا فائدہ اٹھایا ہے، مناظرانہ پہلو سے احتراز کیا ہے، اور پھر اسلام کا موازنہ دوسرے مذاہب سے اس غرض سے کیا ہے کہ اسلام کی تکمیلی شان نمایاں ہو، یہ سارے مباحث بالکل نئے نہ تھے، لیکن سید صاحبؒ نے ان کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے بیسویں صدی کا ذہن جس زبان، اسلوب اور طرز ادا کا طلبگار ہے وہی پیرایہ اختیار کر کے اس کو مطمئن کیا۔

### مقالات و مضامین:

سیرۃ النبیؐ کی تدوین کے ساتھ ان کی اور قلمی سرگرمیاں بھی جاری ہیں، مارچ ۱۹۳۳ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی انجمن اردوئے معلّیٰ کی دعوت پر ہندوستان میں ہندوستانی پر ایک خطبہ دیا، جس میں تاریخی حوالوں سے بتایا کہ اردو کا نام دراصل ہندوستانی تھا، انگریزوں کے آنے سے بہت پہلے دسویں صدی میں یہ زبان اسی نام سے پکاری جاتی تھی، اس لئے اگر اردو کے بجائے ہندوستانی نام رکھا جائے تو بہت سے لسانی قضیے دور ہو جائیں، پھر وہیں طبیبہ کالج کے ہال میں، ”اسلامی طب کی تاریخ“ پر ایک تقریر کی، پھر اپریل ۱۹۳۳ء میں ادارہ معارف اسلامیہ لاہور کے پہلے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لئے لاہور تشریف لے گئے، اس کی صدارت ڈاکٹر اقبال نے کی، اس میں انھوں نے اپنا ایک مقالہ پیش کیا، جس کا عنوان، ”لاہور کا ایک مہندس خاندان جس نے لال قلعہ اور تاج محل بنایا“ تھا، اس میں مستند شہادتوں سے یہ ثابت کیا کہ تاج محل اور لال قلعہ کے معمار، درحقیقت استاد احمد معمار شاہجانی لاہور ہے، جو ہندسہ، ہیئت اور ریاضیات کا بہت بڑا عالم تھا، اس انکشاف کے بعد اور تمام دعوے جو تاج محل کے کاریگروں اور معماروں سے متعلق مشہور تھے، بے سرو پا ہو کر رہ گئے۔

### جنوبی ہند کا سفر:

۱۹۳۳ء میں جنوبی ہند میں سیرۃ النبیؐ پر مختلف تقریریں کیں، اور اسی سال نظام حیدر آباد کی حکومت کے لئے ضابطہ جنایات قتل و قصاص کی ترتیب دی، ان چیزوں کے ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ سید صاحبؒ کے ذوق کی جامعیت اور کاملیت کا اندازہ ہو، ان میں کیسی رنگارنگی اور بولمونی تھی۔

### خیام:

اسی سال ان کی مشہور و معروف تصنیف ”خیام“ شائع ہوئی، اس کتاب کی ترتیب میں انھوں نے سنین کی تحقیق اور تطبیق، واقعات کی تلاش و تفتیش، ماخذوں اور سندوں کے

حوالوں اور خیام کی فلسفیانہ تصانیف کی جستجو میں جو فکر اور کاوش کی ہے وہ ایک اہم علمی کارنامہ ہے، اس کتاب کی اشاعت سے اہل یورپ کے اس خیال کی بالکل تردید ہوگئی کہ خیام ایک عیاش، بدمست، رندلا ابالی شاعر تھا، جو ہمہ تن شاد و شراب میں غرق رہتا تھا اور جس کے لئے زندگی رندی و عیش پرستی کے سوا کچھ نہ تھی، اس کتاب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ وہ اپنے زمانہ کا ایک بڑا فلسفی، ہیئت و نجوم و ریاضیات کا بہت بڑا عالم اور فلسفی قسم کا صوفی تھا، مذہبی حیثیت سے ایک دیندار مسلمان تھا، اور مذہبی علوم میں پوری دستگاہ رکھتا تھا، اس کی زندگی زہدانہ تھی، اس کتاب کی اشاعت کے بعد اہل نظر نے یہ تسلیم کیا کہ اس میں جو کچھ لکھ دیا گیا اس پر کوئی مشرقی یا مغربی عالم اضافہ نہ کر سکے گا۔

### سفر افغانستان:

اسی سال وہ نادر شاہ افغانستان کی طرف سے ایک علمی و تعلیمی دعوت پر ڈاکٹر علامہ محمد اقبال (اور) سر اس مسعود وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کے ساتھ افغانستان گئے، اور وہاں کے تراجم اور تالیف کے اداہ کو وسیع کرنے کے سلسلہ میں مفید مشورے دئے، اس سفر میں علامہ محمد اقبال اور حضرت سید صاحب ایک دوسرے سے جس طرح متاثر ہوئے وہ اس برصغیر کی علمی اور دینی تاریخ کا بہت ہی رومانی اور دلکش باب ہے۔

اس سفر کے سلسلہ میں سید صاحب نے ”سفر نامہ افغانستان“ بھی مرتب کیا، جو علمی، ادبی، تاریخی اور معلوماتی لحاظ سے ایک مستقل تصنیف بن گیا، اس میں وہ ابن بطوطہ کے ساتھ ابوزید سیرانی بھی نظر آتے ہیں۔

### متفرق علمی سرگرمیاں:

سید صاحب سفر کے بعد دارالمصنفین کے گوشہ عافیت میں آکر تصنیف و تالیف میں لگ جاتے، لیکن پورے ہندوستان کی نظریں ان کی طرف اٹھی رہتیں، اور ان کو اپنے یہاں مدعو کر کے اپنی عزت میں لوگ اضافہ کرتے، فروری ۱۹۳۴ء میں جامعہ ملیہ میں ڈاکٹر بہجت وہبی

توسیع خطبات دینے کے لئے آئے تو ان کے دو خطبوں کے جلسوں کی صدارت سید صاحب نے ہی کی، پھر جون ۱۹۳۴ء میں صوبہ بہار کے وزیر تعلیم جناب سید عبدالعزیز کی دعوت پر عربی مدارس کے نصاب کی ترتیب کے لئے رانچی تشریف لے گئے، اسی سال دسمبر ۱۹۳۴ء میں معارف میں یہ تجویز پیش کی کہ مسلمانوں نے ہندوستان کو جو سیاسی، قومی، علمی، تمدنی حیثیت سے ترقی دی ہے، اس کی مفصل تاریخ لکھی جائے، اور اس کی پندرہ جلدوں کا خاکہ پیش کیا، اور یہ کام دارالمصنفین میں شروع کر دیا، جنوری ۱۹۳۵ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کی دعوت پر اس کی طوائی جوہلی میں شریک ہوئے تو وہاں ڈاکٹر اقبال کے ساتھ مل کر ایک زنانہ جامعہ کا خاکہ تیار کیا، پھر اسی سال حیدرآباد کے ضابطہ فوجداری پر نظر ثانی کیلئے اس کی ایک کمیٹی کی پوری مدد کی۔

### سیرۃ النبی جلد پنجم:

اپنی ان تمام مشغولیتوں اور سرگرمیوں کے باوجود اسی سال ۱۹۳۴ء میں سیرۃ النبی جلد پنجم شائع کرائی، اس کا موضوع عبادات ہے، یعنی اسلام میں عبادت کی حقیقت کیا ہے اور اس کے اقسام کتنے ہیں، اور ان میں کیا مصلحت و حکمت رکھی گئی ہے، ان ہی چیزوں کی تشریح اس جلد میں کئی گئی ہے، ان میں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے ابواب بھی ہیں، یہ موضوعات بھی نئے نہیں ہیں، لیکن ان موضوعات پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا اندازہ کچھ ایسا نیا ہے کہ اس میں سید صاحب مفسر، محدث، فقیہ اور متکلم سب کچھ نظر آتے ہیں، کلام پاک کی چھوٹی سی چھوٹی آیتوں کا بھی ذکر کرتے ہیں، تو وہ ان کی تحریروں میں موتی کی طرح جڑی دکھائی دیتی ہیں اور جب لمبی آیتیں نقل کرتے ہیں تو وہ اپنی تحریروں کو موتیوں کا کوئی ہار پہناتے نظر آتے ہیں، وہ جب مفسر بن کر اس کی تشریح دلنواز طریقہ پر کرتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ تفسیر میں اردو زبان کا خوان نعمت بچھا رہے ہیں، اسی طرح احادیث کا ذکر کر کے ان پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ اب تک محدثوں کے جو خیالات اور جذبات دبے ہوئے تھے ان کی تحریروں میں ابھر رہے ہیں، ان موضوعات پر فقہاء میں بڑا اختلاف رہا ہے، ان دشوار گزار

راہوں کو بھی سید صاحب نے جس طرح طے کیا ہے اور اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے اس سے بڑے بڑے متقشف فقہاء کو بھی اختلاف نہیں ہوا ہے، اور ان کے لکھنے میں جو کلامی رنگ پیدا کر دیا ہے، اس سے بڑا سے بڑا متکلم بھی لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

### اردو ہندی کا جھگڑا:

اکتوبر ۱۹۳۵ء میں ہندی کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا تو اس کے روز افزوں جھگڑوں سے ان کو بہت دکھ پہونچا، معارف کے شذرات کے ذریعہ سے ان دردمندانہ خیالات کا اظہار کیا کہ ہندی اردو دونوں کے لئے الگ الگ ترقی کی راہیں کھلی رہنا چاہئیں، نہ اردو ہندی کو مٹا سکتی ہے، نہ ہندی اردو کو، دونوں اپنی اپنی راہ چلتی رہیں گی، انھوں نے یہی خیالات علی گڑھ میں آل انڈیا کانفرنس میں ظاہر کئے جو اکتوبر ۱۹۳۶ء میں ہوئی، اسی زمانہ میں یہودیوں اور انگریزوں کی سازش سے فلسطین کا جو نقشہ بننے کا تھا، اس سے ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی بڑا سیاسی ابال اور مذہبی جوش پیدا ہوا، سید صاحب نے بھی فلسطین کے مسئلہ میں اپنی آواز بلند کی اور مولانا شوکت علیؒ اور مفتی کفایت اللہؒ کے اصرار پر ۱۹۳۶ء کی آل انڈیا فلسطین کانفرنس کی صدارت کی، اس میں ان کا خطبہ نہ صرف سیاسی تھا، بلکہ علمی تاریخی اور مذہبی رنگ بھی لئے تھا، جس کی وجہ سے یہ پورے عالم اسلام میں مشہور ہوا۔

جنوری ۱۹۳۷ء میں لکھنؤ کی نمائش گاہ میں ہندوستانی اکیڈمی کی ایک کانفرنس ہوئی، اس اکیڈمی کا مقصد ہندوستان کو ادب کی راہ سے ایک کرنا تھا، اسی لئے اس نے اردو اور ہندی کے نام کے بجائے اپنا نام ہندوستانی اکیڈمی رکھا تھا، مگر اس کانفرنس میں اردو اور ہندی کے دو خیامی علیحدہ علیحدہ کردئے گئے، ایک کے ادیب نے دوسرے کی صورت تک نہ دیکھی، اس سے سید صاحب کو بڑا دکھ ہوا، اسی وقت ان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید ہندو مسلمانوں کے دل ایک دوسرے سے جدا ہو رہے ہیں، اور اس کا اظہار انھوں نے فروری ۱۹۳۷ء کے معارف میں بھی کیا، مارچ ۱۹۳۷ء میں مسلم ایجوکیشنل کیطلائی جو بلی علی گڑھ میں

ہوئی تو اس کے شعبہ علوم و فنون اسلامی کی صدارت کی، اس میں خطبہ صدارت کے لئے اپنا ایک مقالہ ”عرب و امریکہ“ کے عنوان سے پیش کیا، اور اس میں یہ دکھایا کہ کولمبس سے پہلے عرب جہاز ران امریکہ پہونچ چکے تھے، کیونکہ ان کو زمین کی گولائی اور اس کے تحتانی و فوقانی حصوں کا علم تھا، اسی لئے ماورائے ظلمت کی تہہ تک پہونچنے کی انھوں نے کوشش کی، ۱۹۳۸ء میں سی۔ پی میں ودیا مندر کے نام سے جبری تعلیم شروع ہوئی تو اس میں اردو پڑھانے کا کوئی انتظام نہیں تھا، اس سے مسلمانوں میں ہیجان پیدا ہوا تو سید صاحب نے بھی اس کے خلاف احتجاج کیا، اور معارف کے ذریعہ یہ اعلان کیا کہ مخالفت اور دشمنی کی اسپرٹ سے نہیں بلکہ اپنے صحیح حق کو حاصل کرنے اور ملک میں اپنی پوزیشن کو باقی رکھنے کے لئے اردو زبان سے قطع نظر کرنا ہمارے لئے قطعاً محال ہے۔

### سیرۃ النبیؐ جلد ششم:

۱۹۳۹ء میں ان کی سیرۃ النبیؐ کی چھٹی جلد شائع ہوئی، جس کی ضخامت ۸۸۸ صفحے ہے، اس وقت تک سید صاحب کی عمر پچپن سال کی ہو چکی تھی، مگر اس کتاب کی ضخامت، اس کے اندر قلم کی روانی، تحریر کی شگفتگی اور مسائل کے نکتہ ورائہ اور دیدہ ورائہ مباحث سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تصنیفی زندگی میں کہولت کے بجائے پہلے کی طرح رعنائی اور دلاویزی قائم اور برقرار تھی، انداز تحریر یہ بتاتا ہے کہ پہلے ہی کی طرح زبان کا تلاطم اور تموج باقی تھا، اور پھر اس تلاطم و تموج کے اندر سے ادب و نشاء کے درہائے شہسوار سطح پر آکر رونے نظر آتے، طرز ادا میں فکر کی گہرائی کے ساتھ گیرائی بھی ہے، قلم میں متانت اور سنجیدگی پہلے سے اور بھی زیادہ بڑھی ہوئی دکھائی دیتی ہے، اس جلد میں اسلام میں اخلاق کی اہمیت بتائی گئی ہے اس پر زور دیا گیا ہے کہ تعلیم محمدی ﷺ نے اخلاق کی اہمیت کو عبادات سے زیادہ بڑھا دیا ہے، اس کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ جو بھی بات کہی گئی ہے اس کی تائید کے لئے قرآن کی آیتیں اور حدیثیں پیش کر دی گئی ہیں، اور وہ اس لئے خشک نہیں ہونے

پائی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی کے واقعات اس کے ساتھ اس طرح پیش کر دئے گئے ہیں کہ شروع سے آخر تک کتاب پڑھتے وقت یہ نہیں محسوس ہوتا ہے کہ ہم پند و موعظت کی کوئی کتاب پڑھ رہے ہیں، بلکہ لذیذ حکایتوں کی ایک کتاب سے لذت آشنا ہو رہے ہیں، یہ نہ صرف مسلمانوں کے خیر امت ہونے کے لئے ایک دستور حیات ہے، بلکہ اسلام کا رب، رب العالمین ہے، رب المسلمین ہی، نہیں اور اس کے رسول بھی رحمۃ المسلمین ہونے کے بجائے رحمۃ اللعالمین ہیں، اس لئے مسلمانوں کے رب سے جو تعلیمات ملی ہیں، وہ انسانیت کا پیام رحمت اور انسانوں کے لئے نصاب زندگی ہیں اور ان ہی کو حاصل کر کے دنیا کی زندگی کے موتی، ہیرے اور لعل، سیرت کے یا قوت اور عقیق، کردار کے نیلم اور پکھراج اور لا جو رد سے جگمگائی جاسکتی ہے۔

### سیرۃ النبیؐ جلد ہفتم:

سیرۃ النبیؐ جلد ششم کی اشاعت کے بعد سید صاحب کا یہ سلسلۃ الذہب یہیں آ کر ختم ہو جاتا ہے، آگے چل کر ان کے نام سے جلد ہفتم بھی شائع ہوئی، مگر وہ ان کی ایک نامکمل اور ادھوری تصنیف ہے، وہ اپنی جلد ششم کے بعد اسلام میں معاملات اور سیاسیات کی جو تعلیمات دی گئی ہیں، ان پر وہ ایک مستقل جلد لکھنا چاہتے تھے، لیکن ان کی نجی اور علمی زندگی میں بعض اسباب کی بنا پر کچھ ایسا انتشار پیدا ہو گیا کہ وہ اس کو مکمل نہ کر سکے، جو چند ابواب لکھے ہیں، ان ہی کو جمع کر کے شائع کر دیا گیا ہے، اس میں پہلے تو معاملات کے عنوان سے ایک مقدمہ ہے، پھر یہ عنوانات ہیں: (۱) اسلام میں حکومت کی اہمیت اور حیثیت (۲) عہد نبویؐ میں نظام حکومت (۳) سلطنت اور دین کا تعلق اور امت مسلمہ کی بعثت (۴) قوت عاملہ یا قوت آملہ (۵) حاکم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے، ان چند ابواب سے سید صاحبؒ کے اسلامی سیاست کے افکار کا اندازہ ہو جاتا ہے، سیاست کی اسلامی روح کو جس پر زور موثر اور خوبصورت انداز میں قلم بند کیا ہے وہ موجودہ دور کے مسلم حکمرانوں کے لئے مشعل ہدایت ہے، لکھتے ہیں:

”اصل یہ ہے سیاسی مفکرین کی نظریں حکومت کے ظاہری اشکال کے گورکھ دھندوں میں الجھ کر رہ گئی ہیں، اور اسلام کی نظر اس کی حقیقت پر ہے، اس کے نزدیک حکومت کی ظاہری شکل، یعنی انتخاب کا طریقہ، ارباب شوریٰ کی ترتیب و تعین، ان کے فرائض و حقوق، ان کے انتخاب، اظہار رائے کے طریقے، اور دیگر متعلقہ مسائل اہمیت کے قابل نہیں، اصل چیز حکومت کے امیر و رئیس اور اس کے ارکان و عمال کا تقویٰ ہے۔“

سید صاحبؒ کی علمی زندگی کا اصلی رأس المال یہی سیرۃ النبیؐ کی جلدیں ہیں، ہمیں یہ لکھنے میں تاثر نہیں کہ ان میں وہ ابن اسحاق اور ابن ہشام سے بہت آگے ہیں، ان سیرت نگاروں نے زیادہ تر مغازی اور شمال نبویؐ پر زور دیا ہے، حضرت سید صاحبؒ اپنی پانچوں جلدوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو جس انداز میں پیش کیا ہے وہ سیرۃ النبیؐ کے لئے ایک بالکل نئی چیز تھی، ایسے مباحث کسی اور سیرۃ النبیؐ میں نہیں قلمبند کئے گئے، ان میں جب کبھی وہ قرآن مجید کی آیتوں کے رموز و نکات بیان کرتے ہیں تو ان میں امام رازی اور امام ابن تیمیہ کی روح حلول کر جاتی ہے، اور کبھی ان کی بعض گتھیوں کے سلجھانے میں شاہ ولی اللہ کی نگاہ ان میں پیدا ہو جاتی ہے اور کبھی حدیث کی روایت و درایت کے پرکھنے میں ان کے سامنے ابن حجر عسقلانی نمودار ہو جاتے ہیں، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تفسیر کبیر، تفسیر ابن جریر، تفسیر طبری اور تفسیر زخشری کا وہ ذکر کرتے ہیں، لیکن ان کی حیثیت ماخذ کی نہیں بلکہ زیر مطالعہ کی رہتی ہے اور وہ قرآن پاک کے معانی و مطالب کے سمجھنے میں اپنے ہی ادراک و بصیرت پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں جن کی روشنی ان کے قلم میں منتقل ہو کر کاغذ کے صفحات پر پھیل جاتی ہے۔

ان ہی کارناموں کی بدولت انھوں نے جوئے شیر اسلامیہ کے فرہاد کا لقب حاصل کیا، مگر اس لقب کے ساتھ انھوں نے ان جلدوں کے ذریعہ سے ان میں اپنی انشاء پرداز کا جو قصہ شیریں تعمیر کیا ہے، وہ ان کا دوسرا اہم کارنامہ ہے، ان میں جو انداز بیان

ہے وہ دنیا کے کسی عظیم ترین مصنف کے اسلوب کے مقابلہ میں رکھا جاسکتا ہے، کسی حسین صبح، کسی رنگین شام یا کسی غمیں رات یا کسی گلشن کے گل و سرو و صنوبر کی منظر نگاری یا بلبل کی نغمہ سرائی، سبزہ زاروں کی لہلہا ہٹ، دریا کی موجوں کی روانی، ایک عاشق نامراد کی تپش دل اور درد جگر یا کسی عیش کی محفل میں پروانوں کے ماتم کی مرقع آرائی کرنے میں قلم خوب رہبری کرتا ہے، مگر مفسر یا محدث یا فقیہ یا متکلم بن کر انشاء پر دازی کا جو ہر دکھانا، یا نثر نگاری کی رنگارنگی کا اظہار کرنا تلوار کی دھار پر چلنا ہے، سید صاحب اسی تلوار کی دھار پر چلتے دکھائی دیتے ہیں۔

### مصنفوں کی قسمیں:

ایک بات یہ بھی عرض کرنا ہے کہ مصنفوں کی کچھ قسمیں ہوتی ہیں، عنکبوتی، نملی، نخلی، عنکبوتی تو وہ ہیں جو عنکبوت یعنی مکڑی کی طرح اپنی تحریروں کے جالے تن کر اپنے کو مطمئن کر لیتے ہیں، نملی وہ ہیں جو اپنی تحریروں میں چیونٹیوں کی طرح ادھر ادھر سے اپنے خیالات کے ریزے جمع کر کے ایک انبار لگا دیتے ہیں۔ نخلی وہ ہیں جو شہد کی مکھیوں کی طرح اپنی تحریروں میں خیالات کا شہد جمع کر دیتے ہیں۔ سید صاحب اپنی تحریر میں محقق بھی ہیں، مفسر بھی ہیں، محدث بھی ہیں، متکلم بھی ہیں، اپنی تحریر میں عنکبوتی نظر نہیں آتے، نہ محدث و مفسر بن کر نملی دکھائی دیتے ہیں، بلکہ محدث ہوں، مفسر ہوں، متکلم ہوں، یا فقیہ ہوں، نخلی بن کر اپنے ناظرین کو یہ محسوس کراتے ہیں کہ اسلامی علوم و فنون سے رس چوس کر اپنی میٹھی تحریر کے ذریعے سے تحقیق، تفسیر، حدیث اور کلام کے شہد کا انبار ہی نہیں لگا دیتے بلکہ اس کا آبشار، جوئے بار اور رود بار بہاتے رہتے ہیں۔

### نقوشِ سلیمانی:

جس سال سیرۃ النبیؐ جلد ششم شائع ہوئی اسی سال ان کی کتاب نقوشِ سلیمانی بھی شائع ہوئی، یہ ان خطبوں، تحریروں اور مقدموں کا مجموعہ ہے جو اردو ادب و زبان سے

متعلق ان کے قلم سے نکلے، ان کو پڑھ کر آج بھی اردو زبان کا بڑا سے بڑا ادیب، انشاء پرداز اور نقاد اردو ادب پر ان کی گہری نظر کا قائل ہوگا، اس میں اردو کے مولد کی تعین و تشخیص بھی کئی گئی ہے، اس کے آغاز اور اس کے عہد بہ عہد ترقی کی تفصیلات بھی ہیں، اس کی بقاء کی ضرورت اور اہمیت پر زور بھی ہے، اردو، ہندی اور ہندوستانی پر مباحث بھی ہیں، سنسکرت آمیز ہندی کو راشٹریہ بھاشا بنانے کے خطرات کی تنبیہ بھی ہے، ہندی اور اردو کے ناگوار قضیہ کا ذکر ہے، لکھنؤ والوں کی لسانی اور ادبی خدمات کا بھی ذکر ہے، پرانے لفظوں کی نئی تحقیق بھی ہے، تہنید کے عنوان سے نہایت ہی دلچسپ لسانی گفتگو بھی ہے، اکبر کے ظریفانہ کلام کی نکتہ وری بھی ہے، مکاتیب شبلی پر گلفشانی بھی ہے، کلام شاد پر تبصرہ بھی ہے، محبت کے متوالے، عشق حقیقی کے جو یا، مجاز کی راہ سے حقیقت کی منزل تک اور بت خانہ کی گلی سے کعبہ کی شاہراہ اور خم خانہ کے بادۂ کیف سے بے خود فراموش ہو کر بزم ساقی کوثر تک پہنچنے والے جگر مراد آبادی کی شاعری کا تجزیہ بھی ہے، پھر گداز طبیعت رکھنے والے، ازل سے درد مند دل لے کر آنے والے، مزاج سدا کا اداس رکھنے والے، عالم کی نیرنگی، زمانہ کی سازگاری اور پھر اپنی قوم کی پستی دیکھ کر خود بھی اکثر رونے اور دوسروں کو رلانے والے حالی کی مسدس کی وہ آئینہ داری بھی ہے جس میں ہر مسلمان اپنا چہرہ دیکھ سکتا ہے۔

### سفر:

۱۹۴۰ء میں ان کا سفر دکن، سرحد، پنجاب میں ہوتا رہا، جس میں وہ مسلمانوں کو شرف اہم ہونے کی حیثیت سے 'خیر ام' ہونے کا شوق دلاتے رہے، یہ گویا تبلیغی سفر تھا، اسی سال انھوں نے بچوں کیلئے 'رحمت عالم' لکھی، جس میں سلیس اور آسان زبان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک ہے، وہ بچوں کیلئے لکھی گئی ہے، لیکن جوان اور بوڑھے سب اس سے مستفید ہو رہے ہیں، اور اس وقت تک شاید لاکھوں کی تعداد میں شائع ہو چکی ہے۔



## روحانی انقلاب:

۱۹۴۰ء میں ایک بڑا روحانی انقلاب پیدا ہوا، ان کی نئی زندگی بڑی پاک صاف رہی اور ان کے نزدیک رہنے والوں کو یہ کہنے میں تامل نہ ہوتا کہ:

مانند حرم پاک ہے تو میری نظر میں

لیکن اپنی دینی عظمت و علمی جلالت کا لحاظ کئے بغیر حضرت مولانا تھانویؒ کے آستانہ پر جا کر اپنا سر نیاز جھکا دیا، حضرت مولانا کو بھی علم و فن کے ایک شہباز اور گلستان رسالت کے ایک عندلیب خوشنوا، اسلام کے ایک سفیر اور ضمیر کو اپنے سایہ عاطفت میں لینے میں بڑی مسرت ہوئی، عبادت و ریاضت میں ذکر خفی اور جلی بھی ہونے لگا، ان کی تقریر و خطابت میں علمی و تاریخی رنگ کے بجائے تبلیغی انداز پیدا ہو گیا، زیادہ وقت رشد و ہدایت میں صرف ہونے لگا، پہلے کبھی کبھی شعر کہہ لیا کرتے تھے، اب عارفانہ اور صوفیانہ رنگ کے اشعار اور غزلیں زیادہ کہنے لگے، اس زمانہ میں ان کی طبیعت کا رنگ ان دو شعروں سے ظاہر ہوگا۔

ہم ایسے رہے یاں کہ ویسے رہے      واں دیکھنا ہے کہ کیسے رہے  
خیالِ دو روزہ کا کیا عیش و غم      سفر کا بھی کیا جیسے تیسے رہے

## حیات شبلی:

مگر اس رنگ کے باوجود ان کے اپنے استاد کی اس وصیت کا خیال برابر غالب رہا کہ جب تم اور دنیا کے کاموں سے فارغ ہونا تو تم ہی میری سوانح عمری لکھ دینا، ۱۹۴۰ء میں اس کام کو شروع کر دیا تھا، اور تین برس کی جائزہ محنت کے بعد ۱۹۴۳ء میں ۸۴۶ صفحے کی حیات شبلی لکھ کر اہل علم کے سامنے پیش کی، یہ ایک جلیل القدر، عالی مرتبت اور شفیق استاد کی خدمت میں ایک فاضل شاگرد کی دلی محبت، شیفگی، وارفتگی کا نذرانہ ہے، اس میں مولانا شبلیؒ کے علمی کمالات و اجتہادات اور ان کے زمانہ میں تمام تعلیمی، اصلاحی، ملی اور قومی

تحریکوں میں ان کی دلچسپیوں کا ایسا دلکش مرقع کھینچا ہے کہ ان کے نہ صرف خط و خال نمایاں ہو گئے ہیں بلکہ مسلمانان ہند کے پچاس برس کے علمی، ادبی، سیاسی، تعلیمی، مذہبی واقعات کی تاریخ بھی قلمبند ہو گئی ہے، اس کے مقدمہ میں یوپی کے مشرقی اضلاع کی کئی صدیوں کی جو علمی، دینی، اخلاقی اور روحانی تاریخ لکھی گئی ہے، وہ اس کتاب کا شاہکار ہے۔

## شعبہ تاریخ کی صدارت:

ان کی طبیعت کا رنگ بدل جانے کے باوجود ملک کے ہر حصہ سے ان کے پاس علمی، تاریخی اور مذہبی جلسوں کیلئے دعوت نامے آتے رہے، ۱۹۴۴ء میں انڈین ہسٹاریکل کانگریس کا جلسہ مدراس میں ہوا، تو ان کو شعبہ تاریخ ہند از منہ و سوطی کی صدارت کیلئے دعوت دی گئی، اس میں انھوں نے جو خطبہ دیا، وہ مؤرخوں کیلئے شمع ہدایت ہے، اس میں انھوں نے مؤرخوں کی مخاطب کر کے فرمایا:

”انگریزوں نے مسلمانوں کی تاریخ الٹ پلٹ کر ایسی سمجھائی اور پڑھائی کہ جو دل ان سے ٹوٹے وہ اب تک نہ جڑ سکے، لیکن اب جن کی نظر میں اس ملک کا مستقبل ہے، اور جن کے ہاتھوں میں اس کے مستقبل کا بنانا یا گڑنا ہے ان کو اپنی ذمہ داری کو سمجھنا چاہئے، اور اس حالت میں جب کہ ہم سب کو معلوم ہے کہ ہم کو اب اسی ملک میں جینا اور مرنا ہے تو عداوت اور نفرت کی کچھلی باتوں کو اس طرح دہراتے رہنا جس سے یہ جذبہ اس طرح پلتا اور بڑھتا رہے اور پھولتا رہے، اپنے ملک کے ساتھ بڑی بے وفائی ہے،..... ہندوستان کی جو تاریخ لکھی جائے اس کا مقصد ہندوستان کے متفرق اجزاء کو باہم جوڑنا ہو، توڑنا نہ ہو، حال کو ماضی کی ناگواری کو بڑھا کر کیوں برباد کیا جائے، اور کیوں مستقبل کیلئے یہ کوشش جاری رہے کہ وہ کبھی خوش آئند نہ ہو سکے۔“

اسی سفر میں مدراس کے دوسرے مقامات ویشارم، عمر آباد میں مذہبی تقریریں

کرتے ہوئے بمبئی پہنچے، وہاں جمعیت العلماء کی دعوت پر سورۃ الحمد کی تفسیر، شہر کی انجمن اسلام ہال میں ’اردو اور صابو صدیق ہال میں ’ہندوستان میں علوم عربیہ کی خدمت‘ اور ایک خاص مجمع میں ’توبہ و انابت‘ پر تقریریں کیں، بمبئی سے حیدرآباد ندوۃ العلماء کے کام سے گئے اور وہاں سے گاندھی جی نے ان کو واردہا بلایا، وہاں جو جلسہ ہوا تو گاندھی جی کے سامنے اپنی تقریر میں ایک ملکی زبان کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے فرمایا:

”ہندوؤں اور مسلمانوں کی زبان میں اسی حد تک فرق ہونا چاہئے جس حد تک ان کے مذہبوں اور تمدنوں میں ہے، اسی لئے جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، ان کی مذہبی و تمدنی اصطلاحوں اور لفظوں کا ماخذ عربی، فارسی اور ترکی ہونے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں، ایسی ہی اجازت ہندوؤں کو بھی ان کے مذہبی اور تمدنی خصوصیات کے لئے ہونی چاہئے، اس کے بعد لفظوں کا مدار لغت کی کتابوں کے بجائے بازار کے چلن اور عوام کے رواج پر ہونا چاہئے، اور اس وقت ہماری زبان میں عربی، فارسی، ہندی، سنسکرت اور انگریزی کا جو لفظ جس صورت میں بولا جاتا ہے اسی کو برقرار رکھنا چاہئے۔“

اسی کی ترویج وہ زندگی بھر کرتے رہے، اور اگر اس پر عمل کیا جاتا تو ہندوستان کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔

اسی سفر میں وہ رانندیر اور سورت گئے، اور رانندیر کی جامعہ حسینیہ میں الجہد والجہاد علمی المعاش والمعاد کے عنوان سے ایک تقریر کی، اور مدرسہ اشرفیہ میں خشیت الہی پر ایک خطبہ دیا۔

وہاں سے واپس آئے تو بہت سخت علیل ہو گئے، اچھے ہوئے تو ڈاکٹروں نے علمی کام چھوڑ دینے کو کہا مگر عمر بھر کی اس عادت کا چھوٹا مشکل تھا، معارف کے لئے شذرات لکھتے رہے، جس میں دینی اور ملی احیاء کی تلقین کے ساتھ ہند اور تفریح دونوں کے خطرات سے آگاہ کیا۔

ندوہ:

ندوہ ان کی زندگی کے رگ و ریشہ میں رچا بسا ہوا تھا، زندگی بھر اس کے لئے مفید کام انجام دیتے رہے، آخر میں وہیں منتقل ہو جانے کا خیال تھا، لیکن نواب حمید اللہ نے اصرار کر کے بھوپال بلالیا، تاکہ وہ ریاست کے دارالقضاء اور عربی مدارس کو اپنی نگرانی میں لے کر خالص مذہبی اور شرعی رنگ میں کر دیں، ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان میں بڑا انقلاب آ گیا، دیسی ریاستوں کے لیل و نہار بھی بدل گئے، وہاں کے قیام کے زمانہ ۱۹۴۹ء میں حج کے لئے گئے، مدینہ منورہ میں ایک مہینہ قیام فرمایا، اور بارگاہ نبوی کے سیرت نگار نے اپنے درد و عشق، عقیدت و محبت، عجز و نیاز، لطف و سرور کا اظہار ایک نعتیہ غزل میں کیا۔

۱۹۴۷ء کے بعد وہ کوئی مستقل مضمون نہ لکھ سکے، معارف میں وفیات کے عنوان سے کبھی کبھی لکھتے، یا شذرات لکھ بھیجتے، جون ۱۹۵۰ء میں معارف میں ان کے آخری شذرات شائع ہوئے جس کا آخری ٹکڑا یہ ہے:

”ہم مسلمانوں اور ہندوؤں کے میل ملاپ اور میل جول پر دل سے یقین رکھتے ہیں، لیکن یہ قطعاً ضروری نہیں کہ اس غرض کو دین دھرم کا فرق مٹا کر ہی حاصل کیا جاسکتا ہے، بلکہ ہندو ہندو اور مسلمان مسلمان رہ کر بھی اس غرض کو حاصل کر سکتے ہیں، جس کی مثالیں انگریزوں کی دی ہوئی تعلیم سے پہلے ہندوستان میں کثرت سے تھیں۔“

یہ گویا ہندوستان والوں کے لئے ان کا آخری پیغام تھا۔

ہجرت:

وہ جون ۱۹۵۰ء میں کراچی پہنچ گئے، کیوں گئے؟ کیسے گئے؟ اس کی بڑی دردناک کہانی ہے، وہاں پہنچ کر اپنے ایک مکتوب مؤرخہ ۱۵ جنوری ۱۹۵۱ء میں راقم کو تحریر فرماتے ہیں:

”یہاں کیا آیا کہ دنیا ہی بدل گئی، ہندوستان بھلائے سے نہیں بھولتا،..... خدا جانے چمن پہ کیا گذری۔“

## وفات:

کراچی ہی میں ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء کو اپنے مالک حقیقی سے جا ملے، پاکستان میں ان کی مشغولیتوں اور سرگرمیوں کو سر دست نظر انداز کیجئے۔

ان کی زندگی پر یہ محض ایک طائرانہ نگاہ ہے، اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوگا کہ ان کی زندگی علم و فن کی اضطراری، اضطرابی اور سیمابنی کیفیت کا ایک پیکر بنی رہی، جس میں حرکت، سرگرمی اور کثرت کار ایسی کار فرما رہی کہ یہ ساری چیزیں ان کی زندگی کی لازم و ملزوم بنی رہیں، شاید ہی ان کا کوئی دن یا کوئی گھنٹہ بیکار گزرا ہو، وہ لکھتے نہیں تو کچھ پڑھتے، اور اگر لکھتے پڑھتے نہیں تو کچھ سوچتے، یہ کہنے میں تامل نہیں، کہ وہ خالد بن ولیدؓ کی طرح علم کے میدان کارزار میں اترے، سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی طرح اقلیم علم کی فتوحات کیں، عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کی طرح علم کے قلعوں کے کنگروں پر اپنا پرچم لہرایا، معاذ بن جبلؓ کی طرح علمی خطہ پر فرماں روائی کرنے میں قرآن اور حدیث کو سینے سے لگا کر اپنی اصابت رائے سے علمی اجتہادات بھی کئے، ہندوستان میں اپنی قلمی رواداری اور علمی فراخ دلی دکھا کر علم و فن کے محمد بن قاسم بھی بنے رہے۔

## جنازہ:

۲۳ نومبر ۱۹۵۳ء کو ان کا جنازہ کراچی میں اٹھا تو اس کا آنکھوں دیکھا حال وہاں کے ریڈیو سے نشر کیا جا رہا تھا، دارالمصنفین کے لوگ اس کو سن رہے تھے تو ان کو محسوس ہو رہا تھا کہ اسلام کا ایک تابندہ ضمیر اور بے چین سفیر اپنے علم کی گہرائی، فن کی دیدہ دری، تحقیق کی گیرائی، قلم کی شگفتگی، تحریر کی زور بیانی، طرز ادا کی دلنشین اور انداز بیان کی خوبی کے ساتھ سپرد خاک ہو رہا ہے، دارالمصنفین کے لوگ اب تک دلگیر ہیں کہ بزم شبلی کا صدر الصدور اس کی علمی مجلس کا سرور جب سے ان سے رخصت ہوا تو ان کے ساتھ یہاں کی علمی سحر کی سپیدی اور علمی شام کی رنگینی بھی چلی گئی، انھوں نے ایک علمی تاج محل بنایا جس پر وہ

چودھویں رات کی چاندنی کی طرح پھیلے رہے، وہ گئے تو پھر اس پر وہ چاندنی چھٹکی ہوئی نہیں دکھائی دی، ان کی یاد میں جب آنسو کے قطرے گرتے ہیں تو اس کا ہر قطرہ یہ کہتا ہوا گرتا ہے کہ:

ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے

## حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندویؒ

### اپنی سیرۃ النبیؐ میں انشاء پرداز کی حیثیت سے (۱)

تمہید:

اس خاکسار کو حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ قدس سرہ العزیز کے ادنیٰ شاگرد ہونے کی سعادت حاصل ہے، اس تعلق کی بنا پر وہ یہ سمجھتا ہے کہ علامہ شبلی نعمانیؒ کے بعد حضرت استاذی المحترم سب سے اچھے ماہر قرآنیات، سب سے اچھے ماہر حدیث، سب سے اچھے ماہر علم کلام، سب سے اچھے سیرت نگار، سب سے اچھے مؤرخ اور سب سے اچھے انشاء پرداز تھے، آپ کو اختیار ہے کہ آپ اس سے اختلاف کریں، مگر آپ کو اس کا بھی حق نہیں کہ آپ اس خاکسار کو اپنی یہ رائے قائم کرنے کے حق سے محروم کر دیں، آپ کو اپنی پسند ہے تو اس خاکسار کو بھی اپنی پسند ہے۔

یہ موقع تو نہیں کہ اس دعویٰ کو ثابت کیا جائے کہ وہ علامہ شبلیؒ کے بعد کس طرح سب سے اچھے ماہر قرآنیات، ماہر علم کلام، سیرت نگار اور مؤرخ تھے، مگر یہاں پر ان کی انشاء پرداز سے متعلق کچھ باتیں عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا، اس سلسلہ میں ان کا یہ جوہران کی مشہور تصنیف سیرۃ النبیؐ میں کیسے چمکتا دکھائی دیتا ہے، اس کی طرف خاص توجہ دلائی ہے۔

(۱) یہ مقالہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ اردو کے اس سیمینار میں پیش کیا گیا جو حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندویؒ پر منعقد کیا گیا تھا۔

جس کسی کو ان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا اس نے ان کو طہارت، شرافت، تمکنت، عظمت، سنجیدگی، ادب، وقار کا پیکر پایا، ان ہی اوصاف کی بوقلمونی ان کی تحریروں اور کتابوں میں نظر آئیگی، ان کی تصنیف ارض القرآن میں سنجیدگی ان کے قلم کو چومتی نظر آئے گی، ان کی کتاب ”سیرت عائشہ“ میں ادب و احترام نچھاور ہوتا دکھائی دے گا، ان کی ”عرب و ہند کے تعلقات“ اور ”خیام“ میں تمکنت ان کے قلم سے ہم آغوش دکھائی دے گی، اور پھر ان کی شہرہ آفاق ”سیرۃ النبیؐ“ میں عظمت اور وقار ہر سطر میں سر تسلیم کرتے ہوئے دکھائی دیں گے، وہ اپنی ان ہی خصوصیات کی بنا پر کبھی اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات پاک کا جلال، کبھی اس کی صفات کاملہ کا جمال، کبھی اس کے مرغ و ماہی اور کبھی بندوں کی مجبور و محکم دنیا میں اس کی بادشاہی دکھاتے رہے، کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ کے گلشن میں نسیم نو بہاری بن کر اس کے گل و سرو و صنوبر سیٹے رہے، کبھی تفسیر کے دریا میں مثل موج ابھر کر، کبھی حدیث کے دریا کے ساحل سے گزر کر، کبھی تاریخ کے دریا کے سینے میں اتر کر، کبھی ملی سیاست کے جذبات کا تلاطم ابھار کر، کبھی اپنے محبوب معاصروں کی موت پر اپنے آنسوؤں کا سیلاب بہا کر، اور کبھی انداز بیان کے کوثر تسنیم کو رواں کر کے اپنے علم و قلم کے مقام خودی کو فاش تر کرتے رہے۔

سیرۃ النبی جلد اول و دوم تو علامہ شبلی نعمانیؒ کی لکھی ہوئی ہیں، لیکن سیرۃ النبیؒ کی تیسری جلد سید صاحب کی اپنی تصنیف ہے، گو اس کے ۸۶۸ صفحات میں ۸۳ صفحے مولانا عبدالباری ندویؒ کے لکھے ہوئے ہیں، اس کا موضوع معجزات ہے، اس میں معجزات کے امکانات، تاثیرات فلکیہ، علل خفیہ، قوت کمالیہ، قوت نفسیہ، تاثیرات نفسانیہ، مکالمہ الہی، وحی، نزول ملائکہ، عالم رؤیا، مشاہدات، مسموعات اسراء، رؤیا، معراج، معراج کے اسرار، اعلانات اور انعامات، شق القمر، اور شق صدر وغیرہ جیسے غوامض پر مباحث ہیں، ان میں کبھی اشاعرہ، اور کبھی معتزلہ کے نقطہ ہائے نظر پیش کئے گئے ہیں، کہیں ابن رشد، ابن تیمیہ، یعقوب کندی اور فارابی کی تصانیف کی ورق گردانی کی گئی ہے، ان تمام مباحث کی بنا قرآن مجید اور احادیث پر رکھی گئی

ہے، یہ موضوع آسان نہ تھا، خشک، مشکل اور سڈگا تھا، اس کے غامض مباحث میں اغلاق، اشکال اور ابہام کے پیدا ہونے کا خیال تھا، لیکن ان کو پیش کرنے میں سید صاحب نے کچھ ایسا طاقت و در انداز بیان اختیار کیا کہ جو چیزیں معلوم تھیں، وہ از سر نو معلوم ہوتی نظر آئیں اور جو چیزیں معلوم نہیں تھیں، ان کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ خیال کے خاستان میں لالہ زار دکھائی دے رہا ہے، اور ظنیات کے ریگستان میں ایک نئے قسم کا گلزار آباد ہو رہا ہے، شکوک و شبہات کی تاریکی میں ایمان کی مہتابی پھیل رہی ہے، پوری کتاب ایک عاشق اسلام کے بے قرار دل، ایک دیدہ ور قلم کے مستحکم دلائل اور ایک رمز شناس عالم کی گہری نگاہ کے ساتھ لکھی گئی ہے، جس میں قرآن مجید کی آیتوں کے ہیروں کی کانٹنی بھی کی گئی ہے، اور حدیث کے خزانے سے زمرہ اور یاقوت بھی بکھیرے گئے ہیں، اس کو پڑھتے وقت یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت تک سید صاحب کی علمی معرفت اور تحقیقی نظر اپنے اوج کمال پر پہنچ رہی تھی، جس کو قلمبند کرنے میں ان کے قلم کی شگفتگی، تحریر کی روانی، زبان کی بے تکلفی، طرز استدلال کی ندرت، فصاحت کی دل نشینی اور بلاغت کی آویزی ان کا پورا ساتھ دے رہی تھی، اور انھوں نے ثابت کر دکھایا کہ لیلیٰ کے خطوط اور مجنون کی ڈائری لکھنے یا پھول کو زیب چمن بنا کر اس کی شیم انگیزی کرنے یا بوئے گل کو نسیم سحری سے پھیلانے، حسینوں کی مشکیں زلفوں کی شامہ نوازی اور عنبریں بانہوں کی مرقع آرائی کرنے میں تو انشاء پر دازی کا جو ہر دکھانا بہت آسان ہے، لیکن موضوع کی سنگلاخی کے ساتھ افکار و مباحث کا قصر شیرین تعمیر کر کے اس کے اندر سے زبان کی جوئے شیر بہانا بہت مشکل ہے، اس کتاب کا مطالعہ کرتے وقت یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ اردو زبان کو ایسا پیرایہ بیان مل رہا تھا، جس سے اور دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی طرح اس میں بھی غوامض اور دقائق کو شگفتہ اور شستہ طرز ادا میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

اس کتاب کی تہید ہی پوری ادبی شان سے لکھی گئی ہے، جس کے کچھ ٹکڑے یہ ہیں:

”سیرت نبوی ﷺ کا یہ حصہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان حالات،

مشاہدات اور کیفیات کے بیان میں ہے، جن کا تعلق اس عالم سے ہے، جو

ہمارے اس مادی عالم اور اس کے مادی قوانین کے حدود سے باہر ہے، جس طرح ہماری یہ مادی دنیا ایک نظام خاص پر چل رہی ہے، مثلاً رات کے بعد دن نمودار ہوتا ہے، خزاں کے بعد بہار آتی ہے، ستارے غروب ہوتے ہیں، تو آفتاب نکلتا ہے، گرمی جاتی ہے تو جاڑے آتے ہیں، پھول اپنے وقت پر کھلتے ہیں، درخت اپنے موسم میں پھلتے ہیں، ستارے اپنے معین اوقات پر ڈوبتے اور نکلتے ہیں، اسی طرح روحانی عالم بھی اپنا ایک خاص مقام رکھتا ہے، اس کا بھی ایک آسمان وزمین ہے، وہاں بھی تاریکی اور روشنی ہے، خزاں اور بہار ہے، فصل و موسم ہے۔“

آسمانہاست در ولایت جاں کار فرمائے آسمان جہاں

(ج/۳، ص/۱)

تحریر کی یہ روانی رکتی نہیں اور بہتی چلی جاتی ہے، اس کے فوراً ہی بعد رقمطراز ہیں:

”جب روئے زمین پر گناہوں کی تاریکی اور بدیوں کی ظلمت محیط ہو جاتی ہے، تو صبح کا بڑکا ہوتا ہے، اور آفتاب ہدایت نمودار ہوتا ہے، باغ عالم میں جب برائیوں کی خزاں چھا جاتی ہے، تو موسم بدلتا ہے، اور بہار نبوت رونق افزا ہوتی ہے۔“ (ایضاً ج/۳، ص/۲)

کس طرح؟ اس کو متکلمانہ رنگ میں اس طرح قلمبند کرتے ہیں:

”اور جس طرح زمین، آسمان، سورج، پھل اور پھول کے خاص خاص قوانین فطرت ہیں جن میں عموماً تغیر نہیں ہوتا، اسی طرح دنیا کے رشد و ہدایت، عذاب و رحمت اور نبوت و رسالت کے خاص خاص اصول و قواعد ہیں، جن میں تغیر راہ نہیں پاتا، انبیاء و رسل اپنے اپنے وقت پر مبعوث ہو کر قوموں کو دعوت دیتے ہیں، قومیں ان کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہیں، منکرین ہلاک اور مومنین کامیاب ہو جاتے ہیں، اس روحانی جہاد میں انبیاء و رسل سے ہمارے علم و دانش سے بالاتر اعمال صادر ہوئے ہیں، اور ان کے عجیب خوارق ظہور پذیر ہوئے ہیں۔“ (ایضاً ج/۳، ص/۲)

اس متکلمانہ رنگ میں کچھ فلسفیانہ ممکنیت یہ لکھ کر پیدا کر دیتے ہیں کہ: ”جس طرح ہمارا نفس اور ہماری روح یا ہمارے جسم کی پراسرار مخفی قوت ہمارے کالبد خاکی پر حکمراں ہے، اور ہمارے تمام اعضاء و جوارح اس کے ایک ایک اشارہ پر حرکت کرتے ہیں، اسی طرح نبوت کی روح اعظم اذن الہی سے ہمارے عالم جسمانی پر حکمراں ہو جاتی ہے، اور روحانی دنیا کے سنن و اصول عالم جسمانی کے قوانین پر غالب آ جاتے ہیں، اس لئے وہ چشم زدن میں فرش زمیں سے عرش بریں تک عروج کر جاتی ہے۔“ (ج/۳، ص/۲)

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور فضیلت کا احساس دلانے میں ان کی انشاء پر داذی کے جلوے اس طرح نمایاں ہوتے ہیں۔

”سمندر اس کے ضرب سے تھم جاتا ہے، چاند اس کے اشارے پر ٹکڑے ہو جاتا ہے، اس کے ہاتھوں کی دی ہوئی چند خشک روٹیاں ایک عالم کو سیر کر دیتی ہیں، اس کی انگلیوں سے پانی کی لہریں بہتی ہیں، اس کے نفس پاک سے بیمار تندرست ہو جاتے ہیں، اور مردے جی اٹھتے ہیں، وہ تنہا مٹھی بھر خاک سے پوری فوج کو تہ و بالا کر دیتا ہے، کوہ و صحراء، بحر و بر، چاند اور بے جان حکم الہی اس کے آگے سرنگوں ہو جاتے ہیں، مگر بایں ہمہ وہ بندہ اور بشر ہوتا ہے، اور اس سے یہ جو کچھ عجائب قدرت ظاہر ہوتے ہیں، وہ اس کا نہیں بلکہ اس کے رب کا فضل ہوتا ہے، اور اسی کی حیثیت اور قدرت سے پیغمبر کے ہاتھ سے ظاہر ہوتے ہیں، یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لئے ظاہر کئے جاتے ہیں۔“ (ایضاح/۳، ص/۳)

پھر اللہ تعالیٰ کے سامنے بندوں کی بے چارگی، مجبوری، محکومی اور لاعلمی کی مرقع آرائی اس طرح کرتے ہیں کہ اس میں منطقیانہ دلائل آگئے ہیں، اور تاریخی کوائف بھی:

”لیکن جس طرح ہم کبھی یہ نہیں بتا سکتے کہ خاص خاص پھول، خاص خاص درخت، خاص خاص ستارے فلاں فلاں معین اوقات ہی پر کیوں جلوہ نما ہوتے

ہیں، پھول سرخ کیوں ہوتے ہیں، ستارے چمکتے کیوں ہیں، شہد میٹھا کیوں ہوتا ہے، چاند اور سورج چلتے کیوں ہیں، تخم، درخت، غذا، خوان اور گوشت کیونکر بن جاتا ہے، اسی طرح اس کا جواب بھی نہیں دے سکتے کہ پیغمبروں کا ظہور اپنے اپنے وقت پر کیوں کر ہوتا ہے، اور ان سے یہ مافوق العادۃ افعال و اعمال بہ حکم الہی کیوں کر صادر ہوتے ہیں، ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ ہوتے ہیں، چنانچہ دنیا کا ہر پیغمبر بلکہ روحانیت کا ہر حامل اپنی پراسرار زندگی کے اندر اس قسم کے حالات و کیفیات کی ایک دنیا رکھتا ہے، عالم کی تاریخ آپ کے سامنے ہے، جس میں اگر قوموں کے روحانی معلموں کے حالات و سوانح غور سے پڑھیں، تو آپ کو ہر جگہ نظر آئے گا کہ وہ کچھ دیکھتے تھے، جو ہم نہیں دیکھ سکتے، وہ وہ سنتے تھے جو ہم نہیں سن سکتے، وہ وہ کچھ جانتے تھے، جو ہم نہیں جان سکتے، اور ان سے اعمال بھی صادر ہوتے تھے، جو کسی اور سے نہیں ہو سکتے، یہ وہ تاریخی واقعات ہیں، جن سے انکار کرنا اسی طرح ناممکن ہے، جس طرح سکندر، اور پولین کے فتوحات یابدہ، موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کے وجود سے۔“ (سیرۃ النبی ج/۳، ص/۴-۱)

اس کتاب کا موضوع معجزات ہے، اس لئے اس میں فلسفیانہ مباحث بھی آگئے ہیں، مثلاً پیغمبروں کی خصوصیات میں ایک چیز خواب بھی ہے، جس کو مذہبی اصطلاح میں رؤیائے صالحہ یا رؤیائے صادقہ کہتے ہیں، عالم رؤیا کے عنوان سے اس کی بحث کی ابتدا انداز تخریر کی بلاغت کا لحاظ رکھتے ہوئے کرتے ہیں:

”رؤیا اور خواب درحقیقت نفس یا روح کے عجائبات کا ایک حیرت انگیز ظلم ہے، علمائے نفس کہتے ہیں کہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کے قوائے نفسی و دماغی ہر وقت اور ہر آن اپنے ذہنی اعمال میں مصروف رہتے ہیں، جب وہ سو جاتا ہے، اور اس کے ظاہری حواس بے کار ہو جاتے ہیں، اس وقت بھی ان کے فکر و نظر کا عمل جاری رہتا ہے، مگر چونکہ انسان عمیق اور پرسکون نیند سو جاتا ہے، اس لئے

جاگنے کے بعد اس کو اپنی حالت خواب کا احساس نہیں ہوتا، لیکن کبھی کبھی جب اس کی نیند مستغرق اور گہری نہیں ہوتی تو اس کو اپنی گذشتہ سیر دماغی کے مکمل یا نامکمل مناظر یاد رہ جاتے ہیں، اسی کا نام خواب ہے۔“ (ج/۳، ص/۳۶۱)

سید صاحب اس کو فلسفہ قدیمہ کا فرسودہ خیال قرار دیتے ہیں، اور پھر جدید عہد ترقی میں اس کا جو تجزیہ کیا گیا ہے، اس کو اس طرح آسان طریقہ سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں:

”جدید عہد ترقی میں سائیکولوجی اور نفسیات کے علماء کا مشہور و معقول نظریہ یہ ہے کہ ہم عالم بیداری میں اپنے جن خیالات، جذبات، ارادوں اور تمناؤں کو جان کر یا بے جانے کسی سبب سے دبا دیتے ہیں عالم خواب میں جب ہمارے عقل اور احساس کی جابرانہ حکومت ان سے اٹھ جاتی ہے، ان کو ابھرنے کا موقع ملتا ہے، اور وہ ہم کو خواب بن کر نظر آتے ہیں۔ (ایضاً)

سید صاحب اس رویا کو خواب یا اوہام دماغی سے تعبیر کرتے ہیں، پھر عرفائے روح کے نزدیک رویا کی کیا حقیقت ہے، اس کو اپنی نظر کی باریک بینی سے اس طرح قلمبند کرتے ہیں:

”عرفائے روح..... کے نزدیک رویا کی حقیقت کچھ اور ہے، وہ کہتے ہیں کہ انسان جسم روح سے عبارت ہے۔ روح جب تک جسم کے اندر ہے، اس کی جلوہ نمائی کے دورخ ہیں، جسمانی و روحانی، اپنے جسمانی دروازہ سے وہ جھانکتی ہے تو اس کو جسم کے مادہ کی سطح پر رنگارنگ نقش و نگار اور گلکاریاں نظر آتی ہیں، یہ اس کے وہ تعلقات اور دلچسپیاں ہیں، جو اس کے اس جسمانی و مادی عالم کے ساتھ قائم ہیں، لیکن اس کے پیچھے ایک دوسرا دروازہ ہے، جہاں سے وہ روحانیت کے عالم کی سیر کر سکتی ہے، جس قدر اس کا تعلق انس، دل بستگی، شیفتگی، اور مشغولیت عالم جسم سے زیادہ ہوگی اسی قدر دوسرے عالم کی طرف سے فراموشی، غفلت اور بے

تعلقی زیادہ ہوگی، حالت خواب میں روح کی ظاہری جسمانی مصروفیتیں چونکہ کم ہو جاتی ہیں، اس لئے اس کو دوسری کھڑکی کی طرف جھانکنے کی فرصت مل جاتی ہے، اور پھر روح کو جس قدر تعلقات خارجی سے بیگانگی زیادہ ہو جاتی ہے، شہرستان ملکوت میں اس کی سیر بہت آگے تک اور بہت دور تک اور وہاں کے تمثیلی مناظر و مشاہدات سے اس کی اطلاع اور واقفیت زیادہ صحیح اور سچی ہوتی ہے، جو روحیں کہ اس عالم کی جبابی کی بندشوں میں رہ کر بھی ان میں گرفتار اور مقید نہیں ان کے لئے عالم بیداری بھی اقلیم روح کی گلگشت سے مانع نہیں، اسی کا نام مشاہدہ اور مکاشفہ ہے۔“ (سیرۃ النبیؐ ج/۳، ص/۳۶۲-۳۶۱)

یہ کیسا خشک موضوع تھا، لیکن سید صاحب نے اپنی تحریر کی روانی سے اس میں خشکی پیدا ہونے نہیں دی، فلسفیانہ مباحث میں اپنے انشاء کا جو ہر دکھا کر کیسی رنگینی پیدا کر دی ہے۔ سید صاحب نے معجزات کی بحث میں مادہ یعنی ہیولی، حوادث بلا سبب موثر، تاثیرات فلکیہ، علل خفیہ، قوت کمالیہ، قوت نفسیہ اور تاثیرات نفسانیہ وغیرہ جیسے فلسفیانہ مباحث کو سلیس اور فصیح زبان میں سمجھایا ہے، وہ ان حکمائے اسلام کے ادراک ہی کی طرح ہے، جو ان مباحث کے بڑے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔

معراج کے ذکر کی جو دل نشیں اور فصیح تمہید ہے، اس کو پڑھنے سے اس کی ساری کیفیات ذہن پر چھا جاتی ہیں، اور ان کو قبول کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں، فصاحت کی یہی تعریف ہے کہ جو کچھ لکھا جائے، اس میں دل نشینی ہو، ذیل کی عبارت کو اسی حیثیت سے ملاحظہ کریں:

”اولو العزم پیغمبروں کو آغاز نبوت کے کسی خاص وقت اور مخصوص ساعت میں یہ رفیع منصب حاصل ہوتا ہے، اور اس وقت شرائط رویت کے تمام مادی پردے ان کیلئے مسخر کر دیئے جاتے ہیں، قیود زمانی و مکانی کی تمام فرضی بیڑیاں ان کے پاؤں سے کاٹ ڈالی جاتی ہیں، آسمان و زمین کے مخفی مناظر بے حجابانہ ان کے

سامنے آتے ہیں، اور وہ اس کے بعد نور کا حلقہ بہشتی پہن کر فرشتوں کے روحانی جلوں کے ساتھ بارگاہ الہی میں پیش ہوتے ہیں، اور اپنے اپنے رتبہ اور درجہ کے مناسب مقام پر کھڑے ہو کر فیض ربانی سے معمور اور غرق در یائے نور ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ بعض مقربان خاص کو تو یہ درجہ عطا ہوتا ہے کہ وہ حریم خلوت گاہ قدس میں بار پا کر قباب قوسین (دو کمانوں کے فاصلہ) سے بھی نزدیک تر ہو جاتے ہیں، اور پھر وہاں سے اپنے منصب کا فرمان خاص لے کر اسی کا شانہ آب و خاک میں واپس آ جاتے ہیں۔“ (سیرۃ النبیؐ ج/۳، ص/۳۹۴)

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج خصوصی کا ذکر ایسے ایجاز کے ساتھ کرتے ہیں جس میں کچھ کا احاطہ ہو گیا ہے۔

”حضور صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ سردار انبیاء اور سید اولاد آدم تھے، اس لئے اس حظیرہ قدس اور بارگاہ لامکان میں آپ کو وہاں تک رسائی حاصل ہوئی، جہاں تک کسی فرزند آدم کا قدم اس سے پہلے نہیں پہنچا تھا اور وہ کچھ مشاہدہ کیا جو اب تک دوسرے مقربان بارگاہ کی حد نظر سے باہر تھا۔“ (ایضاً ص/۳۹۵)

یہ تو سیرۃ النبیؐ جلد سوم کی تھوڑی سی جھلکیاں تھیں، اب ذرا آگے بڑھ کر اور جلدوں کی طرف مائل ہوں۔

### سیرۃ النبیؐ جلد چہارم:

سیرۃ النبیؐ جلد سوم ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی، اس کے آٹھ سال کے بعد ان کی چوتھی جلد طبع ہوئی، جو ۸۸۸ صفحے پر مشتمل ہے، یعنی تیسری جلد سے ۲۰ صفحے زیادہ ہیں، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ سید صاحب کے قلم کا مسافر پہلے سے زیادہ تیز اور سبک رو ہو گیا تھا، اس وقت ان کی عمر ۵۳ سال کی ہو چکی تھی، لیکن قلم پہلے سے زیادہ جوان اور رعنا ہو گیا تھا، اس لئے کہ:

عشق ہم راہ است و ہم خود منزل است

یہ عشق رسول تھا، جس کی رہ نوردی کر کے منزل تک پہنچنے میں ساری عمر گزار دی اور اسی عشق کی سرشاری بلکہ اس کی پس ہوئی بجلیاں اور بکھری ہوئی تجلیاں ان کی سیرۃ النبیؐ کی پانچوں جلدوں کی تحریروں میں دکھائی دیتی ہیں، اس چوتھی جلد کا موضوع منصب نبوت ہے، اس میں پیغمبر اسلام ﷺ کی بعثت کے وقت دنیا اور خصوصاً عرب کی مذہبی اور اخلاقی حالت، خیر الامم بننے کی صلاحیت، تبلیغ نبوی کے اصول، اس کی کامیابی کے اسباب، اسلام کے عقائد میں ایمان کی مختلف قسمیں، جزا و سزا، دوزخ و جنت، قضا و قدر، نبوت کی حقیقت، نبی کی ضرورت، وحی، وحی متلو، وحی غیر متلو، اجتہاد، حکمت وغیرہ جیسے موضوعات پر مباحث ہیں، ان کو سمجھنے اور سمجھ کر سمجھانے کے لئے بیسویں صدی کا ذہن جس زبان، اسلوب اور طرز ادا کا طلب گار ہے، سید صاحب نے اسی کو اختیار کر کے اس کو مطمئن کیا ہے، ان کو پڑھنے کے بعد قارئین غیر شعوری طور پر محسوس کریں گے کہ وہ افکار کی انجمن در انجمن سے گزر رہے ہیں، اور ان کے خیالات میں ارتعاش اور جذبات میں ہلچل پیدا ہو رہی ہے، ان تمام باتوں کو قلمبند کرنے میں سید صاحب کو اس بات سے بڑی مدد ملی کہ ان کے ذہن کے دریچے اور روشن دان ہر طرف کھلے رہے، ان کے خیالات کے قصر میں قرآن مجید کی شعاعیں اور احادیث کی کرنیں تو برابر داخل ہوتی رہیں، اسی کے ساتھ انھوں نے قوموں کی تاریخوں سے جو عبرت و بصیرت حاصل کی اس سے ان کے ذہن میں جلا پیدا ہوتی رہی، پھر علم کلام، فلسفہ اور نفسیات کی چاندنی بھی ان کے ذہن پر چھائی رہی، ان ہی ملے جلے جزائے ترکیبی سے ان کی تحریریں خود بخود ان کے قلم سے نکلتی رہیں، جن کو پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قلم کے دل سے جو باتیں نکل رہی ہیں، وہ ان کے قارئین کے دلوں میں اتر رہی ہیں، یہ باتیں وہی محسوس کریں گے جو اسلام کے میخانے کے ساغر و مینا سے شغل رکھنے کا ذوق رکھتے ہیں، اس قسم کے موضوع پر علماء بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے ہیں، جن کا یہ بڑا وصف تو ضرور رہا ہے کہ وہ ایسے تمام مسائل کو اچھی طرح سمجھتے، لیکن ان کو سمجھانے میں ان کا قلم ان کا ساتھ نہیں دیتا، اس لئے ان کی



تحریریں حواشی، تعلیقات اور توضیحات کی محتاج ہو جاتیں، علامہ شبلیؒ کی تحریروں کا یہ اعجاز ہے کہ مسائل کتنے ہی دقیق اور پیچیدہ ہوں، ان کو سمجھ کر اپنے انداز بیان سے بہت ہی بہتر اور واضح طریقہ پر اپنے قارئین کو سمجھا دیتے، دبستانِ شبلیؒ کے ہی گل سرسبد سید صاحبؒ تھے، اس لئے اس انداز بیان کی گل افشانی ان کی ہر تصنیف کی تحریروں میں ہے، سیرۃ النبیؐ کی اس جلد چہارم میں تو اس کے ہر صفحہ میں ہے۔

اس میں مجوسیوں کی مجوسیت، مزدکیوں کی مزدکیت، یہودیوں کی یہودیت، عیسائیوں کی عیسائیت، ہندوؤں کی ہندویت، بودھوں کی بودھ مت، زردشتیوں کے نور و ظلمت، خیر و شر، نیکی اور بدی، اہرمن اور یزداں، کلیسا کی سفاکی، قباز، خسرو، نوشیرواں، قسطنطین، جسطینین اور یزدگرد وغیرہ کی حکمرانی کی تفصیلات آتی گئی ہیں، پھر ملائکہ، جنات کی حقیقت، بتوں کی پرستش، شیاطین، دوسری قوموں میں بھوت اور کہانت وغیرہ کے تخیلات، شراب خوری، قمار بازی، سود خواری، سفاکی اور بے رحمی وغیرہ جیسے مسائل زیر بحث آئے ہیں، اس کے بعد یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ اس ظلمت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خورشیدِ نبوت کس طرح طلوع ہوا، اور کیسے ظلمتِ شب کا فور ہو گئی، اور کیسے اس نبوت کا نور سرزمینِ عرب کو منور کر کے دنیا کو روشن کرتا چلا گیا، یہ موضوعات نئے تو نہیں تھے، ان پر گذشتہ چودہ سو سال سے کیا کچھ نہیں لکھا گیا ہے، بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، مگر سید صاحب نے ان ہی باتوں کو جس خاص انداز اور ذہن کو مطمئن کرنے والے پیرایہ میں لکھا ہے وہی اس کی نمایاں خوبیاں ہیں، قرآن مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت دی گئی تھی کہ لوگوں سے ایسی باتیں کہو کہ جو ان کے دلوں میں اثر کریں، اس ہدایت سے سید صاحب نے بہت کچھ سیکھا، اور سیکھ کر اپنی تحریروں کا سانچہ اس انداز میں ڈھالا کہ تمام لوگوں کے دلوں میں گھر کر تار ہا، اس جلد میں زیادہ تر عقائد پر بحثیں ہیں، علماء، حکماء، معتزلیں اور صوفیاء وغیرہ نے اپنے اپنے مسلک کے مطابق ان کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے، مگر ان میں کچھ اپنی کج گنج بیانی، کچھ اپنے عقیدوں کی غلو پسندی، اور کچھ دوسروں کے عقائد پر جارحانہ روش

کی وجہ سے ان موضوعات کو مؤثر اور دل نشین نہیں بنا سکے، سید صاحب نے ان مباحث میں صرف قرآن مجید اور احادیث کو اپنے لئے شمعِ ہدایت بنایا ہے، اور ان ہی کی روشنی میں اپنے خیالات کی تصریح کی ہے، مگر ان کا طرز استدلال کچھ ایسا ہے کہ اس سے متعسف علماء، ذہین متکلمین و بیدار مغز معتزلیں اور خمارِ توحید سے مخمور صوفیائے کرام کو بھی اختلاف نہ ہوگا، عام قارئین کے شکوک و شبہات کی ظلمتِ شب تو شب کا نور دکھائی دے گی، اس میں توحید کی جو بحث ہے، اس پر چودہ سو سال سے برابر بحث ہوتی آئی ہے، مگر اس کو اسلام نے جس طرح مادیت، جسمانیت اور انسانیت کی آلائشوں سے پاک کیا، اس کو جس ذہن رسا کے ساتھ اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے، وہ اس کا امتیازی وصف ہے، توحید کا مسئلہ جانا بوجھا ہوا ہے، لیکن اسی کو سید صاحب اپنے خاص حسن کے سہارے اس طرح پیش کرتے ہیں:

”اس کی قدرت بے انتہا ہے، اس کی وسعت غیر محدود ہے، اس کی مشیت کائنات کے ہر ذرہ میں نافذ ہے، اس کے علم کے احاطے میں اندھیرے اور اجالے کی ہر چیز داخل ہے، دلوں کے اسرار، ارمانوں کے الفاظ اور ہاتھ پاؤں کے اعمال سب ہر لحظہ اور ہر لمحہ اس کے روبرو ہیں، اس کے سامنے اپنے ہر عمل کا جوابدہ اور ذمہ دار ہے، اس کے مواخذہ کا خوف اور اس کی رحمت کی امید ہے، وہ محبوب ازل ہے، اس کی محبت کا نشہ ہمارے دلوں کی ہشیاری ہے، اس کے فضل و کرم اور لطف و محبت کی نیرنگیاں اوپر سے نیچے تک پھیلی ہیں، اس کی قوت ہر قوت پر غالب ہے، اس کا ارادہ ہر ارادہ میں نافذ، اس کا حکم ہر حکم سے بالاتر ہے، اس کی عبادت ہر مخلوق پر فرض اور اس کی اطاعت ہر مکلف پر واجب ہے، وہ ہر عیب سے پاک و منزہ اور ہر وصف کا مستحق ہے، اور اس سے متصف ہے، انسانوں کو اپنی یاد دلانے اور ان کے تزکیہ اور اصلاح کے لئے رسولوں اور پیغمبروں کو بھیجتا رہا، اور ان سے ہم کلام ہوتا رہا، اس کے کچھ احکام اور بندھے ہوئے قوانین ہیں، جن کی اطاعت نیکی اور نافرمانی گناہ ہے، وہ اندھیرے کی

روشنی، بھوکوں کی سیری، مایوسوں کی امید، زخمیوں کا مرہم، بے قراروں کی تسلی اور بیکسوں کا سہارا ہے، وہ ہم سے ہماری گردن کی رگ سے بھی قریب تر ہے، ہم اس کو جب پکارتے ہیں، تو وہ سنتا ہے، وہ نیکیوں کو پسند، اور گناہوں سے نفرت کرتا ہے، وہ جب چاہے، آسمان و زمین کو فنا کر دے، اور جب چاہے، پھر رچا دے، اس کی محبت دنیا کا حاصل، اس کی عبادت ہماری زندگی کا مقصود

اور اس کی یاد ہمارے دلوں کی راحت ہے۔ (سیرۃ النبیؐ ج/۴، ص/۲۸۸)

کیسی ڈھلی ہوئی عبارت ہے، اس کا لطف وہی لے سکتے ہیں، جن کو قرآن مجید پر عبور ہے، اور ان کا ہر جملہ قرآن مجید کی کسی نہ کسی آیت کا یا تو ترجمہ ہے، یا اس کی پرکیف تشریح ہے، قارئین اس تحریر کے طرز ادا کی لذت سے محفوظ ہونے کے علاوہ توحید کے نور سے اپنے ذہن کو منور کریں، اور ایک پیرا گراف میں توحید کا جو نقشہ کھینچ کر سامنے رکھ دیا گیا ہے، وہ ایک صاحب کمال اہل قلم ہی کے بس کی بات ہو سکتی ہے۔

سید صاحب کے قلم کا ایک بڑا وصف یہ بھی ہے کہ وہ جب چاہتے ہیں اپنی باوقار تحریر میں پرازتا شیر کی لذت پیدا کر دیتے ہیں، اس کے نمونے اس چوتھی جلد میں جا بجا ملیں گے، ایک نمونہ سے آپ بھی لذت آشنا ہوں۔

”عرب میں سرتاپا روحانی و اخلاقی انقلاب پیدا کر دینا، تمام عالم کے سامنے کامل ترین، اور آخری شریعت پیش کرنا، دنیا کے گوشہ گوشہ کو ترانہ توحید اور سرود محبت سے معمور کرنا، ظلمت کدہ عالم کو سراج منیر بن کر بقیعہ نور بنادینا، مگر اہوں کو راستہ بتانا، بھولوں کو یاد دلانا، بندوں کا رشتہ خدا سے جوڑنا، غلط اوہام کو مٹانا، اخلاق فاضلہ کا سکھانا، گناہوں کے دفتر کو دھونا، انسانوں کو شیطانوں کے دام فریب سے نکال کر فرشتوں کی صف میں کھڑا کرنا، دنیا کو رفیق و محبت، لطف و شفقت اور برادرانہ مساوات کی تعلیم دینا، حکمت و دانائی، پند و موعظت اور تہذیب و تمدن کے رموز سکھانا، روحانیت کی برباد شدہ دنیا کی دوبارہ تعمیر اور

قلوب و ارواح کے ویران گھروں کی از سر نو آبادی، الغرض خاتم النبیینؐ کا اصلی کام ایک شریعت ابدی کی تائیس، مذاہب عالم کی اصلاح فن اخلاق کی علمی و عملی تکمیل، قانون الہی کا اظہار و عرض اور تہذیب نفوس کی معراج اخیر تھی، اور یہ سب اس پر آشوب زمانے میں ہوتا رہا، جس کے لیل و نہار بظاہر صرف جملوں کے تیر باران کے روکنے میں صرف ہوئے۔“ (سیرۃ النبیؐ ج/۴، ص/۳۰۲)

یہ صرف لفظوں اور جملوں کا انبار نہیں، بلکہ ہر لفظ اور ہر فقرہ میں خیالات کی ایک دنیا آباد کر دی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے وجود پر اہم سے اہم فلسفیانہ، متکلمانہ اور معتزلانہ مباحث کئے گئے، لیکن حضرت سید صاحبؒ نے اس کے وجود کو جس رنگ میں پیش کیا ہے، اس سے ہم ذرا لطف لیں:

”یہ گونا گوں عالم، یہ رنگارنگ کائنات، یہ تاروں بھرا آسمان، یہ بوقلموں زمین، یہ سورج، یہ چاند، یہ درخت، یہ سمندر، یہ پہاڑ، یہ لاکھوں جاندار و بے جان اشیاء، یہ علیل و اسباب کا تسلسل، تغیر و انقلاب کا نظام، یہ کائنات کا نظم، اور اس کے ذرہ ذرہ کا قاعدہ و قانون، انسان کے اندرونی قوی، ان کی باہمی ترتیب، موت و حیات کے اسرار خواص و قوی کے رموز، انسان کی خیالی بلند پروازی، اور عملی عجز و درماندگی، یہ تمام باتیں خالق و صانع کے اعتراف پر مجبور کرتی ہیں، یہ نیلگوں آسمان کی چھت، یہ زمین کا سبزہ زار فرش، اور ایک ہی حرکت سے شب و روز کا انقلاب ایک خالق کل کا پتہ دیتا ہے۔“ (سیرۃ النبیؐ ج/۴، ص/۶۵-۶۴)

اور ذرا اس سلسلہ میں ایک چھوٹے سے اقتباس سے اپنے ذہن کو روشن کر لیں:

”یہ شب و روز کا نور و ظلمت، یہ سورج اور چاند کی روشنی، ان کی مقررہ رفتار، اور باقاعدہ طلوع و غروب اس کی دلیل ہے کہ اس اہل ایمان پر کوئی سوار ہے جس کے ہاتھ میں ان کا سیاہ و سفید ہے۔“ (ایضاً ۶۵)

ان باتوں کی تائید میں وہ جب قرآن مجید کی آیتیں پیش کرتے ہیں، تو ان کا مطالعہ کرتے وقت یہ خیال نہیں ہوتا کہ ہم عربی زبان کی کوئی عبارت پڑھ رہے ہیں، بلکہ ان کے ترجمے اپنی تحریروں کے ساتھ ایسا منسلک کر دیتے ہیں کہ ان کو پڑھتے وقت وہی لطف آتا ہے، جو عربی زبان کے ماہروں کو کلام پاک کی آیتوں کو پڑھنے میں آتا ہوگا۔

شرک کی حقیقت کو کس شگفتہ اسلوب میں پیش کرتے ہیں:

”شرک اور بت پرستی کا اصلی زینہ اسباب و موثرات کا وجود ہے، خدا نے عالم میں ایک سلسلہ اسباب قائم کر دیا ہے، اور عالم کے تمام واقعات اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں، لیکن یہ تمام سلسلہ ایک قادر مطلق کے دست قدرت میں ہے، اور اس سلسلہ کی ایک کڑی بھی اس کے اشارہ کے بغیر جنبش نہیں کر سکتی، شرک اس طرح شروع ہوتا ہے کہ پہلے انسان ان اسباب و علل میں سے بعض نمایاں اور قوی الاثر اسباب سے متاثر ہوتا ہے۔ اجرام فلکی کی عظمت، آفتاب و مانتاب کی نور افشانی، سمندر کا پر زور تلاطم، عناصر کی نیرنگ آرائیاں، انسان کو مبہوت کر دیتی ہیں، وہ ان کی عظمت و تاثیر سے متاثر، پھر منفعل اور بالآخر ان کا غلام بن جاتا ہے، اعتقاد کے پہلے مرحلہ میں انسان غور رسی کے دعویٰ سے اس قدر امتیاز اور تفریق کرتا ہے کہ یہ چیزیں خود خدا یا معبود نہیں ہیں، لیکن یہ تمیز آخر تک قائم نہیں رہتی بلکہ رفتہ رفتہ خوش اعتقادی کا اثر غالب آتا جاتا ہے، اور یہ چیزیں خدا کی شریک بنتی جاتی ہیں، یہاں تک کہ اصلی مسبب الاسباب نظر سے بالکل اوجھل ہو جاتا ہے۔“ (سیرۃ النبیؐ ج/۴ ص/۱۸-۱۷)

شاعروں کی زبانی دل کی نیرنگیاں تو بہت کچھ سننے میں آتی رہتی ہیں، اب ذرا سیرۃ النبیؐ کے مصنف سے اس کی بوقلمونی کا مشاہدہ کریں، رقمطراز ہیں:

”ہمارے ارادہ کا محرک ہمارے خیالات اور جذبات ہیں، اور ہمارے خیالات اور جذبات پر ہمارے اندرونی عقائد حکومت کرتے ہیں، عام بول

چال میں ان ہی چیزوں کی تعبیر ہم ”دل“ کے لفظ سے کرتے ہیں، اسلام کے معلم نے بتایا کہ انسان کے تمام اعضاء میں اس کا دل ہی نیکی اور بدی کا گھر ہے، فرمایا، انسان کے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، جو اگر درست ہے، تو تمام بدن درست ہے، اور اگر وہ بگڑ گیا تو تمام بدن بگڑ گیا، ہاں! وہ ٹکڑا دل ہے۔“ (ایضاً ج/۴ ص/۴۰۵)

آخری سطریں حدیث کے ترجمے ہیں، لیکن عبارت کے سلسلہ میں ایسے جڑ دئے گئے ہیں کہ تسلسل میں کوئی فرق نہیں ہونے پایا ہے، یہ تو حدیث کے ذریعہ سے دل کو سمجھایا گیا ہے، اب قرآن مجید کے ذریعہ اس کو اس طرح سمجھایا ہے:

”قرآن پاک نے دل (قلب) کی تین کیفیتیں بیان کی ہیں، سب سے پہلے قلب سلیم (سلامت رودل) جو ہر گناہ سے پاک رہ کر بالطبع نجات اور سلامت روی کے راستہ پر چلتا ہے، دوسرا اس کے مقابل قلب اثمیم (گنہگار دل) یہ وہ ہے جو گناہوں کی راہ اختیار کرتا ہے، اور تیسرا قلب مذبذب (رجوع ہونے والا دل) ہے۔ جو اگر کبھی بھٹکتا ہے، اور بے راہ بھی ہوتا ہے تو فوراً نیکی اور حق کی طرف رجوع ہو جاتا ہے۔“ (سیرۃ النبیؐ ج/۴ ص/۴۰۶)

یہ قسمیں بتا کر سید صاحب اپنے انشاء کے مخصوص رنگ میں لکھتے ہیں:

”غرض یہ سب نیرنگیاں اسی ایک بے رنگ ہستی کی ہیں، جس کا نام دل ہے، ہمارے اعمال کا ہر محرک، ہمارے اسی دل کا ارادہ اور نیت ہے، اس بھاپ کی طاقت سے اس مشین کا ہر پرزہ چلتا اور حرکت کرتا ہے۔“ (ایضاً ج/۴ ص/۴۰۶)

اس کے بعد یہ سمجھاتے ہیں کہ انسان کی علمی اصلاح کے لئے اس کی قلبی اصلاح مقدم ہے، اس کے دل پر اگر کوئی چیز حکمراں ہے، تو وہ اس کا عقیدہ ہے۔

اس کے لئے ضروری ہے کہ چند صحیح اصول و مقدمات کا ہم اس طرح تصور کریں کہ وہ دل کا غیر مشکوک یقین اور غیر متزلزل عقیدہ بن جائیں اور اسی صحیح یقین اور مستحکم عقیدہ

کے تحت ہی ہم اپنے تمام کام انجام دیں، اس کو اپنی دقت نظر سے کام لیتے ہوئے اس طرح سمجھاتے ہیں:

”جس طرح اقلیدس کی کوئی شکل چند اصول موضوعہ اور اصول متعارفہ کے مانے بغیر نہ بن سکتی ہے، اور نہ ثابت ہو سکتی ہے، اسی طرح انسان کا کوئی عمل صحیح و درست نہیں ہو سکتا، جب تک اس کے لئے چند مبادی اور چند اصول موضوعہ ہم پہلے تسلیم نہ کر لیں۔“ (ایضاً: ج/۴، ص/۴۰۷)

پھر عقل اور دل کی تھوڑی سی بحث آگئی ہے، اس کی تصریح کرنے میں اپنی فکر کی گہرائی کو بروئے کار لاتے ہیں:

”بظاہر عقل ہمارے کام کے لئے ہم کو رہنما نظر آتی ہے، لیکن غور سے دیکھو کہ ہماری عقل بھی آزاد نہیں، وہ ہمارے دلی یقین، ذہنی رجحانات اور اندرونی جذبات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے، اس لئے پابہ زنجیر عقل کے ذریعہ ہم اپنے دلی خیالات، ذہنی رجحانات اور اندرونی جذبات پر قابو نہیں پاسکتے، اگر پاسکتے ہیں تو اپنے صحیح دلی یقینات اور چند مضبوط دماغی ذہنی تصورات کے ذریعہ۔“ (سیرۃ النبیؐ ج/۴، ص/۴۰۷)

ان صحیح دلی یقینات اور مضبوط ذہنی تصورات کو سید صاحب ایمان اور عمل صالح سے تعبیر کرتے ہیں، اس کی مزید تصریح اس طرح کرتے ہیں:

”قرآن پاک نے ایمان کا ذکر ہمیشہ عمل صالح کے ذکر سے پہلے لازمی طور سے کیا ہے، اور ایمان کے بغیر کسی عمل کو قبول کے قابل نہیں سمجھا ہے، کہ ایمان کے عدم سے دل کے ارادہ خصوصاً اس مخلصانہ ارادہ کا بھی عدم ہو جاتا ہے، جس پر حسن عمل کا دار و مدار ہے۔“ (ایضاً: ج/۴، ص/۴۰۷)

عقیدہ، ایمان، عمل صالح اور حسن عمل کے دار و مدار کی وضاحت کس خوبصورتی سے کردی ہے، جس کو سمجھنے میں ایک عامی قاری کو بھی دقت نہیں ہوگی، انداز بیان کی یہی

سلامت اور سرلیق الفہمی ان کی تحریر کی خوبی ہے۔

اس جلد میں کچھ تاریخی واقعات بھی آگئے، جن کو قلمبند کرنے میں ان کا انداز بیان مؤرخانہ ہو گیا ہے، پانچویں صدی میں رومن امپائر کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

”پانچویں صدی کے خاتمہ پر مغربی حصہ کے نکل جانے کے بعد مشرقی صوبوں تک یعنی ڈیٹون سے لیکر دجلہ اور نیل تک کی سرزمین روم کے ماتحت رہ گئی تھی، لیکن اس کی حالت بھی روز بروز نازک سے نازک ہوتی جاتی تھی، مؤرخین کا بیان ہے، کہ رومن فوج کی مجموعی تعداد جو ایک زمانہ میں چھ لاکھ پینتالیس ہزار تھی، اب شاہ جیشین کے زمانہ یعنی ۵۲۷ء میں گھٹ کر ایک چوتھائی سے بھی کم یعنی کل ڈیڑھ لاکھ رہ گئی تھی، اور وہ بھی نہایت متفرق وابترا حالت میں، رعایا کی جگہیں خالی تھیں، فوج کی تنخواہیں چڑھی ہوئی تھیں اور امراء و اعیان سلطنت اپنے ذاتی مصارف کے لئے ہر طرح کے جعل و فریب، رشوت ستانی، اور لوٹ مار کو جائز رکھتے تھے، فوج میں یوں تو بہت سے سپاہیوں کے نام لکھے ہوئے تھے، لیکن میدان جنگ میں جانے کے وقت بہت تھوڑے سے لوگ تیار ہوتے، فوجی افسر فوج جنگ سیکھنے کے بجائے اپنا وقت باہمی حسد و رقابت میں صرف کرتے، اور ہر افسر کی یہ کوشش رہتی کہ دوسرے افسر کی بدنامی و ذلت سے فائدہ اٹھا کر خود ترقی و منصب حاصل کرے۔ اندرونی بد نظمیوں پر مستزاد یہ تھا کہ بیرونی غنیمت اہل روم کو ایک دم کے لئے چین سے بیٹھنے نہیں دیتے تھے، روم و فارس کے درمیان مدت سے لڑائیوں کا جو ایک غیر منقطع سلسلہ جاری تھا، پھر لومبارڈس، گوٹھن اور وینڈلس وغیرہ کے پیہم حملے روم کی رہی سہی قوت کو اور بھی پامال کر رہے تھے۔“ (سیرۃ النبیؐ ج/۴، ص/۲۲-۲۳)

اس سیاسی افراتفری میں مذہب کا جو حال ہوا، اس کی بہت دل خراش تصویر اس طرح کھینچی ہے:

”بت پرست رعایا کو چھوڑ کر جو ستاروں، دیوتاؤں اور بتوں کی پوجا میں بدستور

مصروف تھی، اور لوگ جنہوں نے عیسائیت قبول بھی کر لی تھی، وہ بھی باب، بیٹا، روح القدس اور مریم کی خدائی کے معتقد تھے، حضرت عیسیٰ، مریم اور روح القدس کی شخصیت اور مرتبہ کی تعیین نے بیسیوں فرقے پیدا کر دیئے تھے، جن میں زبانی مناظروں سے گذر کر جنگ وجدل کی نوبت آگئی تھی، یہاں تک کہ ۵۱۴ء میں خود عیسائیوں کے دو گروہوں کے درمیان ایک عظیم الشان مذہبی جنگ چھڑی جس میں ۶۵۰۰ عیسائیوں کو خارج البلد ہونا پڑا، اس جنگ عظیم کے علاوہ ہمہ وقت ہر فریق دوسرے فریق کے خون کا پیاسا رہا کرتا، اور بارہا چھوٹی چھوٹی باتوں پر کشت و خون کی نوبت آ جاتی، پادریوں نے اپنے منصب مذہبی کو حصول جاہ کا ایک ذریعہ قرار دے لیا تھا، اور اس بنا پر محض جب جاہ کی خاطر وہ ہر طرح کی ناجائز کوششوں میں مصروف رہتے۔“ (سیرۃ النبیؐ ج ۴، ص ۲۲۳-۲۲۴)

اور پھر اس زمانہ کی باہمی سفاکی کا ایک دل دوز منظر اس طرح پیش کرتے ہیں:

”اسقف اعظم سینٹ سرل..... کی ایک خاتون دوست ملیشیا نامی تھی، ایک روز وہ اپنی درس گاہ سے واپس آ رہی تھی کہ راہبوں کے ایک بہت بڑے گروہ نے اس پر حملہ کر دیا، گاڑی سے اتار کر برہنہ کی گئی، اور اس حالت میں تمام شہر کی سڑکوں پر گھسیٹے ہوئے اسے کلیسا میں لائے، جہاں پہنچ کر پادری پیٹر کے گرز سے اس کا خاتمہ کر دیا گیا، قتل کے بعد اس کا گوشت ہڈیوں سے جدا کیا گیا، نعش کے ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے، اور آلائش جسم کو آگ میں ڈال دیا گیا۔“ (ایضاً: ج ۴، ص ۲۲۳)

اتنا لکھ کر سید صاحب کچھ چبھتے ہوئے جملے لکھتے ہیں، جن میں زہریلا طنز بھی ہے، لیکن یہ ان حملوں کا مہذبانہ جواب ہے جو عموماً عیسائی مشنریوں اور مؤرخوں کی طرف سے اسلامی تاریخ کے ایسے واقعات پر ہوا کرتے ہیں۔

سید صاحب رقمطراز ہیں:

”یہ واقعات ایسے ہیں، جن کے ذکر سے آج قلم لرزتا ہے، مگر یہ عیسائی مذہب

کے علمبرداروں کا سب سے روشن کارنامہ ہے۔“

اس کے بعد لکھتے ہیں:

”بہی حالت ان تمام ملکوں کی تھی جہاں ان رومیوں کے زیر سایہ عیسوی مذہب پھیلا ہوا تھا، یعقوبی، نسطوری اور دوسرے فرقے جو سرکاری عیسوی مذہب سے الگ تھے، وہ در دراز صوبوں اور محکموں میں اپنی پناہ ڈھونڈتے تھے۔“ (سیرۃ النبیؐ ج ۴، ص ۲۲۲-۲۲۳)

اور اس کے بعد ان کے لکھنے کا انداز وہی ہے، جو مستشرقین اسلام پر حملہ کرنے میں اختیار کرتے ہیں، سید صاحب لکھتے ہیں:

”ہائیس کی کونسل کے بعد آریوس اور اس کے حریفوں میں جو معرکہ آرائیاں ہوئیں، انھوں نے اس حقیقت کو واضح کر دیا، کہ شہزادہ امن کا مذہب ان جنگ جویوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہونے سے بچ نہیں سکتا۔“ (ایضاً: ج ۴، ص ۲۲۴)

شہزادہ امن سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں، اس آخری اقتباس کے آخری جملہ سے عیسائی مذہب کی پوری تاریخ پر بڑی ضرب کاری لگادی گئی ہے۔

### سیرۃ النبیؐ جلد پنجم:

سیرۃ النبیؐ جلد چہارم کی اشاعت کے دو سال کے بعد سیرۃ النبیؐ جلد پنجم ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی، جس کی ضخامت ۳۷۵ صفحے ہے، چوتھی جلد کا موضوع عقائد تھا، اس پانچویں جلد کا موضوع عبادات ہے، یعنی اسلام میں عبادات کی حقیقت کیا ہے، اس کے اقسام کتنے ہیں، ان میں کیا مصلحت و حکمت رکھی گئی ہے، اس میں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے ابواب بھی ہیں، یہ موضوعات نئے نہیں ہیں، لیکن اس کتاب کے مصنف نے جس انداز میں ان کو پیش کیا ہے، اس کا مطالعہ کرتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم کو کچھ ایسی باتیں معلوم ہو رہی ہیں، جو پہلے معلوم نہ تھیں، حالانکہ وہ جانی بوجھی چیزیں ہیں، لیکن انداز بیان کی خوبی سے وہ چیزیں نئی معلوم

ہوتی ہیں، وہ کلام پاک کی چھوٹی بڑی اور لمبی آیتوں کو اپنی تحریروں میں اس طرح جڑ دیتے ہیں کہ وہ نگینوں کی طرح چمکتی نظر آتی ہیں، اور جب ان کے مطالب کو سمجھاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے سامنے دل نواز باتوں اور دلنشین تحریروں کا خوان یغما بچھا ہوا ہے، احادیث کی تشریح کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ محدثوں نے جن باتوں کی طرف توجہ نہیں دلائی تھی ان کی طرف توجہ دلا رہے ہیں، اس کتاب کے جو موضوعات ہیں ان میں فقہاء کا بڑا اختلاف رہا ہے لیکن اس سلسلہ میں سید صاحب نے جو کچھ لکھا ہے بڑے سے بڑے دیدہ ورفقہاء کو اس سے اب تک اختلاف نہیں ہوا ہے، اس میں ان کے انداز بیان سے ان کو بڑی مدد ملی، جس میں کچھ ان کے کلامی رنگ کے خیالات جملوں اور فقروں کے پیکر میں نہ صرف صفحات بلکہ سینہ دل میں بھی اترتے ہیں، مثلاً نماز کے متعلق رقمطراز ہیں:

”نماز کیا ہے؟ مخلوق کا اپنے دل و زبان اور ہاتھ پاؤں سے اپنے خالق کے سامنے بندگی اور عبودیت کا اظہار، اس رحمان اور رحیم کی یاد، اور اس کے بے انتہا احسانات کا شکریہ، حسن ازل کی حمد و ثنا، اور اس کی یکتائی اور بڑائی کا اقرار، یہ اپنے محبوب سے مجبور روح کا خطاب ہے، یہ اپنے آقا کے حضور میں جسم و جان کی بندگی ہے، یہ ہمارے اندرونی احساسات کا عرض نیاز ہے، یہ ہمارے دل کے ساز کا فطری ترانہ ہے، یہ خالق اور مخلوق کے درمیان تعلق کی گرہ اور وابستگی کا شیرازہ ہے، یہ بے قرار روح کی تسکین، مضطرب قلب کی تشریف اور مانوس دل کی دوا ہے، یہ فطرت کی آواز ہے، یہ حساس و اثر پذیر طبیعت کی اندرونی پکار ہے، یہ زندگی کا حاصل اور ہستی کا خلاصہ ہے۔“ (ایضاً: ج/۵/ص/۵۹)

یہ ادب لطیف کی عبارت نہیں، بلکہ اسلام کے ایک سچے عاشق کے دل کی آواز ہے اور کون ایسا عالم، متکلم، صوفی، عارف باللہ یا معمولی بندہ ہے، جو اس کو پڑھ کر سرشار نہ ہو جائے، ایسی عبارت آرائی، غنچوں، پھولوں، گلزاروں اور بلبل کی نغمہ سرائیوں کی مرقع آرائی کرتے وقت خوب نکھرتی ہے، مگر سید صاحب نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کو ریاض

رسول کے نکمت بیز اور شامہ نواز پھول ہی سمجھتے رہے، اس لئے ان کا ذکر کرنے میں بلبل خوشنوا ہی بنے رہے۔

زکوٰۃ کے جتنے افادی، شرعی اور فقہی پہلو ہیں، ان سب پر سید صاحب نے بحثیں کی ہیں، لیکن طرز ادا کی دل نشینی کی وجہ سے ان کو پڑھنے میں لطیف نکتے اور شریعت کے اسرار کی محرمی جدید ذہن پر بھی آشکارا ہوتی نظر آتی ہے، اس کی اہمیت کیلئے استدلال کا زور ملا حظہ کیجئے، لکھتے ہیں:

”قرآن پاک میں جہاں کہیں نماز کا ذکر ہے، اس کے متصل ہی برابر زکوٰۃ کا بھی بیان ہے، چنانچہ قرآن پاک میں ۲۰ مقامات پر اقام الصلوٰۃ کے بعد ہی ایفاء الزکوٰۃ آیا ہے۔“ (سیرۃ النبیؐ ج/۵/ص/۱۵۲)

اس کی اہمیت پر مزید زور یہ لکھ کر دیتے ہیں:

”محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام صرف دو لفظوں سے مرکب ہے، خدا کا حق اور بھائیوں کا حق، پہلے لفظ کا مظہر اعظم نماز اور دوسرے کا زکوٰۃ ہے، اس لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت حق جب بلند ہوئی تو اس کی پکاری ہر آواز ان ہی دو لفظوں کی تفصیل و تشریح تھی۔“

اور پھر ذرا دعویٰ کی اس بلند آہنگی پر غور کریں:

”نماز اور زکوٰۃ توام ہیں، ان ہی دو اجمالی حقیقتوں کی تشریح کا نام اسلام ہے۔“ (ج/۵/ص/۱۵۵-۱۵۴)

اس سلسلہ میں ان کے قلم کا زور کس طرح بروئے کار آ جاتا ہے، اس کے ایک نمونہ سے پھر ایک بار لطف اندوز ہوں:

”زکوٰۃ یا دوسرے الفاظ میں غریبوں کی چارہ گری، مسکینوں کی دست گیری، مسافروں کی امداد، یتیموں کی خبر گیری، بیواؤں کی نصرت، غلاموں اور قیدیوں کی اعانت، نماز کے بعد اسلام کی عبادت کا دوسرا رکن ہے، اور اس فریضہ کی

سب سے پہلی اہمیت ہے، جو مذاہب کی تاریخ میں نظر آتی ہے۔“

(سیرۃ النبیؐ ج/۵، ص/۱۵)

روزہ کی تصریح کرتے ہوئے اپنے لسانی ذوق کا ثبوت یہ لکھ کر دیتے ہیں:

”روزہ اسلام کی عبادت کا تیسرا رکن ہے، عربی میں اس کو ”صوم“ کہتے ہیں، جس کے لفظی معنی رکنے اور چپ رہنے کے ہیں، بعض مفسرین کی تفسیروں کے مطابق قرآن پاک میں اس کو کہیں کہیں صبر بھی کہا گیا ہے، جس کے معنی ضبط نفس، ثابت قدمی اور استقلال کے ہیں۔“

پھر اس کی غایت کی تصریح اس حسن ادا سے کرتے ہیں۔

”اسلام کی زبان میں روزہ کا کیا مفہوم ہے، وہ درحقیقت نفسانی ہوا و ہوس اور بے بسی خواہشوں سے اپنے آپ کو روکنے، اور حرص و ہوا کے ڈگمگادینے والے موقعوں میں اپنے آپ کو ضابط اور ثابت قدم رکھنے کا نام ہے، روزانہ کے استعمال میں عام طور سے نفسانی خواہشوں اور ان کی حرص و ہوا کا مظہر تین چیزیں ہیں، کھانا، پینا اور عورت و مرد کے جنسی تعلقات، ان ہی سے ایک مدت متعینہ تک رکے رہنے کا نام شرعاً روزہ ہے، لیکن دراصل ان ظاہری خواہشوں کے ساتھ باطنی خواہشوں اور برائیوں سے دل اور زبان کا محفوظ رکھنا بھی خواص کے نزدیک روزہ کی حقیقت میں داخل ہے۔“ (ایضاً: ج/۵، ص/۲۸۱)

رمضان کے مقدس مہینے میں قرآن کے نزول کا آغاز ہوا۔ اس کے تقدس کا احساس ہمارے دلوں میں یہ لکھ کر پیدا کرنا چاہتے ہیں:

”رمضان وہ مقدس مہینہ ہے، جس میں قرآن سب سے پہلی بار دنیا میں نازل ہوا، پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام کو عالم کی رہنمائی اور انسانوں کی دست گیری کے لئے دستور نامہ الہی کا سب سے پہلا صفحہ عنایت کیا گیا۔“

(سیرۃ النبیؐ ج/۵، ص/۲۰۹)

پھر رمضان کے روزے کی اہمیت کو اس بلیغ انداز میں بتایا ہے کہ:

”یہ روزہ انبیاء علیہم السلام کی صرف پیروی اور تقلید ہی نہیں، بلکہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے عظیم الشان احسان کا شکریہ ہے، جو اس نے اپنے پیغمبر صادق کے ذریعہ انسانوں پر کیا، اور اس کی احسان شناسی کا احساس ہے، وہ کتاب الہی، وہ تعلیم ربانی، وہ ہدایت روحانی جو ان ایام میں انسانوں کو عنایت ہوئی، جس نے ان کو شیطان سے فرشتہ اور ظلمات سے نورانی بنایا، پستی و ذلت کے عمیق غار سے نکال کر ان کو اوج کمال تک پہنچایا، ان کی وحشت کو تہذیب و اخلاق سے، ان کی جہالت کو علم و معرفت سے، ان کی نادانی کو حکمت و دانائی سے اور ان کی تاریکی کو بصیرت اور روشنی سے بدل دیا، ان کی قسمتوں کے پانسے الٹ دئے، اور فضل و دولت اور خیر و برکت کے خزانوں سے ان کے کاشانوں کو معمور کر دیا، جس نے ذرہ بے مقدار کو آفتاب اور مشیت خاک کو ہمدوش ثریا بنا دیا، قرآن پاک اپنے ان الفاظ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

”لَتَكْبِرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ“.

”اور (یہ رمضان کا روزہ) اس لئے فرض ہوا تاکہ تم اللہ کی بڑائی کرو کہ تم کو اس نے ہدایت دی اور تاکہ تم اس کا شکریہ ادا کرو۔“ (سیرۃ النبیؐ ج/۵، ص/۳۶۰)

حج پر بھی لمبی بحث ہے، لیکن اس سلسلہ میں خانہ کعبہ کے متعلق ان کی جو سرشارانہ تحریر ہے، اسی سے حج کی ساری تفصیلات معلوم ہو جائیں گی، اس اقتباس کو پڑھتے وقت اپنا جائزہ اس حیثیت سے لیں کہ اس کے لکھنے والے پر جو انبساطی کیفیت طاری ہے، اس کا اثر آپ کے دل پر کیا مترتب ہوتا ہے؟

”خانہ کعبہ اس دنیا میں عرش الہی کا سایہ اور اس کی رحمتوں اور برکتوں کا نقطہ قدم ہے، یہ وہ آئینہ ہے، جس میں اس کی رحمت و غفاری کی صفیتیں اپنا عکس ڈال کر تمام کرۂ ارض کو اپنی شعاعوں سے منور کرتی ہیں، یہ وہ منبع ہے، جہاں سے حق

پرستی کا چشمہ ابلا، اور اس نے تمام دنیا کو سیراب کیا، یہ روحانی علم و معرفت کا وہ مطلع ہے، جن کی کرنوں نے زمین کے ذرہ ذرہ کو درخشاں کیا، یہ وہ جغرافی شیرازہ ہے، جس میں ملت کے وہ تمام افراد بندھے ہوئے ہیں، جو مختلف ملکوں اور اقلیموں میں بستے ہیں، مختلف زبانیں بولتے ہیں، مختلف لباس پہنتے ہیں، مختلف تمدنوں میں زندگی بسر کرتے ہیں، مگر وہ سب کے سب باوجود ان فطری اختلافات اور طبعی امتیازات کے ایک ہی خانہ کعبہ کے گرد چکر لگاتے ہیں اور ایک ہی قبلہ کو اپنا مرکز سمجھتے ہیں، اور ایک ہی مقام کو ام القریٰ مان کر وطنیت، قومیت، تمدن، معاشرت، رنگ روپ اور دوسرے امتیازات کو مٹا کر ایک ہی وطن، ایک ہی قومیت (آل ابراہیم) اور ایک ہی تمدن و معاشرت (ملت ابراہیمی) اور ایک ہی زبان (عربی) میں متحد ہو جاتے ہیں، اور یہ وہ برادری ہے، جس میں دنیا کی تمام قومیں اور مختلف ملکوں کے بسنے والے جو وطنیت اور قومیت کی لعنتوں میں گرفتار ہیں، ایک لمحہ اور ایک آن میں داخل ہوتے ہیں، جس سے انسانوں کی بنائی ہوئی تمام زنجیریں اور قیدیں اور بیڑیاں کٹ جاتی ہیں اور تھوڑے دن کیلئے ایک لباس احرام میں، دوش بدوش عرصہ حج میں تمام قومیں ایک ملک میں ایک قوم بلکہ ایک خانوادہ کی برادری بن کر کھڑی ہوئی ہیں، اور ایک ہی بولی میں خدا سے باتیں کرتی ہیں، یہی وحدت کا وہ رنگ ہے، جو ان تمام مادی امتیازات کو مٹا دیتا ہے جو انسانوں میں جنگ و جدل اور فتنہ و فساد کے اسباب ہیں، اس لئے یہ حرم ربانی نہ صرف اس معنی میں امن کا گھر ہے، کہ یہاں ہر قسم کی خوریزی اور ظلم و ستم ناروا ہے، بلکہ اس لحاظ سے بھی امن کا گھر ہے کہ دنیا کی قوموں کی ایک برادری قائم کر کے ان کے تمام ظاہری امتیازات کو جو دنیا کی بدامنی کا سبب ہیں، مٹا دیتا ہے۔“ (سیرۃ النبیؐ ج/۵، ص/۷۵-۷۷)

اس جلد میں جہاد پر بھی بحث ہے، اس کی لغوی، معنوی اصطلاحی اور عمومی حیثیت

کو کس ٹھنڈے پیرایہ میں سمجھاتے ہیں، وہ ذرا ہم آپ بھی سمجھنے کی کوشش کریں، لکھتے ہیں:

”جہاد کے معنی عموماً قتال اور لڑائی کے سمجھے جاتے ہیں، مگر مفہوم کی یہ تنگی قطعاً غلط ہے۔ جہاد کا لفظ جہد سے نکلا ہے، جہاد، مجاہدہ، فعال اور مفاعلت کے وزن پر اسی جہد سے مصدر ہیں، اور لغت میں اس کے معنی محنت اور کوشش کے ہیں، اسی کے قریب قریب اس کے اصطلاحی معنی بھی ہیں، یعنی حق کی بلندی، اس کی اشاعت اور حفاظت کے لئے ہر قسم کی جدوجہد قربانی اور ایثار گوارا کرنا، اور ان تمام جسمانی، مالی اور دماغی قوتوں کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو ملی ہیں، اس راہ میں صرف کرنا، یہاں تک کہ اس کے لئے اپنے عزیز و قریب، اہل و عیال، خاندان اور قوم کی جان تک کو قربان کر دینا، حق کے مخالفوں اور دشمنوں کی کوششوں کو توڑنا، ان کی تدبیروں کو رانگاں کرنا، ان کے حملوں کو روکنا، اور اس کے لئے جنگ کے میدان میں اگر ان سے لڑنا پڑے تو اس کے لئے بھی پوری طرح تیار رہنا، یہی جہاد ہے، اور یہ اسلام کا ایک رکن اور بہت بڑی عبادت ہے۔“ (ایضاً: ج/۵، ص/۲۹۹)

پھر جہاد بالنفس، جہاد بالعلم، اور جہاد بالمال کو جس طرح آسانی سے سمجھا دیتے ہیں، اس کے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی، اور پھر دائمی جہاد کو کیسے ولولہ انگیز پیرایہ میں سمجھاتے ہیں:

”دائمی جہاد یہ ہے کہ پر امن دین کی حمایت، علم دین کی اشاعت، حق کی نصرت، غریبوں کی مدد، زیر دستوں کی امداد، سیہ کاروں کی ہدایت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اقامت عدل، زور و ظلم اور احکام الہی کی تعمیل میں ہمہ تن اور ہر وقت لگا رہے۔“ (ایضاً: ج/۵، ص/۳۰۹)

یہ تحریر ایجاز کی بھی ایک مثال ہے، اس کا اطناب جس طرح سے چاہیں کر لیں، ان کی تحریروں میں جو کرشمہ سازیاں ہیں اس کا ذکر پہلے آچکا ہے، اب اس جلد میں لکھتے ہیں کہ جسمانی اور مالی عبادات کے علاوہ قلبی عبادات بھی ہیں، جن کا تعلق نفس کی اندرونی



کیفیتوں سے ہے، سید صاحب کے خیال میں ان قلبی عبادات میں سرفہرست تقویٰ ہے، اس کی لغوی، اصطلاحی، مذہبی اور روحانی حیثیت کو سمجھانے میں ایک معلم کے فرائض ادا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، فرماتے ہیں:

”قلبی عبادت میں سرفہرست تقویٰ ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام تعلیمات کا خلاصہ بلکہ روح ہے، عربی زبان میں اس کے لغوی معنی بچنے، پرہیز کرنے اور لحاظ کرنے کے ہیں، لیکن وحی محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی اصطلاح میں یہ دل کی اُس کیفیت کا نام ہے، جو اللہ تعالیٰ کے ہمیشہ حاضر و ناظر ہونے کا یقین پیدا کر کے دل میں خیر و شر کی تمیز کی خلش اور خیر کی طرف رغبت اور شر سے نفرت پیدا کر دیتی ہے، دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے، کہ وہ ضمیر کے اس احساس کا نام ہے، جس کی بناء پر ہر کام میں خدا کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے، تقویٰ والا وہ ہے جو اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں سچائی لے کر آئے اور اس ابدی سچائی کو سچ بنائے، وہ کسی کام میں ظاہری فائدہ، فوری ثمرہ، مال و دولت اور جاہ و عزت کے نقطہ پر نہیں بلکہ سچائی کے پہلو پر نظر رکھتا ہے، اور خواہ کسی قدر اس کا بظاہر نقصان ہو مگر وہ سچائی اور راست بازی کے جادہ سے بال بھر ہٹنا نہیں چاہتا، جب وہ ہر کام میں خدا کی مرضی اور پسندیدگی پر نظر رکھتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ بھی ان کو اپنی طرف سے اپنے انعام اور فضل کا صلہ عطا فرماتا ہے، اور بڑا صلہ یہ ہوتا ہے کہ دنیا ہی میں بندوں کے درمیان ان کے ساتھ عقیدت، محبت اور ہر دل عزیزی پیدا ہوتی ہے۔“ (سیرۃ النبیؐ ج/۵، ص/۱۶-۳۱۴)

یہی بات محراب کے نیچے منبر پر بھی کہی جاتی ہے، لیکن اس میں واعظانہ رنگ ہو جاتا ہے، اور ان کا رنگ بظاہر تو معلمانہ ہے، لیکن اس کو پڑھتے وقت کچھ فلسفیانہ طرز فکر کا احساس بھی پیدا ہو جاتا ہے۔

اخلاص کو بھی قلبی عبادت بتایا ہے، اس کو تحریر کے پورے وزن کے ساتھ سمجھایا ہے۔ ”جو نیک کام بھی کیا جائے، اس کا محرک دنیاوی غرض نہ ہو، اور نہ اس سے مقصود نمائش، جلب منفعت، طلب شہرت، طلب معاوضہ وغیرہ ہو، بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری اور خوشنودی ہو، اسی کا نام اخلاص ہے۔“ (ایضاً: ج/۵، ص/۳۳۰)

تو کل کو بھی قلبی عبادت قرار دیتے ہیں، اس کے سمجھانے کا یہ متین انداز ہے: ”تو کل جس قلبی یقین کا نام ہے، اس کے قریب قریب آج کل کے اخلاقیات میں خود اعتمادی کا لفظ بولا جاتا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ کامیاب افراد وہی ہوتے ہیں، جن میں یہ جوہر پایا جاتا ہے، لیکن اس خود اعتمادی کی سرحد سے بالکل قریب، غرور اور فریب نفس کے گڈھے اور غار بھی ہیں، اس لئے اسلام نے انسانیت کی خود اعتمادی کے بجائے خدا اعتمادی کا نظریہ پیش کیا ہے جو ان خطروں سے محفوظ ہے۔“ (ایضاً: ج/۵، ص/۳۳۶)

صبر کو بھی قلبی عبادت میں شمار کیا ہے اور اس کو اس طرح ذہن نشین کرایا ہے: ”صبر بے بسی اور بے کسی یا دشمن سے کسی مجبوری کے سبب سے انتقام نہ لینے کا نام صبر نہیں، بلکہ لغوی معنی تو اس کے روکنے اور سہارنے کے ہیں، معنوی حقیقت اس کی یہ ہے کہ اپنے نفس کو اضطراب اور گھبراہٹ سے روکنا اور اس کو اپنی جگہ پر ثابت قدم رکھنا یہی صبر کی معنوی حقیقت بھی ہے، یعنی اس کے معنی بے اختیاری کی خاموشی اور انتقام نہ لے سکنے کی مجبوری کے نہیں، بلکہ پامردی، دل کی مضبوطی، اخلاقی جرأت اور ثبات قدم کے ہیں۔“

(ایضاً: ج/۵، ص/۳۳۷)

پھر اس کی مختلف قسموں پر بحث کرنے میں اپنی نکتہ وری اور نکتہ سنجی کا بھی ثبوت دیا ہے۔ شکر کو بھی قلبی عبادت میں شمار کیا ہے، تحریر فرماتے ہیں، کہ اللہ پاک کے احسانوں اور نعمتوں کو بھلا کر دل سے اس کا احسان مند نہ بننا، زبان سے ان کا اقرار اور عمل سے اپنی

اطاعت شعاری اور فرمانبرداری ظاہر نہ کرنا کفر ہے، جس کے مرتکب کا نام کافر ہے، اس کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کے احسانات اور نعمتوں کی قدر جان کر اس کے احکام کی اطاعت اور دل سے فرمانبرداری کا نام شکر ہے، پھر قرآن مجید کی بہت سی آیتوں کی تفسیر بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

”بندوں کے ساتھ حسن سلوک، اور نیک برتاؤ کی حقیقت بھی شکر ہی ہے، دولت مند اگر اپنی دولت کا کچھ حصہ خدا کی راہ میں دیتا ہے، تو یہ دولت کا شکر ہے، صاحب علم اپنے علم سے بزرگان خدا کو فائدہ پہنچاتا ہے تو یہ علم کی نعمت کا شکر ہے، طاقتور کمزوروں کی امداد اور اعانت کرتا ہے، تو یہ بھی قوت اور طاقت کی نعمت کا شکرانہ ہے۔“ (سیرۃ النبیؐ ج/۵، ص/۳۵۸)

ایسی عبارت کوئی عارف باللہ ہی لکھ سکتا ہے، اوپر کی تمام باتیں تو کلام پاک کی ہیں، لیکن ان کو اس طرح کاغذ کے صفحات پر منتقل کیا ہے کہ پڑھنے والے محسوس کرتے ہیں کہ جو چیزیں ان کے تحت الشعور میں دبی ہوئی تھیں وہ ابھر رہی ہیں، اور یہ تمام چیزیں کچھ ایسی فصاحت اور سلاست سے قلمبند ہوئی ہیں کہ پہلی نظر میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایسی عبارت تو جو چاہے لکھ سکتا ہے لیکن اس کو سامنے رکھ کر کوئی ایسی تحریر لکھنا چاہے تو اس کو اپنی کوتاہ قلمی اور کج بیانی کا احساس ہو جائے، سید صاحب کی تحریر کی امتیازی شان یہی ہے کہ موضوع تو خالص مذہبی ہوتا ہے، لیکن اس کو قلمبند اس طرح کرتے ہیں کہ پڑھتے وقت محسوس ہوتا ہے کہ ہم کو روح افزا اثر بت پلایا جا رہا ہے، اور ہم خوش خوش پی رہے ہیں۔ اس میں جا بجا فقہی مسائل پر بھی مباحث ہیں، ان میں مناظرانہ رنگ پیدا ہونے نہیں دیا ہے، بلکہ آیات اور احادیث کے ذریعہ سے جس نتیجہ پر وہ خود پہنچے تھے، ان کو اس طرح قلمبند کر دیا ہے کہ پڑھنے والوں کے ذہن میں شکوک و شبہات نہ رہیں۔

پانچوں وقتوں کی نماز کی تفصیل اس طرح بتاتے ہیں:

”نماز فجر کا بالتصریح ذکر طہ، طور، دہر، ہود، ق، روم اور نور میں، ظہر کا بالا جمال

دہر، ق، طہ اور اسراء میں اور بالتصریح اسراء اور روم میں، عصر کا بقرہ، دہر، ہود، طہ، ق اور روم میں، مغرب کا بالا جمال، ہود، طہ اور روم میں، اور بالتصریح ق میں، عشاء کا بصورت صلاة اللیل منزل، طور اور دہر میں، اور بصورت عشاء بالا جمال ہود، اور روم میں، اور بالتصریح ق اور ہود میں ہے، تمام نمازوں کا بالا جمال تذکرہ بقرہ، اسراء اور طہ میں ہے، طور میں فجر اور عشاء دو وقتوں کی نماز، اسراء، ہود، اور طہ سے کم از کم بظاہر تین وقتوں کی، روم سے چار وقتوں کی نماز ثابت ہے۔“ (سیرۃ النبیؐ ج/۵، ص/۹۱)

جمع بین الصلوٰتین کی تصریح کرتے ہوئے وقت قرآن مجید کی یہ آیت سامنے رکھی۔  
”فَسُبْحَنَّ اللّٰهَ حِينَ تُمْسُونَ وَ حِينَ تُصْبِحُونَ، وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَ حِينَ تُظْهِرُونَ.“

”اللہ کی تسبیح کرو، جب شام (یا رات) کرو اور جب صبح کرو، اور اس کی حمد آسمان اور زمین میں ہے، اور اخیر دن کو اس کی تسبیح کرو اور ظہر کو۔“  
اس کی تفسیر بیان کرنے میں پورے مسئلہ کا حل پیش کر دیا ہے، لکھتے ہیں کہ: ”سورہ کی اس آیت میں ظہر و عصر کا نام تصریح کے ساتھ آیا ہے، مگر شام کی نماز میں اجمال ہے۔ مغرب و عشاء دونوں ”حین تمسون“ (جب رات کرو) کے ذریعہ سے ادا کر دیا گیا، اس سے اس جانب ایک لطیف اشارہ نکلتا ہے کہ یہ دونوں مل کر ایک بھی ہیں اور علیحدہ بھی ہیں، اسی بناء پر اشد ضرورت اور سفر کی بے اطمینانی کے وقت ظہر و عصر کو ایک ساتھ اور مغرب و عشاء کو ایک ساتھ ملا کر بھی ادا کر سکتے ہیں، اور صبح کی نماز چونکہ ہر آیت میں ہمیشہ علحدہ ذکر کی گئی، اس لئے اس کا کسی دوسری نماز سے ملانا ناجائز نہیں، احادیث میں جمع بین الصلوٰتین کے عنوان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی مثالیں اس نکتہ قرآنی کی تصریح میں موجود ہیں۔ (سیرۃ النبیؐ ج/۵، ص/۹۲-۹۱)

نماز باجماعت کی تصریح جس طرح کی ہے، اس سے ہم آپ لطف اندوز ہونے کے علاوہ کچھ سبق بھی حاصل کریں۔

”کسی قوم کی زندگی، اس کی نظم جماعت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی، یہی گرہ جب کھل جاتی ہے تو قوم کا شیرازہ منتشر و پراگندہ ہو جاتا ہے۔“

اسلام میں نماز باجماعت مسلمانوں کی زندگی کی عملی مثال ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عملی مثال کو عربوں کے سامنے پیش کر کے ان کی زندگی کا خاکہ کھینچا، اور بتایا کہ مسلمانوں کا یہ صف بہ صف کھڑا ہونا، ایک دوسرے کے شانہ سے شانہ ملانا اور یکساں حرکت و جنبش کرنا، ان کی قومی زندگی کی مستحکم و مضبوط دیوار کا مسالہ ہے، جس طرح نماز کی درستی اس صف اور نظام جماعت کی درستی پر موقوف ہے، اس طرح پوری قوم کی زندگی اس باہمی تعاون، تضامن، مشارکت، میل جول اور باہمی ہمدردی پر موقوف ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صفوں کی درستی پر بہت زور دیتے تھے، اور فرماتے تھے کہ جب تک تم خوب مل کر کھڑے نہ ہو گے تمہارے دل آپس میں نہ ملیں گے۔ (سیرۃ النبیؐ ج/۵ ص/۹۱)

### سیرۃ النبیؐ جلد ششم:

سیرۃ النبیؐ جلد پنجم کی اشاعت کے پانچ سال کے بعد سیرۃ النبیؐ جلد ششم ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی جس کی ضخامت ۸۸۸ صفحے ہے، اس وقت سید صاحب کی عمر پچپن سال کی ہو چکی تھی، اس کی ضخامت اور اس کے مسائل کے مباحث سے اندازہ ہوتا ہے، کہ ان کی تصنیفی زندگی کی جوانی، رعنائی اور دل آویزی برقرار تھی، اور پہلے ہی کی طرح ان کے قلم کا طاؤس رقص کرتا نظر آتا ہے، اس جلد کا موضوع اسلام میں اخلاقیات ہے، اس کا تقاضا یہ تھا کہ اس کے طرز میں گہرائی اور گیرائی ہو، اور طرز ادا میں عظمت اور وقار ہو، یہی چیز ان کی اس پوری کتاب میں چھائی نظر آتی ہے جو ان کی انشاء پر دازی کے مختلف جلوؤں میں سے

ایک علحدہ جلوہ ہے، اس میں فضائل اخلاق، رذائل اخلاق اور آداب اخلاق کے علحدہ علحدہ عنوانات کے تحت مباحث ہیں، ان میں جو بات کہی گئی ہے، اس کی تائید میں پہلے قرآن مجید کی آیتیں اور مقدس حدیثیں پیش کر دی گئی ہیں اور یہ تمام مباحث اس لئے خشک نہیں ہونے پائے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی کے جلوہ ہائے ہزار رنگ کو اس طرح قلمبند کیا گیا ہے کہ شروع سے آخر تک کتاب پڑھتے وقت یہ نہیں محسوس ہوتا کہ ہم مواظب کی کوئی کتاب پڑھ رہے ہیں، بلکہ محبت بھری حکایتوں کے ایک مجموعہ سے دل و دماغ کو محفوظ کر رہے ہیں، ان واقعات کو جمع کرنا تو تلاش و تحقیق کی دلیل ہے، لیکن ان کو دل نشین اور دل آویز انداز میں پیش کرنے میں قلم کے اعجاز کی ضرورت تھی، جو اس میں پورے طور پر نظر آتا ہے، اس ضخیم کتاب میں جو اخلاقی تعلیمات دی گئی ہیں وہ تو اس مقالہ کا موضوع نہیں، لیکن جس طرح وہ قلمبند کی گئی ہیں، ان کا پورا تو نہیں، ہاں تھوڑا سا احاطہ کرنا یہاں پر ضروری ہے۔

طرز ادا کی رعنائی کا اندازہ حسب ذیل اقتباس سے کریں:

”ایمان کے بعد، نماز روزہ، حج اور زکوٰۃ کے چار ستونوں پر قائم بتایا گیا ہے، بظاہر یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے، کہ اسلام کی اس عمارت میں اخلاق حسنہ کو کوئی جگہ ہی نہیں دی گئی ہے اور بے سمجھ واعظوں کی غلط بیانی سے اس غلط فہمی میں اور اضافہ ہو گیا ہے، حالانکہ عبادات کے شروع میں ہم یہ بتا چکے ہیں کہ دوسرے اہم مقاصد کے علاوہ ان عبادات سے ایک مقصد انسان کے اخلاق حسنہ کی تربیت اور تکمیل ہے، قرآن پاک میں یہ نکتہ ہر جگہ واضح کر دیا گیا ہے، چنانچہ نماز کا ایک فائدہ اس نے یہ بتایا ہے کہ وہ بری باتوں سے باز رکھتی ہے، روزہ کی نسبت بتایا ہے کہ تقویٰ کی تعلیم دیتا ہے، زکوٰۃ سرتاپا انسانی ہمدردی اور غم خواری کا سبق ہے، اور حج بھی مختلف طریقوں سے ہماری اخلاقی اصلاح و ترقی کا ذریعہ اور اپنی اور دوسروں کی امداد کا وسیلہ ہے، اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے ان چاروں ارکان کے نام

الگ الگ جو کچھ ہوں، مگر ان کے بنیادی مقاصد میں اخلاقی تعلیم کا راز مضمر ہے، اگر ان عبادات سے یہ روحانی اور اخلاقی ثمرہ ظاہر نہ ہو تو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ احکام الہی کی محض لفظی تعمیل اور عبادت کے جوہر و معنی سے یکسر خالی اور معرا ہیں، وہ درخت ہیں جن میں پھل نہیں، وہ پھول ہیں جن میں خوشبو نہیں، وہ قالب ہیں جن میں روح نہیں۔“ (سیرۃ النبیؐ ج/۶، ص/۱۰-۱۱)

آخر کے چند جملوں سے ان مذہبی مواعظ میں کیسی دلکشی پیدا ہو گئی ہے، ذرا حسب ذیل ٹکڑوں سے اپنے قلب کو منور کریں:

”یہ ظاہری اخلاق ہماری اندرونی ایمانی کیفیت کا معیار اور پیمانہ ہیں، ہمارے دل کے اندر کا ایمان ہمارے گھر کا چراغ زیر دامن ہے، اس کی چمک دمک اور روشنی کا اندازہ اس کی باہر نکلنے والے شعاعوں سے کیا جائے گا۔“ (سیرۃ النبیؐ ج/۶، ص/۲۳)

”اسلام نے انسان کی روحانی تکمیل کا ذریعہ اخلاق کو اسی لئے قرار دیا ہے کہ وہ صفات الہی کے انوار کے کسب و فیض کا سبب ہے، ہم جس حد تک اس کسب و فیض میں ترقی کریں گے ہماری روحانی ترقی کا سلسلہ جاری رہے گا، اور یہی ہماری زندگی کی روحانی سیر کی آخری منزل ہے، اخلاق کا اس سے بلند تر تخیل ممکن نہیں۔“ (سیرۃ النبیؐ ج/۶، ص/۲۷)

”دنیا کے آخری معلم کی تعلیم میں حکم خداوندی اور عقلی دقیقہ رسی، فرمان الہی اور اخلاقی نکتہ وری، امر ربانی اور حکم فطرت، کتاب اور حکمت دونوں کی آمیزش ہے۔“ (سیرۃ النبیؐ ج/۶، ص/۲۸)

”انبیاء علیہم السلام جو کچھ کہتے ہیں، وہ کرتے ہیں، جو ان کی تعلیم ہے، وہی ان کا عمل ہے، جو ان کے منہ پر ہے، وہی دل میں ہے، اس لئے ان کی تعلیم اور صحبت کا فیضان خوشبو بن کر اڑتا، اور ہم نشینوں کو معطر بنا دیتا ہے، یہی وہ فرق ہے جو انبیاء اور حکماء یعنی موسیٰ، عیسیٰ، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سقراط،

افلاطون اور ارسطو میں نمایاں ہیں، سقراط اور افلاطون کے مکالمات اور ارسطو کے اخلاقیات کو بڑھ کر ایک شخص بھی صاحب اخلاق نہ بن سکا، مگر یہاں قوموں کی قومیں ہیں جو موسیٰ و عیسیٰ اور محمد رسول اللہ علیہم السلام کی تعلیم و تلقین سے اخلاق کے بڑے بڑے مدارج پر پہنچیں، اور آج زمین کے کرہ پر جہاں کہیں بھی حسن اخلاق کی کوئی کرن ہے، وہ نبوت ہی کے کسی مطلع انوار سے چھن کر نکل رہی ہے۔“ (سیرۃ النبیؐ ج/۶، ص/۳۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ حسنہ کا اعلیٰ رتبہ متعین کرنا چاہتے ہیں تو پہلے آپ سے پہلے کے انبیاء کرام کا ذکر کرتے ہیں، مثلاً حضرت عیسیٰ السلام کا ذکر جس اسلوب میں کرتے ہیں، اس کا لطف لیتے ہوئے اس کی نکتہ آرائی پر بھی غور کریں:

”کوہ زیتون کے پرتا شیر و اعظ یعنی حضرت عیسیٰ کی معصومانہ باتیں، سچائی اور راست بازی کی نصیحتیں اور لفظی صنائع و بدائع اور دلکش تمثیلوں سے بھری ہوئی تقریریں، دنیا نے سنیں، اور ان کی فصاحت اور شیرینی کا مزہ اب تک اس کے کام و دہن میں ہے، مگر کیا اس کی آنکھوں نے اس معصوم و اعظ کی عملی مثالیں بھی دیکھیں؟ کیا اس سلبی پہلو کے سوا اس کے اخلاق کا کوئی ایجابی پہلو بھی ہمارے سامنے ہے؟ وہ جس نے یہ کہا کہ سب کچھ جو تمہارے پاس ہے، جب تک اس کو خدا کی راہ میں لٹا نہ دو، آسمان کی بادشاہت میں داخل نہ ہو گے، کیا اس نے اپنا بھی سب کچھ خدا کی راہ میں لٹایا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ شریروں کا مقابلہ نہ کرو، کیا اس نے خود بھی شریروں کا مقابلہ نہیں کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ دشمنوں کو بھی پیار کرو کیا اس نے بھی کبھی اپنے دشمن کو پیار کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ تو اپنے پڑوسی کو اپنے سارے جان و مال سے پیار کر، کیا خود بھی اس کا ایسا ہی عمل تھا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ اگر تمہارے داہنے گال پر کوئی تھپڑ مارے تو بائیں گال بھی اس کے سامنے کر دو، کیا اس نے خود بھی ایسا کیا، وہ جس نے یہ کہا کہ تم سے اگر کوئی

تمہارا کرتا مانگے تو اپنی قبا بھی اس کے حوالہ کر دو، کیا ایسی فیاضی اس سے خود بھی ظہور میں آئی؟ (سیرۃ النبیؐ ج/۶، ص/۳۲-۳۲)

یہاں تک وہ سب کچھ کہہ گئے جو کہنا چاہتے تھے، مگر وہ حضرت عیسیٰؑ کی نبوت پر ایمان کامل رکھتے تھے، ان کا احترام بھی ان کو کرنا تھا، اس لئے ان کا ادب شناس قلم رکتا ہے، اور اپنے قارئین کے ذہن کو اس کے بعد ہی دو جملوں سے مسحور کر دیتے ہیں کہ:

”ہم یہ نہیں کہتے کہ حضرت مسیحؑ میں یہ صفتیں موجود نہ تھیں، بلکہ کہنا ہے کہ انجیل نے ان کی اس حیثیت کو محفوظ نہیں رکھا ہے“۔ (سیرۃ النبیؐ ج/۶، ص/۳۳)

اپنے قلم کی اس احتیاط کے بعد اپنے ناظرین کے ذہن کو یہ لکھ کر مسخر کرتے ہیں:

”مگر اسلام کے اخلاقی معلم کی شان اس حیثیت سے بھی بلند ہے، اس نے جو کچھ کہا سب سے پہلے خود اس کو کر کے دکھایا، اس کا جو قول تھا وہی اس کا عمل تھا، اس نے یہودیوں کو طعنہ دیا کہ ”اتَّامُرُوكَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ“ (بقرہ: ۵) (کیا اوروں کو نیکی کی بات بتاتے ہو، اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو)، اور مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ:

”لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ“ (صف: ۱) (تم کیوں کہتے ہو کہ جو کرتے نہیں، بڑی بیزاری ہے اللہ کے یہاں کہ کہو وہ جو نہ کرو)۔ (سیرۃ النبیؐ ج/۶، ص/۳۳)

اس میں قرآن مجید کی آیتیں اس طرح شامل ہو گئی ہیں کہ تحریر کی لڑیوں سے جدا نہیں معلوم ہوتی ہیں، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی اخلاق کے جلوؤں کو اس طرح دکھاتے ہیں۔

”ایک شخص نے آکرام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیا تھے، فرمایا کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا، ”کان خلقه القرآن“، جو قرآن میں الفاظ کی صورت میں ہے، وہی حامل قرآن کی سیرت میں بصورت عمل تھا۔“

وہ عملی صورت کیا تھی، ذرا ان ہی کے قلم سے سن کر عشق رسول سے بھی تھوڑی دیر کے لئے سرشار ہو لیں۔

”اگر غریبوں اور مسکینوں کی امداد و اعانت کا حکم دیا تو پہلے خود اس فرض کو ادا کیا، خود بھوکے رہے، اور دوسروں کو کھلایا، اگر آپ نے اپنے دشمنوں اور قاتلوں کو معاف کرنے کی نصیحت کی تو پہلے خود اپنے دشمنوں اور قاتلوں کو معاف کیا، کھانے میں زہر دینے والوں سے درگزر کیا، اپنی ذات کے لئے کسی سے انتقام نہیں لیا، جنھوں نے آپ پر تیر بر سائے اور تلواریں چلائیں، مسلح ہو کر بھی کبھی ان پر ہاتھ نہیں اٹھایا، کپڑوں کی شدید ضرورت کے وقت میں بھی جس نے آپ سے کپڑا مانگا، خود اپنی چادر اتار کر اس کے حوالہ کر دی“۔ (سیرۃ النبیؐ ج/۶، ص/۳۴)

ان عملی نمونوں کے افادی پہلوؤں کو اس طرح قلمبند کرتے ہیں۔

”دوسرے مذاہب کے لوگ انسانوں کو اپنے ہادیوں اور رہنماؤں کے صرف اقوال اور تعلیمات سناتے ہیں، ان کی پیروی کی دعوت دیتے ہیں، اور مسلمان اپنے پیغمبر کے نہ صرف اقوال و نصائح کو بلکہ اس کے عملی نمونوں اور کارناموں کو بھی پیش کرتے، اور ان کی پیروی کی دعوت دیتے ہیں، دنیا کے کسی پیغمبر اور بانی دین کے صحیفہ نے خود اپنے پیغمبر یا بانی کی اخلاقیات کو تحدی اور اعلان کے ساتھ اس کے ہم عصروں کے سامنے پیش نہیں کیا، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیفہ نے سب سے آگے بڑھ کر بلا خوف و خطر اپنے داعی اور مبلغ کی زندگی کی اخلاقیات کو خود اس کے معاصرین کے سامنے نقد و تبصرہ کے لئے پیش کیا“۔ (سیرۃ النبیؐ ج/۶، ص/۳۴)

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کی وضاحت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

”اخلاقی معلم کے کمال کی ایک اور شرط یہ ہے کہ اس کی تعلیم میں یہ تاثیر ہو کہ وہ دوسروں کو بھی اپنے فیض سے بہرہ مند کر سکے، یعنی وہ خود کامل ہو، اور دوسرے ناقصوں کو بھی کامل بناتا ہو، وہ خود پاک ہو، اور دوسرے ناپاکوں کو بھی دھو کر

پاک و صاف کر دیتا ہو، اخلاق کے سارے معمول کی فہرست پر ایک نظر ڈال جاؤ کہ یہ تکمیل کی شان سب سے زیادہ کس میں تھی؟ کیا اس میں جس کو قدم قدم پر بنی اسرائیل کی سنگدلی اور کجروی کا گلہ کرنا پڑا ہے، کیا اس میں جس کے پورے گیارہ شاگرد بھی امتحان کے وقت پورے نہ اتر سکے، یا اس میں تھی جس کی نسبت اس کے صحیفہ وحی نے بار بار اعلان کیا۔

”يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ“۔ (جمہ: ۱)

”وہ ان کو خدا کی باتیں سناتا اور ان کو پاک و صاف بناتا، اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے“۔ (سیرۃ النبیؐ ج/۶ ص/۳۵)

قرآن کی یہ آیت یہاں اس طرح لکھی گئی ہے جیسے معلوم ہوتا ہے کہ علم غیبی صدا دے رہا ہے کہ جو کچھ نثر میں لکھا جا رہا ہے، وہاں پر اسی آیت کے نقل کرنے کی ضرورت ہے، پھر اسی چھوٹی سی آیت کی یہ تفسیر بیان کرتے ہیں:

”اس تحدی اور اعلان میں یہ بات خاص لحاظ کے قابل ہے کہ اس میں اسلام کے معلم کی نسبت صرف یہی دعویٰ نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو کتاب و حکمت کی باتیں سکھاتا اور خدا کے احکام سناتا ہے، بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ ان کو اپنے فیض و اثر سے پاک و صاف و مصفا بنا بھی دیتا ہے، وہ ناقصوں کو کامل، گنہگاروں کو نیک، اندھوں کو بینا اور تاریک دلوں کو روشن دل بنا دیتا ہے، چنانچہ جس وقت اس نے اپنی حیات کا کارنامہ ختم کیا، کم از کم ایک لاکھ انسان اس کی تعلیم سے عملاً بہرہ مند ہو چکے تھے، اور وہ عرب جو اخلاق کے پست ترین نقطہ پر تھا، ۲۳ برس کے بعد وہ اخلاق کے اس اوج کمال پر پہنچا جس کی بلندی تک کوئی ستارہ آج تک نہ پہنچ سکا۔ (سیرۃ النبیؐ ج/۶ ص/۳۶)

پھر وہ یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے جلوہ ہائے صدرنگ کس کس طرح نمایاں ہوئے، اس کے مؤثر انداز بیان کی تاثیر سے متاثر ہونا لازمی

ہے، رقمطراز ہیں:

”اس عالم کی تکمیل اور نظم و نسق کے لئے ایک ہی قوت کے انسانوں کی نہیں بلکہ سینکڑوں مختلف قوتوں کے انسانوں کی ضرورت ہے، اخلاق کے دوسرے معلمین کی درسگاہوں پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ وہاں صرف ایک فن کے طالب العلم تعلیم پاتے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تربیت گاہ میں فوجی تعلیم کے سوا کوئی اور فن نمایاں نہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مکتب میں عفو و درگزر کے سوا کوئی اور سبق نہیں، بودھ کے وہاں اور خانقاہ میں در بدر بھیک مانگنے والے مرتاض فقیروں کے سوا کوئی اور موجود نہیں“۔ (سیرۃ النبیؐ ج/۶ ص/۳۶)

اتنا لکھنے کے بعد ان کے قلم میں بجلی کی سرعت پیدا ہو جاتی ہے، رقمطراز ہیں:

”لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی درسگاہ اعظم میں آکر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک عمومی جامعہ ہے، جس میں انسانی ترقی کی ہر قوت نشو و نما پا رہی ہے، خود معلم کی ذات ایک پوری یونیورسٹی ہے، جس کے اندر علم و فن کا ہر شعبہ اپنی جگہ پر قائم ہے اور ہر جنس اور ہر مذاق کے طالب علم آتے ہیں، اور اپنے اپنے ذوق اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق کسب کمال کر رہے ہیں“۔

(سیرۃ النبیؐ ج/۶ ص/۳۶)

مجلس نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی مرقع آرائی کر کے ہمارے اور آپ کے ایمان کو منور کرنے کا پورا موقع دیا ہے، لکھتے ہیں:

”آپ کی حیثیت ایک انسان، ایک باپ، ایک شوہر، ایک دوست، ایک خانہ دار، ایک کاروباری، ایک تاجر، ایک افسر، ایک حاکم، ایک قاضی، ایک سپہ سالار، ایک بادشاہ، ایک استاد، ایک واعظ، ایک مرشد، ایک زاہد، ایک عابد اور ایک پیغمبر کی نظر آتی ہے، یہ تمام انسانی طبقے آپ کے سامنے آکر زانوے ادب تہ کرتے ہیں، اور اپنے شعبہ و فن کے مطابق آپ کی تعلیمات سے بہرہ اندوز

ہوتے ہیں، مدینۃ النبیؐ کی اس درس گاہ اعظم کو غور سے دیکھو جس کی چھت کھجوروں کے پتوں سے اور ستون کھجور کے تنوں سے بنائے گئے تھے، اور جس کا نام مسجد نبویؐ تھا، اس کے الگ الگ گوشوں میں ان کی جماعتوں کے الگ الگ درجے کھلے ہوئے ہیں، کہیں، ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ جیسے فرمانروا ہیں، تو کہیں طلحہؓ، زبیرؓ، معاویہؓ، سعد بن معاذؓ، سعد بن جبیرؓ جیسے ارباب رائے و تدبیر ہیں کہیں خالدؓ، ابوعبیدہؓ، سعد بن ابی وقاصؓ اور عمر بن العاصؓ جیسے سپہ سالار ہیں، کہیں وہ ہیں جو بعد کو صوبوں کے حکمران، عدالتوں کے قاضی اور قانون کے مقنن بنے، کہیں ان زہاد و عباد کا مجمع ہے، جن کے دن روزوں میں، راتیں نمازوں میں کٹتی تھیں، کہیں ابوذرؓ، سلمانؓ اور درداءؓ جیسے وہ خرقہ پوش ہیں جو مسیح اسلام کہلاتے تھے، کہیں وہ صفہ والے طالب علم تھے جو جنگل سے لکڑیاں لا کر بیچتے، اور گزارہ کرتے، اور دن رات علم کی طلب میں مصروف رہتے تھے، کہیں حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ثابتؓ جیسے فقیہ و محدث تھے، جن کا کام علم کی خدمت اور اشاعت تھا، ایک جگہ غلاموں کی بھیڑ ہے، تو دوسری جگہ آقاؤں کی محفل ہے، کہیں غریبوں کی نشست ہے، اور کہیں دولت مندوں کی مجلس ہے، مگر ان میں ظاہری عزت اور دنیاوی اعزاز کی کوئی تفریق نہیں پائی جاتی، سب مساوات کی ایک ہی سطح پر اور صداقت کی ایک ہی شمع کے گرد پروانہ وار جمع ہیں، سب پر توحید کا یکساں نشہ چھایا اور سینوں میں حق پرستی کا ایک ہی ولولہ موجیں لے رہا ہے، اور سب اخلاق و اعمال کے ایک ہی آئینہ قدس کا عکس بننے کی کوشش میں لگے ہیں۔“ (سیرۃ النبیؐ ج ۶/ ص ۸-۷)

ایسا مرصع کار مینا نگار طرز بیان وہی اختیار کر سکتا ہے، جو عشق رسولؐ میں سرشار ہو، اس میں نہ صرف جذبات کا جو تبار نظر آتا ہے، بلکہ مجلس نبویؐ کی صحبت گہر بار کا نقش و نگار اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ یہ قلمی محاکات کی بہت عمدہ مثال بھی بن گئی۔

## سیرۃ النبیؐ جلد ہفتم:

سیرۃ النبیؐ جلد ہفتم، سید صاحب کی ایک نامکمل اور ادھوری تصنیف ہے، وہ اپنی جلد ششم کے بعد اسلام میں معاملات اور سیاسیات کی جو تعلیمات دی گئی ہیں، ان پر ایک مستقل جلد لکھنا چاہتے تھے، اس کو شروع کیا تھا، لیکن اس زمانے میں ان کی نجی اور علمی زندگی میں بعض اسباب کی بنا پر بڑا انتشار رہا۔

وہ اپنی علالت اور صحت کی کمزوری کی وجہ سے بھی پریشان رہے، پھر جلد ہفتم لکھنے کے وقت ان کا وقت ”حیات شبلی“ کی ضخیم جلد کی تدوین میں بھی صرف ہوا، ان اسباب کی بناء پر ان کی ساتویں جلد تیار نہ ہو سکی، چند ابواب لکھے تھے، جن کے عنوانات یہ ہیں، اسلام میں حکومت کی اہمیت، عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں نظام حکومت، سلطنت اور دین کا تعلق، امت مسلمہ کی بعثت، قوت عاملہ یا قوت آمرہ، حاکم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے، اس میں ان کی فکر کی گہرائی تو ضرور ہے، لیکن تحریر کا وہ جو تبار اور دوبار بہت ناظر نہیں آتا، جو سیرۃ النبیؐ کی گذشتہ جلدوں میں نظر آتا ہے، پھر بھی اس میں ان کے قلم کی پختگی، نظر کی جامعیت، اسلام کی روح سے آشنائی اور اظہار رائے میں اعتدال و توازن تو اس کی ہر سطر میں نمایاں ہے، جیسا کہ ان کے حسب ذیل اقتباسات سے ظاہر ہوگا، ان سے ان کے سیاسی افکار و خیالات بھی معلوم ہو جائیں گے، اور ان کا طریقہ بیان بھی، خلافت راشدہ اسلام کی تاریخ میں ایک آئیڈیل حکومت سمجھی جاتی ہے، اس پر وہ تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”اصل یہ ہے کہ اسلام نے اپنے اولین دور میں عملاً جس طرز کی حکومت قائم کی، اور جس قسم کی مثالیں اور تعلیمیں اس نے پیش کیں، ان کی روشنی میں اسلامی حکومت کا جو تصور قائم ہوتا ہے، اس میں بہ یک وقت مذہبی، شخصی، دستوری، جمہوری، اور زعمی حکومتوں کے خصوصیات اور مظاہر نظر آتے ہیں، اس لئے اہل نظر اپنے اپنے مذاق کے اعتبار سے اس کی تعبیر کرتے ہیں، حالانکہ

واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسا طرز حکومت ہے، جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ذریعہ ظہور میں آیا، اور اسلام ہی نے اس کو پیش کیا ہے، وہ نہ اتاری ہے نہ شخصی ہے، نہ دستوری ہے، نہ جمہوری ہے، اور نہ زعمی ہے، بلکہ ایسا طرز حکومت ہے، جس میں ان سب کے خصوصیات و فضائل تو یکجا ہیں، لیکن وہ ان کے قبائح و مثالب سے خالی ہے، اس لئے وہ دیکھنے والوں کو کبھی خدائی، کبھی شخصی، کبھی زعمی، کبھی دستوری اور کبھی جمہوری بلکہ اشتراکی تک نظر آتی ہے، لیکن اگر اس کے اصل رخ سے دیکھئے اور اس کے ایک ایک خط و خال کا جائزہ لیجئے تو اس کی شکل سب سے الگ نظر آئے گی۔“ (سیرۃ النبیؐ ج/ ۷، ص/ ۱۹۰)

پھر اس کی تصریح اس طرح کرتے ہیں، جس میں ان کی امعان نظر بھی نمایاں ہے، اس کو جس باریک بینی سے قلمبند کرتے ہیں، وہ قابل غور ہے۔

”اسلام کی سلطنت تمام تر مذہبی احکام پر قائم ہے، مگر اس کا امیر یا خلیفہ نہ خدا ہے نہ خدا کا اوتار ہے، نہ خدا کا مظہر ہے، نہ خدا سے ہم کلام ہوتا ہے، نہ خدا سے براہ راست احکام پاتا ہے، نہ اس میں کوئی خدائی تقدیس ہے، نہ وہ خدا کی طرف سے مقرر ہوتا ہے، بلکہ وہ انسان ہوتا ہے، جس کو مسلمانوں نے اپنی رائے سے یا سابق امیر نے امت کی سرداری اور خدا کی شریعت کی تنفیذ کے لئے اس کو منتخب کیا ہے، تاہم اسلام کی حکومت کو اس لحاظ سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ان احکام پر مبنی ہے، جو رسول کے ذریعہ سے اس کو ملے ہیں، اس کو الٰہی ہی کہا جاسکتا ہے، اور اس بناء پر کہ اسلام کی حکومت میں ارباب شوریٰ اور اہل حل و عقد کا گروہ مانا گیا ہے، اور شوریٰ اور باہمی مشورہ کی تاکید ہے اس کو تسامحاً دستوری کہہ دینا ممکن ہے، اور اس سبب سے کہ اس کے خلیفہ کا انتخاب افراد امت کی جانب سے بھی ہوتا ہے اور اس کو حکومت کے حقوق اور فوائد میں امت کے عام افراد سے ایک ذرہ بھی تفوق حاصل نہیں ہوتا، لوگ جمہوری سمجھ سکتے ہیں، اور اس خیال سے کہ خلیفہ کے

احکام شرعی کی اطاعت امت پر واجب ہے، اور وہ امت کے مشوروں کے ماننے پر قطعاً مجبور نہیں، اس کو شخصی کہ دینا ممکن ہے، اور اس نظر سے کہ خلیفہ کے ہر جائز حکم اور صوابدید پر بے چوں و چرا عمل کرنا امت کیلئے ضروری ہے اس کو زعمی یعنی ڈکٹیٹر سمجھا جاسکتا ہے۔“ (ایضاً: ج/ ۷، ص/ ۱۹۰)

خلافت راشدہ کے مختلف بلکہ پیچیدہ پہلوؤں کو کس صاف سلیس اور عام فہم انداز میں (ایک) پیرا گراف میں سمجھا دیا ہے، جو اور کسی اہل قلم کے لئے پورے ایک باب میں بھی سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے، یہ صرف نفس مسئلہ کے ساتھ قلم پر قدرت کی بھی دلیل ہے، لیکن اوپر کے اقتباس کے بعد فوراً ہی اپنے قارئین کو یہ لکھ کر مسرور کرتے ہیں کہ:

”لیکن ان مختلف جہتوں کی بناء پر ظاہر ہے کہ مغربی اہل سیاست کے بنائے ہوئے نظریات حکومت میں کوئی ایک نظریہ بھی اسلامی طریق حکومت پر پوری طرح صادق نہیں آسکتا۔“ (سیرۃ النبیؐ ج/ ۷، ص/ ۱۹۱)

اور اسی کے بعد اسلامی سیاست کی روح کو جس پر زور، موثر اور خوبصورت انداز میں قلمبند کیا ہے، وہ موجودہ دور کے اسلامی ممالک کے حکمرانوں کے لئے مشعل ہدایت ہے، لکھتے ہیں:

”اصل یہ ہے کہ سیاسی مفکرین کی نظر حکومت کی ظاہری اشکال کے گھور کھ دھندوں میں پھنس کر رہ گئی، اور اسلام کی نظر اس کے اندر کی حقیقت پر ہے، اس کے نزدیک حکومت کی ظاہری شکل یعنی انتخاب کا طریقہ، ارباب شوریٰ کی ترتیب، اور تعین، ان کے فرائض و حقوق، ان کے انتخاب، اظہار رائے کے طریقے اور دیگر متعلقہ مسائل اہمیت کے قابل نہیں، اصل چیز حکومت کے امیر و رئیس اور اس کے ارکان و عمال کا تقویٰ ہے۔“ (ایضاً: ج/ ۷، ص/ ۱۹۱)

اور پھر اسی سیاسی تقویٰ کو جس طرح سمجھایا ہے اس کے سمجھنے میں کسی دقت نظر کی ضرورت نہیں وہ یہ لکھ کر ہماری تواضع کرتے ہیں:



”یہ تقویٰ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی ذمہ داری کا قلبی و ایمانی احساس اور اس حقیقت کی تلقین ہے کہ حکومت کا کوئی جزء کسی کی شخصی یا خاندانی ملکیت نہیں، بلکہ وہ خدا کی ملکیت ہے، اور اسی کے حکم یا نشانے حکم کا نفاذ حکومت کا فرض ہے، اور خدا کے بنائے ہوئے اور تعلیم کئے ہوئے احکام و فرائض میں سب مسلمانوں کی حیثیت یکساں ہے، اور سب ہی ایک جیسے اس کے بندے اور تابع فرمان ہیں۔“ (سیرۃ النبیؐ ج/۷، ص/۱۹۲)

تقویٰ کی بحث کو جاری رکھتے ہوئے اسلامی سلطنتوں اور عام سلطنتوں کا موازنہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

”عام سلطنتوں کا اصول یہ ہے کہ وہ سلاطین و حکام اور سلطنت کے عمال کے قول و فعل کو قانون کے سلسلوں سے جکڑ دیتی ہیں کہ وہ حق و عدل کے خلاف نہ کر سکیں، لیکن اسلامی حکومت کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے حکمرانوں اور عاملوں کے دلوں پر اپنا قبضہ بٹھاتی ہے تاکہ تقویٰ اور آخرت کے مواخذہ کے خوف اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کے جذبہ سے حق اور عدل کے خلاف نہ کر سکیں، عام حکومتیں، ہر روز اپنے ہر قانون کی لا چاری اور بے اثری کو دیکھ کر دوسرا قانون بناتی ہیں، پھر تیسرا اور چوتھا قانون، پھر اسی طرح ہر قسم کی برائیوں کی روک تھام کے لئے مسلسل قانون بناتی رہتی ہیں، اور مجرم اس کو اپنی چالاکی اور ہشیاری سے برابر توڑتے رہتے ہیں، اور سلطنت کا مقصود حاصل نہیں ہوتا، اس کے برخلاف اسلام کی سلطنت اگر اصول اسلام کے مطابق ہو تو صرف خدا کا تقویٰ اور آخرت کے مواخذہ کا ڈران کے دل کی ہر گئی اور عمل کی ہر برائی کو قطعاً ختم کر دیتا ہے، جس کی بے شمار مثالیں عہد نبوت، زمانہ خلافت اور بعض نیک و عادل سلاطین کی سلطنتوں میں ملتی ہیں۔“ (سیرۃ النبیؐ ج/۷، ص/۱۹۲)

ایک بہت ہی پیچیدہ، عمیق اور متنازعہ فیہ مسئلہ کو کیسے ٹھنڈے لہجے میں اور ٹھنڈی

تحریر کے ذریعہ سے سمجھانے کی کوشش کی ہے، جو اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ ضرورت کے وقت وہ اپنی تحریر کے ذریعہ جذبات میں تلاطم اور تموج بھی پیدا کر سکتے ہیں لیکن جب غور و فکر کرنے اور کسی نتیجہ پر پہنچنے کی ضرورت ہوتی ہے تو اس کے لئے دعوتی انداز کی تحریر لکھ کر ذہن کو منور و متجلی کرتے ہیں۔

تتمہ:

تین ہزار دوسو چھیاسٹھ صفحے کی سیرۃ النبیؐ کی پانچ جلدیں لکھ کر سید صاحب نے جوئے شیر کے فرہاد کا لقب حاصل کیا، لیکن اسی فرہاد نے ان جلدوں کے ذریعہ سے اپنی انشاء پرداز کی کا جو قصر شیریں تیار کیا، وہ اسی کے ساتھ ان کا دوسرا اہم کارنامہ ہے، ان میں جو انداز بیان ہے دنیا کی کسی زبان کے عظیم ترین مصنفوں کے اسلوب کے مقابلہ میں رکھا جاسکتا ہے، ان کو عربی میں بڑی قدرت حاصل تھی، وہ اس کے بڑے اچھے اہل قلم تھے، ان کو فارسی زبان پر بھی دسترس حاصل تھی، وہ انگریزی زبان سے اچھی طرح واقفیت رکھتے تھے، اس کی اہم کتابیں اور اخبارات برابر ان کے مطالعہ میں رہتے، اردو تو ان کی مادری زبان ہی تھی، لکھنؤ میں تعلیم پائی، اور اپنی عمر کا زیادہ حصہ یہیں گزارا پھر علامہ شبلی نعمانیؒ کی صحبت برابر حاصل رہی، ان تمام اثرات کی وجہ سے ان کی تحریروں میں عربی زبان کی جزالت، شوکت اور حشمت آئی، فارسی زبان کی فصاحت، حلاوت اور تمکنت غیر شعوری طور پر ان کی تحریروں میں منتقل ہوتی رہیں، پھر شاید ان کو بھی خبر نہیں رہی کہ انگریزی زبان کے طرز ادا کی برجستگی اور روانی ان کی تحریروں کا پیچھا کرتی رہیں، علامہ شبلی نعمانیؒ کی انشاء پرداز کی کا وصف اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے، کہ سرسید نے ایک کان سے اردو نثر نگاری کا ایک ہیرا نکالا، حالی نے اس میں جلا دی، نذیر احمد نے اس میں چمک پیدا کی اور محمد حسین آزاد نے اس میں دمک عطا کی، مگر جس نے اس ہیرے کو کوہ نور بنا دیا وہ علامہ شبلی نعمانیؒ ہیں، اسی کوہ نور کا پرتوان کی بزم کے صدر الصدور کی تحریروں میں دکھائی دیتا ہے۔

سیرۃ النبیؐ کی ان پانچ جلدوں میں کہیں تو اس کا اسلوب ایسا ہے، جو کسی باوقار مفسر کا ہونا چاہئے، کہیں اس کا انداز بیان وہ ہے، جو با وزن محدث کا ہوتا ہے، کہیں اظہار رائے وہی ہے جو ایک دیدہ و رفیقہ کے یہاں تلاش کیا جاتا ہے، کہیں طرز استدلال وہ ہے جس کی ایک مخلص متکلم سے توقع کی جاتی ہے، کہیں فکر کی گہرائی ایسی دکھائی دیتی ہے، جو ایک فلسفی کے طرز ادا میں دکھائی جاتی ہے کہیں رجز خوانی کا وہ انداز ہے، جو سالار کاروان کے منہ سے سنائی دیتا ہے، کہیں وہ حدی خوانی ہے، جو منزل کو طے کرنے میں مدد دیتی ہے، ان ہی اجزائے ترکیبی سے سیرۃ النبیؐ میں ان کی تحریروں میں وہ انشاء پر دازانہ رنگ پیدا ہو گیا ہے، جس کے سہارے اس کے مطالعہ میں نشاط و انبساط کی کیفیت طاری رہتی ہے۔

اگر تکرار کے خیال کو صرف نظر کر دیا جائے تو آخر میں یہ بھی کہنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سید صاحب کو غیر معمولی محبت، شیفنگی اور وارفتگی رہی، اسی لئے ان کی سیرۃ النبیؐ کی پانچ جلدوں میں ان کے خون جگر کی لالہ کاری، سوز دل کی چنگاری، علوئے ہمت کی اولوالعزمی اور ان کی عفت مآبی پورے طور پر نظر آتی ہے، اسی لئے ان جلدوں کی تحریروں میں ایمان اور صراط مستقیم پر چلنے کی ہدایت اور نہ صرف مسلمانوں بلکہ تمام انسانوں کو زندگی سنوارنے کی بشارت کی چاندنی چھٹکی ہوئی ہے، اسی کی بدولت ان جلدوں میں ان کے اسلوب، طرز ادا اور انداز بیان کے وزن، وقار، کمال اور جمال کی ایک خاص قسم کی آن، بان اور شان پیدا ہو گئی ہے، جو کسی دوسرے کے یہاں نہیں مل سکے گی۔

ایک بات اور، حضرت سید صاحب نے مولانا محمد علی جوہر اور علامہ محمد اقبالؒ کی وفات پر حسرت و آیات پر جو شذرات معارف میں لکھے ہیں، وہ ان کے ادب و انشاء کے سونے کے ٹکڑے سمجھے جاتے ہیں، اور سمجھا جانا چاہئے، یہ جذبات سے لبریز ہو کر لکھے گئے ہیں، جب کسی تحریر پر جذبات اور خصوصاً المناک جذبات کا رنگ چھا جاتا ہے، تو اس کا مؤثر ہونا لازمی ہے، انھوں نے جگر مراد آبادی کی شعلہ طور پر جو مقدمہ لکھا ہے، یان کی ”نقوش سلیمانی“ میں جو ادبی مضامین ہیں ان میں بھی ان کی ادبی شان پورے طور پر

نمایاں ہے، شعر و ادب پر جو بھی تحریر لکھی جائے گی اس میں زبان کی شستگی اور بیان کی رفتگی خود بخود ظاہر ہو کر رہتی ہے، ان کی خطبات مدراس میں اس کا ہر صفحہ شیوہ بیانی کا مرغزار اور گلزار بن گیا ہے، وہ محض اس لئے کہ یہ بھی عشق رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم میں سرشار ہو کر لکھی گئی ہے، اس میں محبت کے گل اور شیفنگی کے بوٹے تحریری شکل میں نمودار ہو گئے ہیں، جو تعجب انگیز نہیں ہے، سید صاحب کی سیرۃ النبیؐ کی پانچوں جلدوں میں بھی یہی وارفتگی ہے، مگر اسی کے ساتھ ان میں معجزات، مشاہدات، مسموعات، اسراء، معراج، شق القمر، شق صدر، منصب نبوت، ایمان، برزخ، قیامت، نور، ظلمت، خیر، شر، توحید، عبادات، نماز، روزہ، زکاۃ، حج، صبر، توکل، شکر، جہاد، تقویٰ، فضائل اخلاق، رذائل اخلاق، فلسفہ اخلاق، معاملات، سیاست اسلامی، نظام حکومت اسلام اور حکومت الہیہ وغیرہ جیسے خشک مسائل ہیں، ان کو تحریر کی فصاحت، انداز بیان کی بلاغت، عبارت کی نفاست جملوں کے درد بست اور ان کے صحیح استعمال کی مہارت، الفاظ کے انتخاب کے حسن ذوق، قرآن کریم کے رموز اور حدیث پاک کے نکات کے غوامض اور کلامی نکتہ وری کی سرلیج الہمی کے ساتھ قلمبند کرنا بڑا مشکل کام تھا، بلکہ دشواریوں کے نفث خوان کو طے کرنا تھا، لیکن ان مشکلوں اور دشواریوں سے حضرت سید صاحب جس طرح عہدہ برآ ہوئے ہیں، وہ بھی پانچوں جلدوں کے اسلوب کی نمایاں خوبیاں ہیں۔

## حضرت استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ کی سیرۃ النبیؐ جلد پنجم ایک طالب علمانہ جائزہ

جناب سید فخر الحسن صاحب پرنسپل لیاقت ڈگری کالج کراچی نے حضرت الاستاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ کی صد سالہ سالگرہ کے جشن کے موقع پر ایک مقالہ لکھنے کی فرمائش کی، تقاضہ میں کئی خطوط آئے تو خیال ہوا کہ ”حضرت سید صاحب سیرۃ النبیؐ کے مصنف کی حیثیت سے“ کے عنوان سے کچھ لکھنے کی کوشش کروں، دارالمصنفین کی جس میز پر سیرۃ النبیؐ کی جلدیں مرتب ہوئی ہیں وہ ویسے ہی محفوظ ہے جیسے ان کی زندگی میں تھی، اس پر نظر پڑی، دل میں ایک تلاطم اور تموچ پیدا ہوا، پھر ہمت نہ ہوئی ارادہ ترک کر دیا پھر خیال آیا کہ اس موضوع پر دارالمصنفین میں کچھ نہیں لکھا گیا تو اور کہاں لکھا جائے گا، لرزتے ہوئے دل اور کپکپاتے ہوئے ہاتھ سے خامہ فرسائی شروع کی تو اپنی کج بیانی ساتھ نہ دے سکی، پھر بھی لکھتا چلا گیا، ساتوں جلدوں پر تحریر بڑی لمبی ہو گئی، ظاہر ہے کہ ایسی طوالت کسی مجلس کے لئے موزوں نہیں ہوتی، اس لئے اس کا تھوڑا سا حصہ جناب سید فخر الحسن کی خدمت میں بھیج رہا ہوں کہ ان کے جشن میں پڑھے جانے والے مقالات کا کوئی مجموعہ شائع ہو تو یہ بھی شامل کر کے ممنون کیا جائے۔

۱۹۳۲ء میں حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی سیرۃ النبیؐ جلد پنجم ان کی جلد چہارم کی اشاعت کے دو سال کے بعد شائع ہوئی، اس کی ضخامت ۴۹۳ صفحے ہے، اس اثناء

میں وہ ”خیام“ جیسی بلند پایہ تحقیقی کتاب کی تدوین بھی کرتے رہے اور ’معارف‘ میں افغانستان، رانچی، لاہور اور حیدرآباد کے سفروں پر مضامین لکھتے رہے، لیکن سیرۃ النبیؐ کے لئے ان کے قلم کا مسافر برابر تازہ دم رہا۔ وہ سیرۃ النبیؐ کی جلدوں پر جلدیں لکھتے چلے جا رہے تھے، اور اپنے ناظرین کو اطمینان دلاتے رہے کہ اس سلسلہ کی ترتیب و تکمیل میں انھوں نے امکان بھر اس خاکہ کی پیروی کی ہے جس کا خیال ان کے استاذ محترم نے اپنے مکتوبات میں ظاہر کیا تھا کہ سیرت میں ہر قسم کے مباحث آجائیں یعنی تمام مہمات مسائل پر ریویو ہو، قرآن مجید پر پوری نظر ہو، غرض سیرت نہ ہو بلکہ انسائیکلو پیڈیا ہو۔ (۱)

سیرۃ النبیؐ جلد اول کے مقدمہ میں بھی انھوں نے تحریر فرمایا تھا کہ نبوت کا فرض، تعلیم، عقائد و امر و نہی، اصلاح اعمال اور اخلاق ہے۔ اس بناء پر منصب نبوت کے کاموں میں فرائض خمسہ، تمام اوامر و نہی کی ابتدا اور تدبیر کی تغیرات کی مفصل تاریخ، ان کے مصالح اور حکم اور دیگر مذاہب سے اُن کا مقابلہ اور موازنہ ہے، عرب کے عقائد اور اخلاق و عادات پہلے کیا تھے اور ان میں کیا کیا اصلاحیں عمل میں آئیں، نیز یہ کہ تمام عالم کی اصلاح کے لئے اسلام نے کیا کیا قانون مرتب کیا اور کیوں کروہ تمام عالم کے لئے کافی ہو سکتا ہے۔ یہ سب سیرۃ النبیؐ کے موضوعات ہیں۔

سیرۃ النبیؐ کی چوتھی جلد میں عرب کی گذشتہ حالت اور اسلام کی تعلیم اور عقائد کا موضوع تھا، اب اس پانچویں جلد کا موضوع عبادت ہے یعنی اسلام میں عبادات کی حقیقت کیا ہے اور اس کے اقسام کتنے ہیں؟ اور ان میں کیا مصلحت و حکمت رکھی ہے، ان ہی چیزوں کی تشریح اس جلد میں کی گئی ہے۔

اس کی ابتدا عمل صالح کے عنوان سے کی ہے، اور لکھتے ہیں کہ انسان کی نجات دو چیزوں پر موقوف ہے، ایک ایمان اور دوسرے عمل صالح، ایمان بنیادی اصولوں پر یقین رکھنے کا نام ہے، اور عمل صالح ان اصولوں کے عمل کا نام ہے۔ کسی بات کا سننا اور اس کا علم و

(۱) مکتوبات شبلی بنام مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی ج: ۱/ ص: ۱۰۴

یقین کامیابی کے لئے کافی نہیں، جب تک کہ اس علم و یقین کے مطابق عمل بھی نہ ہو، ایمان بنیاد ہے اور عمل صالح اس پر قائم شدہ دیوار یا ستون ہے، جس طرح کوئی عمارت بنیاد کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی اسی طرح وہ دیوار یا ستون کے بغیر کھڑی بھی نہیں ہو سکتی، اعمال صالحہ کی دو قسمیں ہیں جن کا تعلق خاص خدا سے ہے، اس کو عبادت کہتے ہیں، دوسری وہ جس کا تعلق بندوں سے ہے، اس کی بھی دو قسمیں ہیں ایک وہ جس کی حیثیت صرف انسانی فرض کی ہوتی ہے اور دوسری وہ جس میں قانونی ذمہ دار کی حیثیت ملحوظ ہوتی ہے، پہلے کا نام اخلاق اور دوسرے کا معاملات ہے۔ اعمال صالحہ کی انہی تینوں قسموں کی تفصیل و تشریح سیرۃ النبیؐ کی آخری تین جلدوں میں کی گئی ہے۔

سیرۃ النبیؐ جلد پنجم میں سید صاحب کی تشریح یہ ہے کہ اسلام میں جو عبادت بتائی گئی ہے اس میں نہ سورج کے نکلنے اور نہ اس کی طرف دیکھنے کی حاجت ہے، نہ دریا میں جا کر اس کا پانی اچھالنے سے مطلب ہے، نہ سامنے آگ کا الاؤ جلانے کی ضرورت ہے، نہ دیوتاؤں، دیویوں، بزرگوں، ولیوں کے مجسموں کو پیش نظر رکھنے کی اجازت، نہ سامنے موم بتیوں کے روشن کرنے کا حکم ہے، نہ گھنٹوں اور ناقوسوں کی ضرورت ہے، نہ لوبان اور دوسرے بخورات جلانے کی رسم ہے، نہ سونے چاندی کے خاص خاص ظروف اور برتنوں کے رکھنے کا طریقہ ہے، نہ کسی خاص قسم کے کپڑوں کی قید ہے، ان تمام بیرونی رسوم و قیود سے اسلام کی عبادت پاک و آزاد ہے۔ اس کے لئے صرف ایک ستر پوش لباس، پاک جسم اور پاک دل کی ضرورت ہے، اگر جسم اور لباس کی پاکی سے کبھی مجبوری ہو جائے تو یہ بھی معاف، اسلام کی عبادت میں درمیانی آدمی کی ضرورت نہیں، مکان کی بھی قید نہیں، انسانی قربانی کی تو سخت ممانعت ہے، مشرکانہ قربانیاں بھی جائز نہیں رکھی گئی ہیں، تہجد، ترک لہذا، ریاضات اور تکالیف شاقہ کی بھی ممانعت ہے، عزلت نشینی اور قطع تعلق عبادت میں شمار نہیں، اس مختصر تحلیل اور تجربہ میں اسلام اور دوسرے مذاہب کی عبادت کا کیسا جامع، پُر مغز اور دل آویز موازنہ ہو گیا ہے۔

اس تجزیہ اور تحلیل کے بعد نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج کے ابواب ہیں۔ یہ موضوعات بھی نئے نہیں ہیں، لیکن اس جلد میں ان موضوعات پر جس انداز میں لکھا گیا ہے اس کو پڑھنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ انداز پہلے اختیار نہیں کیا گیا۔ سید صاحب اس میں بھی ایک بار پھر مفسر، محدث، فقیہ اور متکلم نظر آنے کے ساتھ ایک اعلیٰ پایہ کے انشا پرداز بھی نظر آتے ہیں، وہ کلام پاک کی چھوٹی سے چھوٹی آیتوں کا بھی ذکر کرتے ہیں تو وہ ان کی تحریر میں موتی کی طرح جڑی ہوئی دکھائی دیتی ہیں، اور جب لمبی آیتیں نقل کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تحریروں کو موتیوں کا ہار پہنا رہے ہیں، اور جب مفسر بن کر ان کی تشریح اور تشریح، دل نواز طریقہ پر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ تفسیر اور اسی کے ساتھ زبان کا خوان نعمت بچھا رہے ہیں۔ اسی طرح احادیث کا ذکر کر کے ان پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اب تک محدثوں کے جو خیالات دبے ہوئے تھے، وہ ابھر رہے ہیں، ان موضوعات پر فقہاء کا بڑا اختلاف رہا ہے لیکن ان دشوار گزار راہوں کو بھی سید صاحب نے اس طرح طے کیا ہے کہ اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے، بڑے سے بڑے دیدہ ورفیقہ کو اس سے ابھی تک اختلاف نہیں ہوا۔ ان کو لکھنے میں جو کلامی رنگ پیدا کر دیا ہے اس سے بڑے سے بڑے متکلمین لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

اگر ان میں کہیں کہیں فقہی اسقام پیدا ہو گئے ہوں تو ان سے الجھنے کے لئے فقہاء کو چھوڑ دیجئے، ان موضوعات کو جس زبان و بیان میں پیش کیا گیا ہے اس سے تھوڑی دیر کے لئے لطف اٹھائیں، نماز کے متعلق رقمطراز ہیں:

”نماز کیا ہے؟ مخلوق کا اپنے دل، زبان اور ہاتھ پاؤں سے اپنے خالق کے سامنے بندگی اور عبودیت کا اظہار، اس رحمان اور رحیم کی یاد اور اس کے بے انتہا احسانات کا شکریہ، حسن ازل کی حمد ثنا اور اس کی یکتائی اور بڑائی کا اقرار، یہ اپنے محبوب سے مجبور روح کا خطاب ہے، یہ اپنے آقا کے حضور میں جسم و جان کی بندگی ہے۔ یہ ہمارے اندرونی احسانات کا عرض نیاز ہے، یہ ہمارے دل

کے ساز کا فطری ترانہ ہے، یہ خالق و مخلوق کے درمیان تعلق کی گرہ اور وابستگی کا شیرازہ ہے، یہ بے قرار روح کی تسکین، مضطرب قلب کی تشفی اور مایوس دل کی دوا ہے، یہ فطرت کی آواز ہے، یہ حساس و اثر پذیر طبیعت کی اندرونی پکار ہے، یہ زندگی کا حاصل اور ہستی کا خلاصہ ہے۔“ (ص: ۳۸)

کون ایسا عالم، متکلم، صوفی، عارف باللہ یا معمولی بندہ ہے جو اس سے اختلاف کرے، اور اپنے دل کی بھی آواز اس کو قرار نہ دے، پھر نماز کے جتنے پہلو انسانی ذہن میں آسکتے ہیں، ان سب پر اس کتاب کے باب نماز میں مطالعہ کیا جاسکتا ہے جس کے بعد شک و شبہ کی چنگاریاں آسانی سے بجھائی جاسکتی ہیں۔

اب ذرا زکاة کے مسئلہ پر سید صاحب کے استدلال کا زور ملاحظہ کیجئے، لکھتے ہیں: ”نماز اور زکاة کے باہمی ارتباط کی ایک اور وجہ بھی ہے، اسلام کی تنظیمی زندگی صرف دو بنیادوں پر قائم ہے جن میں ایک روحانی اور دوسری مادی ہے۔ اسلام کا نظام روحانی، نماز باجماعت سے جو کسی مسجد میں ادا ہو، قائم ہوتا ہے اور نظام مادی زکاة سے جو کسی بیت المال میں جمع ہو کر تقسیم ہو، مرتب ہوتا ہے، اس لئے یہ دونوں چیزیں اسلام میں ساتھ ساتھ نظر آتی ہیں، ان کی انفرادی حیثیت کے ساتھ ان کی اجتماعی حیثیت پر بھی شریعت محمدی نے خاص زور دیا ہے، نماز جس طرح جماعت اور مسجد کے بغیر انجام پا جاتی ہے، اسی طرح زکوٰۃ بیت المال کی مجتمع صورت کے علاوہ بھی ادا ہو جاتی ہے، مگر اس کی فرضیت کے اہم مقاصد فوت ہو جاتے ہیں۔“ (ص: ۱۵۳)

پھر یکایک ان کے قلم کا زور بروئے کار آتا ہے اور وہ لکھتے ہیں: ”زکاة یا دوسرے الفاظ میں غریبوں کی چارہ گری مسکینوں کی دست گیری، مسافروں کی امداد، یتیموں کی خبر گیری، بیواؤں کی نصرت، غلاموں اور قیدیوں کی اعانت، نماز کے بعد اسلام کی عبادت کا دوسرا رکن ہے اور اس فریضہ کی یہ سب سے پہلی اہمیت ہے جو مذہب کی تاریخ میں نظر آتی ہے۔“ (ص: ۱۵۴)

اس کی اہمیت پر زور اس طرح بھی دیتے ہیں:

”محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام صرف دو لفظوں سے مرکب ہے، خدا کا حق اور بھائیوں کا حق، پہلے لفظ کا مظہر اعظم نماز اور دوسرے کا زکاة ہے، اس لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت حق جب بلند ہوئی تو اس پکا کی ہر آواز ان ہی دو لفظوں کی تفصیل و تشریح تھی، آنحضرتؐ جس طرح بعثت سے پہلے غار حرا میں چھپ کر خدا کی یاد (نماز) میں مصروف رہتے تھے اسی طرح بے کس اور لاچار انسانوں کی دست گیری (زکاة) بھی فرماتے تھے، حضرت خدیجہ الکبریٰ نے بعثت کے وقت آپ کی نسبت فرمایا، آپ قربت داروں کا حق پورا کرتے ہیں، قرضداروں کا قرض ادا کرتے ہیں، غریبوں کو کمواتے ہیں، مہمان کو کھلاتے ہیں، لوگوں کی مصیبتوں میں مدد دیتے ہیں، غور کرو کیا زکاة ان ہی فرائض کے مجموعہ کا نام نہیں ہے، اس بنا پر یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ نماز اور زکاة تو آم ہیں، ان ہی دو اجمالی حقیقتوں کی تشریح کا نام اسلام ہے۔“ (ص: ۵۵-۱۵۲)

زکاة کے جتنے افادی، شرعی اور فقہی پہلو ہیں ان سب پر اس باب میں مباحث ہیں جو کہیں خشک نہیں ہونے پائے ہیں، بلکہ طرز ادا کی دل نشینی کی وجہ سے ان کو پڑھنے میں لطیف نکتے اور شریعت کے اسرار کی محرمی جدید ذہن پر بھی آشکارا ہوتی نظر آتی ہے۔ روزہ کی اہمیت کو اس طرح سمجھاتے ہیں:

”روزہ اسلام کی عبادت کا تیسرا رکن ہے، عربی میں اس کو صوم کہتے ہیں جس کے لفظی معنی ”رکنے“ اور چپ رہنے کے ہیں، بعض مفسرین کی تفسیروں کے مطابق قرآن پاک میں اسی کو کہیں کہیں صبر بھی کہا گیا ہے جس کے معنی ضبط نفس، ثابت قدمی اور استقلال کے ہیں، ان معنوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی زبان میں روزہ کا کیا مفہوم ہے، وہ درحقیقت نفسانی ہوا و ہوس اور بھیخی خواہشوں سے اپنے آپ کو روکنے اور حرص و ہوا کے ڈگمگادینے والے موقعوں

میں اپنے آپ کو ضابطہ اور ثابت قدم رکھنے کا نام ہے۔ روزانہ استعمال میں عام طور سے نفسانی خواہشوں اور انسانی حرص و ہوا کا مظہر تین چیزیں ہیں یعنی کھانا، پینا اور عورت و مرد کے جنسی تعلقات، انہی سے ایک مہینہ کی مدت تک رکے رہنے کا نام شرعاً روزہ ہے لیکن دراصل ان ظاہری خواہشوں کے ساتھ باطنی خواہشوں اور برائیوں سے دل اور زبان کا محفوظ رکھنا بھی خواص کے نزدیک روزہ کی حقیقت میں داخل ہے۔ (ص: ۲۱۰)

رمضان شریف کی اہمیت کس اچھوتے اور موثر انداز میں بتاتے ہیں: ”رمضان وہ مقدس مہینہ ہے جس میں قرآن سب سے پہلی بار دنیا میں نازل ہوا اور پیغمبر اُمی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عالم کی رہنمائی اور انسانوں کی دست گیری کے لئے دستور نامہ الہی کا سب سے پہلا صفحہ عنایت کیا گیا۔ قرآن کا حامل اور اس وحی الہی کا مہبط ان دنوں غار حرا کے کونے میں یکہ وتہا، بھوکا اور پیاسا سربہ زانو تھا، اس بنیاد پر اس ماہ مقدس میں بھوکا اور پیاسا رہنا (روزہ) کسی عبادت گاہ میں یکہ وتہا (اعتکاف) رہنا زول وحی کی رات (لیلۃ القدر) میں بیدار و سربخود رہنا تمام پیروان محمدی کے لئے ضروری تھا کہ تم خدا کو پیار کرتے ہو تو میری پیروی کرو، خدا تمہیں پیار کرے گا۔“ (ص: ۲۱۹)

پھر اس باب میں دوسرے مذاہب میں روزے کی نوعیت، توراۃ، انجیل، ہندوؤں اور جینیوں میں اس کے متعلق تخیل، پھر اصول معاشرت کے ذریعہ اس کی تحلیل اور متشکل ذہن کے اعتراضات کو رد کرتے ہوئے کیسے دل نشیں پیروی میں لکھتے ہیں:

”یہ روزہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی صرف پیروی اور تقلید ہی نہیں بلکہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے اس عظیم الشان احسان کا شکریہ ہے جو اپنے پیغمبر صادق کے ذریعہ انسانوں پر کیا، شکریہ اور اس کی احسان شناسی کا احساس ہے، وہ کتاب الہی، وہ تعلیم ربانی، وہ ہدایت روحانی، جو ان ایام میں انسانوں کو عنایت ہوئی ہے، جس

نے ان کو شیطان سے فرشتہ اور ظلماتی سے نورانی بنایا، پستی و ذلت کے عمیق غار سے نکال کر ان کو اوج کمال تک پہنچا دیا۔ ان کی وحشت کو تہذیب و اخلاق، سے ان کی جہالت کو علم و معرفت سے، ان کی نادانی کو حکمت و دانائی سے و ان کی تاریکی کو بصیرت اور روشنی سے بدل دیا۔ جس نے ان کی نعمتوں کے پانسے الٹ دئے، اور فضل و دولت اور خیر و برکت کے خزانوں سے ان کے کاشانوں کو معمور کر دیا، جس نے ذرہ بے مقدار کو آفتاب اور مشیت خاک کو ہمدوش ثریا بنادیا۔ قرآن پاک اپنے ان الفاظ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے: ”اور یہ رمضان کا روزہ اس لئے فرض ہوا کہ تم اللہ تعالیٰ کی بڑائی کرو کہ تم کو اس نے ہدایت دی اور تاکہ تم اس کا شکریہ ادا کرو۔“ (ص: ۲۳۳)

طرز ادا کی یہ دل نشینی سیرۃ النبیؐ کی ہر جلد میں چھائی ہوئی ہے، یہ ہی وجہ ہے کہ اس کے مباحث کے تمام عوام مض اور دقائق کو سمجھنے میں وقت محسوس کرنے کے بجائے (وہ) دلوں میں خود بخود گھر کر جاتے ہیں۔ حج کے متعلق رقمطراز ہیں:

”حج اسلام کی عبادت کا چوتھا رکن اور انسان کی خدا پرستی اور عبادت کا پہلا اور قدیم طریقہ ہے۔ اس کے لفظی معنی قصد اور ارادہ کے ہیں اور اس سے مقصود خاص مذہبی قصد و ارادہ سے کسی مقدس مقام کا سفر ہے، لیکن اسلام میں یہ ملک عرب کے شہر مکہ میں جا کر وہاں حضرت ابراہیمؑ کی بنائی ہوئی مسجد خانہ کعبہ کے گرد چکر لگانے اور مختلف مقدس مقامات میں حاضر ہو کر کچھ آداب اور اعمال بجالانے کا نام ہے۔“ (ص: ۲۴۲)

اسی ایجاز کا اطناب پورے باب میں ہے، مکہ معظمہ میں کعبہ، مسجد حرام اور مسجد ابراہیمؑ کا ذکر کرنے کے بعد حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی، اس کے شرائط اور اس کی نوعیت بتائی گئی ہے، پھر خود قربانی کے اقتصادی، تجارتی، روحانی تاریخی، اخلاقی پہلوؤں کا

تجزیہ ہے، پھر حج کی پوری حقیقت پر بحث ہے، اس کے مناسک کی تفصیل ہے، پھر حج کی مصلحتیں اور حکمتیں بتائی گئی ہیں، ایک جگہ حج کی وجہ سے خانہ کعبہ میں جو مرکزیت پیدا ہو جاتی ہے اس پر جس طاقت و رانداز بیان سے اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے اس سے لطف لیا جاسکتا ہے۔ لکھتے ہیں:

”خانہ کعبہ اس دنیا میں عرش الہی کا سایہ اور اس کی رحمتوں اور برکتوں کا نقطہ مقدس ہے یہ وہ آئینہ ہے جس میں اس کی رحمت و غفاری کی صفتیں اپنا عکس ڈال کر تمام کرۂ ارض کو اپنی شعاعوں سے متور کرتی ہیں، یہ وہ منبع ہے جہاں سے حق پرستی کا چشمہ ابلا اور اس نے تمام دنیا کو سیراب کیا۔ یہ روحانی علم و معرفت کا وہ مطلع ہے جس کی کرنوں نے زمین کے ذرہ ذرہ کو درخشاں کیا، یہ وہ جغرافی شیرازہ ہے جس میں ملت کے وہ تمام افراد بندھے ہوئے ہیں جو مختلف ملکوں اور قبیلوں میں بستے ہیں، مختلف باتیں بولتے ہیں، مختلف لباس پہنتے ہیں، مختلف تمناؤں میں زندگی بسر کرتے ہیں، مگر وہ سب کے سب باوجود ان فطری اختلافات اور طبعی امتیازات کے ایک ہی خانہ کعبہ کے گرد چکر لگاتے ہیں، اور ایک قبلہ کو اپنا مرکز سمجھتے ہیں اور ایک ہی مقام کو ام القریٰ مان کر وطنیت، قومیت، تمدن، معاشرت، رنگ روپ اور دوسرے امتیازات کو مٹا کر ایک ہی وطن، ایک ہی قومیت (آل ابراہیم) ایک ہی تمدن و معاشرت (ملت ابراہیم) اور ایک ہی زبان (عربی) میں متحد ہو جاتے ہیں اور یہ وہ برادری ہے جس میں دنیا کی تمام قومیں اور مختلف ملکوں کے رہنے والے جو وطنیت اور قومیت کی لہنتوں میں گرفتار ہیں ایک لمحہ اور ایک آن میں داخل ہوتے ہیں جس سے انسانوں کی بنائی ہوئی تمام زنجیریں اور قیدیں اور بیڑیاں کٹ جاتی ہیں اور تھوڑے دن کے لئے عرصہ حج میں تمام قومیں ایک ملک میں ایک لباس احرام میں، ایک وضع میں دوش بدوش، ایک قوم بلکہ ایک خانوادہ کی برادری بن کر کھڑی ہوتی ہیں اور ایک ہی بولی میں خدا سے باتیں کرتی ہیں، یہی

وحدت کا وہ رنگ ہے جو ان تمام ماسوی امتیازات کو مٹا دیتا ہے، جو انسانوں میں جنگ و جدل اور فتنہ و فساد کے اسباب ہیں۔ اس لئے یہ حرم ربانی نہ صرف اس مہینہ میں امن کا گھر ہے کہ یہاں ہر قسم کی خونریزی اور ظلم و ستم ناروا ہے بلکہ اس لحاظ سے بھی امن کا گھر ہے کہ تمام دنیا کی قوموں کی برادری قائم کر کے ان کے تمام ظاہری امتیازات کو جو دنیا کی بدامنی کی اسباب ہیں مٹا دیتا ہے۔“ (ص: ۸۲-۸۱)

خانہ کعبہ کی اس فضیلت اور اہمیت سے حج کی پوری حقیقت بھی اوپر کی تحریروں سے ظاہر ہو جاتی ہے، اس طاقتور انداز بیان کی وجہ سے سیرۃ النبیؐ کی جلدیں مقبول ہیں۔ ہمارے ناظرین کو یہ پڑھ کر تعجب ہوگا کہ سید صاحب نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے، قرآن پاک اور حدیث نبویؐ میں جہاد کی فرضیت اور اہمیت بہت سے دوسرے فقہی احکام اور عبادات سے بدرجہا زیادہ ہے مگر سید صاحب نے جہاد کا جو مفہوم بتایا ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے، عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ دین کے دشمنوں سے جنگ کرنا جہاد ہے مگر سید صاحب کی تحریر کے ذریعہ سے اس کو سمجھئے، وہ لکھتے ہیں:

”جہاد کے معنی عموماً قتال اور لڑائی کے سمجھے جاتے ہیں مگر مفہوم کی یہ تنگی قطعاً غلط ہے، جہاد کا لفظ جہد سے نکلا ہے، جہاد اور مجاہدہ فعال اور مفاعلت کے وزن پر اسی ’جہد‘ سے مصدر ہیں، اور لغت میں اس کے معنی محنت اور کوشش کے ہیں، اس کے قریب اس کے اصطلاحی معنی بھی ہیں، یعنی حق کی بلندی، اس کی اشاعت اور حفاظت کے لئے ہر قسم کی جدوجہد قربانی اور ایثار گوارا کرنا، اور ان تمام جسمانی، مالی اور دماغی قوتوں کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو ملی ہیں اس کی راہ میں صرف کرنا، یہاں تک کہ اس کے لئے اپنے عزیز واقارب، اہل و عیال، خاندان اور قوم کی جان تک قربان کر دینا، حق کے مخالفوں اور دشمنوں کی کوششوں کو توڑنا، ان کی تدبیروں کو رائیگاں کرنا، ان کے حملوں کو روکنا، اور اسکے لئے اگر جنگ کے

میدان میں لڑنا پڑے تو اس کے لئے بھی پوری طرح تیار رہنا یہی جہاد ہے اور اسلام کا ایک رکن اور بہت بڑی عبادت ہے۔ (ص: ۱۰۹۹)

پھر جہاد کی یہ قسمیں بتائی ہیں:

۱۔ ”جہاد بالنفس: بہترین جہاد یہ ہے کہ انسان اپنے نفس اور اپنی خواہش کے خلاف جہد کرے، یہ جہاد اکبر ہے۔

۲۔ جہاد بالعلم: ایک انسان کے پاس اگر عقل، معرفت، علم اور دانش کی روشنی ہے تو اس کا فرض ہے کہ اس سے دوسرے تاریک دلوں کو فائدہ پہنچائے، تلوار کی دلیل سے قلب میں وہ طمانیت پیدا نہیں ہو سکتی ہے جو دلیل و برہان کی قوت سے لوگوں کے سینوں میں پیدا ہوتی ہے۔

۳۔ جہاد بالمال: انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو مال دولت عطا کی ہے، اس کا منشاء بھی یہ ہے کہ اس کو خدا کی مرضی کے راستوں میں خرچ کیا جائے، ایثار سے کام لے کر مسلمانوں کے ہر مفید کام میں سرمایہ خرچ کرنا جہاد بالمال ہے۔ قرآن مجید نے جان کے جہاد پر مال کے جہاد کو تہذیب بخشا ہے۔“

یہ سب کچھ لکھنے کے بعد وہ یہ بھی لکھتے ہیں:

”جہاد کے ان اقسام کے علاوہ ہر نیک کام اور ہر فرض کی ادائیگی میں اپنی جان، مال، دماغ کی قوت کو صرف کرنے کا نام بھی اسلام میں جہاد ہے“

ذرا سید صاحب کی یہ بات بھی غور سے سنئے:

”دائمی جہاد یہ ہے کہ ہر امتی، دین کی حمایت، علم دین کی اشاعت، حق کی نصرت، غریبوں کی مدد، زیر دستوں کی امداد، سیہ کاروں کی ہدایت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اقامت عدل، رد ظلم اور احکام الہی کی تعمیل میں ہمہ تن اور ہر وقت لگا رہے اس سے بہتر اور کیا جہاد ہو سکتا ہے، جہاد کو جس طرح سید صاحب نے سمجھایا ہے اس کا مطالعہ کھلے ذہن کے ساتھ اگر غیر مسلم بھی کریں تو جہاد کے

متعلق ان کی جو غلط فہمی ہے وہ چشم زدن میں دور ہو سکتی ہے۔“

سید صاحب نے اس طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ اسلام میں جسمانی اور مالی عبادت کے علاوہ قلبی عبادات بھی ہیں جن کا تعلق نفس کی اندورنی کیفیتوں سے ہے، سید صاحب کے خیال میں اس قلبی عبادت میں سرفہرست تقویٰ ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام تعلیمات کا خلاصہ ہے بلکہ روح ہے، اس کی تصریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”عربی زبان میں اس کے لغوی معنی نیچے، پرہیز کرنے اور لحاظ کرنے کے ہیں،

لیکن وحی محمدی کی اصطلاح میں یہ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہمیشہ حاضر و ناظر ہونے کا یقین پیدا کر کے دل میں خیر و شر کی تمیز کی خلش، اور خیر کی رغبت، اور شر سے نفرت پیدا کر دیتی ہے، دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا

ہے کہ وہ ضمیر کے اس احساس کا نام ہے جس کی بناء پر ہر کام میں خدا کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے، تقویٰ والا وہ ہے جو اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں سچائی لے کر آئے اور اس ابدی سچائی کو سچ مانے، وہ کسی کام میں ظاہری فائدہ، فوری ثمرہ، مال و دولت اور

جاہ و منزلت کے نقطہ پر نہیں، بلکہ سچائی کے پہلو پر نظر رکھتا ہے اور خواہ کسی

قدر بظاہر اس کا نقصان ہو مگر وہ سچائی اور راست بازی کے جادہ سے بال بھر بٹنا نہیں جانتے، جب وہ ہر کام میں خدا کی مرضی اور پسندیدگی پر نظر رکھتے ہیں تو

اللہ تعالیٰ بھی ان کو اپنی طرف سے اپنے انعام اور محنت کا صلہ عطا فرماتا ہے، اور

بڑا صلہ یہ ہوتا ہے کہ دنیا ہی میں بندوں کے درمیان، ان کے ساتھ عقیدت،

محبت اور ہر لعزیزی پیدا ہوتی ہے۔“ (ص: ۱۶-۲۱۳)

کیسی دل آویز تصریح ہے، سید صاحب نے اخلاص کو بھی قلبی عبادت بتایا ہے اور

لکھتے ہیں کہ:

”اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جو نیک کام بھی کیا جائے اس کا محرک کوئی دنیاوی غرض



نہ ہو، اور نہ اس سے مقصود ریا، نمائش، جلب منفعت، طلب شہرت یا طلب معاوضہ وغیرہ، بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری اور خوشنودی ہو، اسی کا نام اخلاص ہے۔“ (ص: ۳۳۰)

یہ پڑھئے اور اپنے دل کے اندر ایک دنیا آباد کر لیجئے۔

سید صاحب نے توکل کو بھی قلبی عبادت میں شمار کیا ہے اور کلام پاک کی بہت سی آیتوں کے ذریعہ یہ ثابت کیا ہے کہ توکل، بے دست و پائی اور ترک عمل کا نہیں بلکہ اس کا نام ہے کہ پورے عزم، ارادہ اور مستعدی سے کام کو انجام دینے کے ساتھ، اثر اور نتیجہ کو خدا کے بھروسہ پر چھوڑ دیا جائے، اور یہ سمجھا جائے کہ اللہ تعالیٰ مددگار ہے تو کوئی ہم کو ناکام نہیں کر سکتا، اور اگر وہی نہ چاہے تو کسی کی کوشش و مدد کارآمد نہیں ہو سکتی ہے، اس لئے ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اپنے ہر کام میں خدا پر بھروسہ رکھے۔ سید صاحب نے اس پر بھی زور دیا ہے کہ توکل کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ کسی کام کے لئے جدوجہد اور کوشش نہ کی جائے بلکہ چپ چاپ ہاتھ پاؤں توڑ کر کسی حجرہ یا خانقاہ میں بیٹھ رہا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ خدا کو جو کچھ کرنا ہے وہ خود کرے گا، یعنی تقدیر میں جو کچھ ہے وہ ہو کر رہے گا، اسباب اور تدبیر کی ضرورت نہیں، لیکن یہ سراسر وہم ہے اور مذہبی اپاہجوں کا دل خوش کن فلسفہ ہے، جس کو اسلام سے ذرہ برابر بھی تعلق نہیں سید صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ توکل، قلبی یقین کا نام ہے اسی کے قریب آج کل کے اخلاقیات میں خود اعتماد کا لفظ بولا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ کامیاب افراد وہی ہوتے ہیں جن میں یہ جوہر پایا جاتا ہے، لیکن اس خود اعتمادی کی سرحد سے بالکل قریب غرور اور فریب نفس کے گڈھے اور غار بھی ہیں، اس لئے اسلام نے انانیت کی خود اعتمادی کے بجائے خدا اعتمادی کا نظریہ پیش کیا ہے جو ان خطروں سے محفوظ ہے۔ توکل پر جو کچھ سید صاحب نے لکھا ہے، اس کو پڑھ کر ناظرین اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ان کے ذہن کی تاریکی میں اجالا پیدا ہو گیا ہے، اور اس اُجالے میں ایک ایسا نور آگیا ہے جس سے ان کا فہم و ادراک متور ہو گیا ہے اور پھر ان کو زندگی میں

جدوجہد کرنے کا ایک نیا لائحہ عمل مل گیا ہے۔ سید صاحب نے صبر کو بھی قلبی عبادت میں شمار کیا ہے اور یہ سمجھا یا ہے کہ:

”صبر بے بسی اور بے کسی یا دشمن سے کسی مجبوری کے سبب سے انتقام نہ لینے کا نام نہیں، لغوی معنی تو اس کے روکنے اور سہارنے کے ہیں، معنوی حقیقت اس کی یہ ہے کہ اپنے نفس کو اضطراب اور گھبراہٹ سے روکا اور اس کو اپنی جگہ پر ثابت قدم رکھا جائے یعنی مقصود، لاعلمی کی حالت میں غیر معمولی واقعات کے پیش آنے میں اضطراب اور بے چینی پیدا نہ ہونے دیا جائے، اس کی بھی کئی قسمیں ہیں (۱) ہر قسم کی تکلیف اٹھا کر اپنے مقصد پر جسے رہ کر کامیابی کے وقت کا انتظار کرنا (۲) مصیبتوں اور مشکلوں میں اضطراب اور بے قراری کا اظہار نہ کرنا بلکہ ان کو خدا کا حکم اور مصلحت سمجھ کر خوشی خوشی بھیلنا (۳) منزل مقصود کی راہ میں جو خطرات پیش آئیں یا دشمن جو تکلیفیں پہنچائیں یا مخالفین جو طعن و طنز کریں ان سے بد دل اور پست ہمت ہونے کے بجائے زیادہ استقلال اور استواری پیدا کرنا (۴) برائی کرنے والوں کی برائی کو نظر انداز کر کے ان کے قصور کو معاف کرنا، اسی میں بہت بڑی بہادری ہے (۵) لڑائی پیش آ جانے کی صورت میں میدان جنگ میں بہادرانہ استقامت اور ثابت قدمی دکھانا۔“ (ص: ۲۵۲)

یہ تمام نکات، قرآن مجید کی روشنی میں پیش کئے گئے ہیں، اور ان کو قلمبند کرنے کا انداز یہ ہے کہ وہ مفسر قرآن ہونے کے ساتھ ساتھ ماہر نفسیات و فلسفہ بھی نظر آتے ہیں، باتیں تو کلام پاک کی ہوتی ہیں لیکن انداز بیان ایسا ہوتا ہے کہ پڑھنے والے محسوس کرتے ہیں کہ وہی چیزیں لکھی جا رہی ہیں جن کی ان کو تلاش تھی، شکر کو بھی قلبی عبادت میں شمار کیا ہے، لکھتے ہیں:

”اللہ پاک کے احسانوں اور نعمتوں کو بھلا کر دل سے اس کا احسان مند نہ بننا، زبان سے ان کا اقرار اور عمل سے اپنی اطاعت شعاری اور فرمانبرداری ظاہر نہ کرنا کفر ہے، جس کے مرتکب کا نام کافر ہے، اس کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کے احسانات اور نعمتوں کی قدر جان

کر اس کے احکام کی اطاعت اور دل سے فرمانبرداری کرنے کا نام شکر ہے۔

پھر قرآن مجید کی بہت سی آیتوں کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”بندوں کے ساتھ حسن سلوک اور نیک ہونے کی حقیقت بھی شکر ہے، دولت مند اگر اپنی دولت کا کچھ حصہ خدا کی راہ میں دیتا ہے تو یہ دولت کا شکر ہے، صاحب علم اپنے علم سے بندگان الہی کو فائدہ پہنچاتا ہے تو یہ علم کی نعمت کا شکر ہے، طاقتور، کمزوروں کی امداد اور اعانت کرتا ہے تو یہ بھی قوت و طاقت کی نعمت کا شکرانہ ہے۔“ (ص: ۳۵۸)

ایسی عبارت کوئی عارف ہی لکھ سکتا ہے، اس سلسلہ میں جن آیتوں کی تفسیر لکھی گئی ہے، ان کو پڑھ کر یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ ہم کوئی وعظ سن رہے ہیں، یا عربی زبان میں کچھ پڑھ رہے ہیں، بلکہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شہد ہم کو پلایا جا رہا ہے اور ہم خوش خوش اس کو پی رہے ہیں۔ پوری کتاب پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوگا کہ اس میں ہم پرستوں اور غلط فہمیوں کے پردے چاک کے گئے ہیں، عبادت کے حقائق واضح کئے گئے ہیں، عبادت کے جو طریقے بتائے گئے ہیں وہ کس قدر مکمل ہیں اور دنیا کی مصلحتوں اور فائدوں پر مشتمل ہیں، اور پھر خود آنحضرت نے ان پر عمل کر کے متعین شاہراہ بھی بتا دی ہے جس پر چلنے کے لئے مزید ہدایت دینے کے لئے کسی اور پیغمبر کی ضرورت نہیں۔

اتنا کچھ پڑھنے کے بعد اگر طوالت گراں خاطر نہ ہو تو سید صاحب نے سیرۃ النبیؐ کی اپنی پانچوں جلدوں کے لکھنے میں جو انداز اختیار کیا ہے یا جن مآخذوں سے استفادہ کیا ہے، یا ان جلدوں کی جو امتیازی خصوصیات ہیں ان پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے، استفادہ سے خالی نہ ہوگا۔

مولانا شبلیؒ نے اپنی سیرۃ النبیؐ جلد اول میں سیرت لکھنے میں کچھ اصول اپنائے ہیں۔ جن کو مختصر طریقہ پر اس طرح ادا کیا جاسکتا ہے کہ سب سے پہلے سیرت کے واقعات کے متعلق جو کچھ قرآن مجید میں مذکور ہے ان کو سب پر مقدم رکھا جائے کیونکہ بہت سے واقعات کے

متعلق خود قرآن مجید میں ایسی تصریحات یا اشارے موجود ہیں جن سے اختلافی مباحث کا فیصلہ ہو جاتا ہے، قرآن مجید کے بعد حدیث کا درجہ ہے، احادیث صحیحہ کے سامنے عام سیرت کی کتابوں کی روایتیں نظر انداز کی جاسکتی ہیں، جو واقعات بخاری و مسلم میں مذکور ہیں ان کے مقابلہ میں سیرت یا تاریخ کی روایت کی کوئی ضرورت نہیں، اگر عام استقرا اور تفحص سے کام لیا جائے تو تمام اہم واقعات میں صحاح ستہ کی روایتیں مل جاتی ہیں، بصورت اختلاف روایات احادیث کے رواۃ اور باب فقہ و ہوش کی روایات کو دوسروں پر ترجیح دینی چاہئے۔

سید صاحبؒ نے ان اصولوں کی پابندی سختی سے کی، سوانح حیات کے واقعات تو پہلی اور دوسری جلد میں مولانا شبلی قلمبند کر چکے تھے بقیہ جلدوں میں سید صاحب کے اصلی مآخذ قرآن اور احادیث ہی ہیں، وہ جو کچھ لکھتے ہیں اس کی سند قرآن مجید سے پیش کرتے ہیں، ان کی پانچوں جلدوں میں قرآن مجید کی آیتیں اس فراوانی سے نقل کی گئی ہیں کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید ہی کوئی آیت چھوٹ گئی ہو جس کا ذکر ان پانچ جلدوں میں نہ آیا ہو، ان آیتوں کے ترجمے وہ خود سلیمس، فصیح اور شیریں اردو میں کرتے جاتے ہیں، جس کے پڑھنے میں لطف آتا ہے، پھر ان آیتوں کے جو رموز و نکات بیان کرتے ہیں اس میں تفسیر کے بجائے حقائق کی گتھیاں سلجھتی نظر آتی ہیں۔ اور شاید بڑے سے بڑے علماء کو ان میں امام تیمیہ کی روح، امام رازی کا دماغ اور امام غزالی کی نگاہ دکھائی دیتی ہوگی، اور پھر ان جلدوں میں یہ نمایاں خصوصیات بھی ہیں کہ قرآن پاک کی آیتوں کی تفسیر بتاتے ہوئے ان میں سے کسی تفسیر کا سہارا نہیں لیا، کہیں کہیں تفسیر کبیر، تفسیر ابن کثیر اور زخشری وغیرہ کا ذکر آیا ہے لیکن ان کی حیثیت مآخذ کی نہیں بلکہ زیر مطالعہ کی رہی ہے، سید صاحب کو قرآن پاک کے معانی مطالب کو سمجھنے میں اپنی ہی ادراک اور بصیرت پر زیادہ بھروسہ رہا جن کی روشنی ان کے قلم میں منتقل ہو کر کاغذ کے صفحات پر پھیلتی رہی۔

وہ قرآن مجید کے بعد احادیث کا سہارا لیتے ہیں، اس لئے ان کی لکھی ہوئی جلدوں میں صحیح بخاری، صحیح مسلم، ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی، مستدرک حاکم، سنن

دارمی، مشکوٰۃ، مسند احمد بن حنبل، مسند عبد اللہ ابن مسعود، سنن ابن ماجہ، موطا امام مالک، کنز العمال وغیرہ کے حوالے بکثرت ہیں، لیکن سید صاحب نے اپنی محتاط طبیعت کی بناء پر روایات کے رد و قبول میں کوئی مناظرانہ رنگ پیدا ہونے نہیں دیا ہے، اور نہ ان کے نقد و جرح میں الجھے ہیں بلکہ روایت و درایت کے جو مستند اور معتبر اصول ہیں ان ہی کے پابند ہو کر اپنی ساری تحریریں قلمبند کی ہیں۔

زبور، توراۃ اور انجیل کے حوالے بھی ان جلدوں میں ملیں گے، سید صاحب ایمان بالکتاب کے قائل تھے، یعنی وہ اس کو تسلیم کرتے تھے کہ حضرت داؤدؑ پر زبور، حضرت موسیٰؑ پر توراۃ اور حضرت عیسیٰؑ پر انجیل اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئیں مگر وہ ان موجودہ آسمانی صحائف کو تحریف شدہ سمجھتے رہے، پھر بھی ان میں جو تعلیمات دی گئی ہیں ان کا موازنہ قرآن کی تعلیمات سے کر کے اسلامی تعلیمات کی برتری دکھاتے ہیں، وہ قرآن پاک کو پہلے آسمانی صحائف کی تکمیل قرار دیتے ہیں۔

ہندومت کی بعض تعلیمات کے ذکر میں ستیا رتھ پرکاش کو پیش نظر رکھا ہے، بعض مباحث میں افلاطون اور ارسطو کے اقوال تو نقل کئے ہیں لیکن ان کی کتاب کے نام نہیں لکھے ہیں۔

مشاہیر اسلام میں سیرت ابن اسحاق اور سیرت ابن ہشام کے حوالے تو آتے ہیں لیکن آخری پانچوں جلدوں میں ان کے حوالے برائے نام ہیں، کیونکہ ان کا تعلق زیادہ تر پہلی دوسری جلد کے واقعات سے تھا، دو جلدوں میں علامہ شبلی نے ان کا کافی ذکر خیر کیا ہے، واقدی کا بھی ایک دو جگہ ذکر آگیا ہے مگر وہ واقدی کی روایت کو ساقط لا اعتبار قرار دیتے ہیں۔

منصب نبوت کے مباحث میں امام غزالی کی صباح القدس کا حوالہ آیا ہے اور اس کے کچھ حصے بھی نقل کئے ہیں۔ اسی سلسلے میں شاہ ولی اللہؒ کی حجۃ اللہ البالغہ کے بھی اقتباسات دئے ہیں، وہ حجۃ اللہ البالغہ سے بہت متاثر تھے۔ اس کے اقتباسات جا بجا ہیں، شاہ ولی اللہؒ کی فوز الکبیر بھی ان کے پیش نظر رہی۔

ضرورۃً شرح مواہب، حافظ ابن قیم کی زاد المعاد، لسان المیزان ترجمہ محمد بن بشر بن لبان السکری، شرح تحریر ابن ہمام، کتاب الفہرست، کتاب الخراج والا مارة، سفرنامہ ابو زید سیرانی، احسن التقاسیم مقدسی، لسان العرب، کتاب الاصنام ہشام (کلبی) معجم البلدان، طبقات الامم، کتاب البیان والتبيين للجاحظ، عقد الفرید ابن عبد ربہ، کتاب المعارف ابن قتیبہ، مجمع الفوائد، طبقات ابن سعد بھی زیر مطالعہ رہی ہیں۔

تاریخی واقعات کے سلسلہ میں عربی میں تاریخ طبری، تاریخ ملوک الارض حمزہ اصفہانی، مقدمہ ابن (خلدون)، تاریخ الخلفاء سیوطی، تاریخ الیہود لبلاد العرب واسرائیل کی طرف کہیں کہیں رجوع کیا۔

عیسائیوں کی تاریخ کے بعض پہلوؤں کی وضاحت گبن کی تاریخ زوال انحطاط روم، ڈریپر کی تاریخ معرکہ آرائی مذہب و سائنس، لیکلی کی تاریخ اخلاق یورپ کے ذریعہ سے کی ہے، کہیں کہیں انسائیکلو پیڈیا آف اسلام اور جارج سیل کے انگریزی ترجمہ قرآن کے دیباچہ کے بھی حوالے ہیں، ہندوستان کی تاریخ کے کسی واقعہ کے ذکر میں آرسی، دت کی تاریخ ہند اور مارس کی تاریخ ہندوستان کے حوالے ہیں، جلد چہارم کی ابتدا امیر خسرو کے نعتیہ اشعار سے کی ہے، ایک جگہ مولانا حمید الدین فراہی کے عربی میں نعتیہ اشعار بھی نقل کئے ہیں۔

ان جلدوں کے لکھنے میں جو محنت اور ریاضت کی گئی اس کی قدر جتنی بھی کی جائے کم ہے۔ مگر ان کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں جو کچھ لکھا گیا ہے ان کا انداز بیان بہت ہی جاندار اور باوقار ہے۔ اور یہ انداز بیان ایسا ہے کہ دنیا کی کسی زبان کے عظیم ترین مصنفوں کے اسلوب کے مقابلہ میں رکھا جاسکتا ہے اس میں غیر معمولی قسم کی متانت ہے، سنجیدگی ہے، وزن ہے، شگفتگی ہے، روانی ہے، اور اسی کے ساتھ ایسا زور بیان بھی ہے جس سے کبھی جذبات میں تلاطم، کبھی احساسات میں تموج پیدا ہو جاتا ہے، کبھی ذہن کی تاریکی میں چاندنی پھیل جاتی ہے، علامہ شبلی نعمانی کی نثر نگاری کا وصف اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ سرسید نے ایک کان سے اردو کی نثر نگاری کا ایک ہیرا نکالا، حالی نے اس میں غیر

معمولی جلا پیدا کی اور نذیر احمد، محمد حسین آزاد نے اس میں اور چمک دمک پیدا کی، مگر جس نے اس ہیرے کے کوہ نور بنایا وہ علامہ شبلی نعمانی ہیں، اسی کوہ نور کا پر تو ان کے شاگرد مولانا سید سلیمان ندویؒ کی تحریر میں دکھائی دیتا ہے، کسی حسین صبح، کسی رنگین شام، کسی گلشن کے گل سرو و صنوبر کی منظر نگاری میں انشاء پر دازی خوب ساتھ دیتی ہے، بلبل کی نغمہ سرائی، سبزہ کی لہلہا ہٹ، دریا کی موجوں کی روانی، یا کسی عاشق نامراد کی تپش دل اور سوز جگر یا کسی کی نظر کی بارد گر یا کسی عیش کی محفل میں پروانوں کے ماتم کی مرقع آرائی کرنے میں طرز انشاء، قلم کی رہبری خوب کرتا ہے، لیکن محقق یا مفسر یا محدث یا متکلم بن کر انشاء کا جو ہر دکھانا اور نشر نگاری کی رنگارنگی کا اظہار کرنا تلوار کی دھار پر چلنے سے کم نہیں ہے، مگر سید صاحب اس دھار پر کامیابی سے چلتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان جلدوں میں ان کی بعض تحریروں کے ٹکڑے ادبی شہ پارے قرار دئے جاسکتے ہیں اور شروع سے آخر تک اُن کی زبان اور انشاء پر دازی کی جو ہمواری اور یکسانیت ہے وہ اُن کے قلم کا اعجاز قرار دیا جاسکتا ہے۔

مضمون کی کچھ قسمیں بھی ہیں عنکبوتی، نملی، نخلی، عنکبوتی تو وہ ہیں جو عنکبوت یعنی کڑی کی طرح اپنی تحریروں کے جالے بن کر اپنے کو مطمئن کر لیتے ہیں، نملی وہ ہیں جو اپنی تحریروں میں چوٹیوں کی طرح ادھر ادھر سے اپنے خیالات کے ذرے اور ریزے جمع کر کے ایک انبار لگا دیتے ہیں، نخلی وہ ہیں جو شہد کی مکھیوں کی طرح اپنی تحریروں میں خیالات کے شہد جمع کر دیتے ہیں، سید صاحب اپنی تحریروں میں محقق بھی ہیں، مفسر بھی ہیں، محدث بھی ہیں اور متکلم بھی ہیں، اپنی تحقیق میں عنکبوتی نہیں نظر آتے ہیں، اور نہ مفسر و محدث بن کر نخلی دکھائی دیتے ہیں، بلکہ محقق ہوں یا مفسر ہوں یا محدث ہوں، یا متکلم ہوں، نخلی بن کر اپنے ناظرین کو محظوظ کرتے ہیں۔ وہ اسلامی علوم و فنون کے پھولوں سے رس نچوڑ کر اپنی تحریروں کے ذریعہ تحقیق، تفسیر، حدیث اور کلام کے شہد کا جوہار بلکہ رودبار بہاتے رہتے ہیں، کوئی اس سے اتفاق نہ کرے تو اس کو اختلاف کرنے کے حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا، مگر کوئی یہ رائے قائم کرے تو اس کو اس کی رائے کے قائم کرنے سے کسی کو چھیننے کا حق بھی نہیں۔

سیرت النبیؐ کی مختلف جلدیں لکھتے وقت سید صاحب کو برابر یہ خیال رہا کہ ان میں وہ پورے اسلام کو منتقل کر دیں، پہلے سیرت میں زیادہ تر مغازی، اخلاق اور شائل نبویؐ قلمبند کئے گئے، لیکن ان ساتوں جلدوں میں اسلام کے گونا گوں پہلو دکھائے گئے ہیں جن سے یہ اسلامی تعلیمات کی دائرۃ المعارف بن گئی ہیں، ان میں ہر قسم کی معلومات اس طرح ترتیب دی گئی ہیں کہ آج کل کے مستشرقین اپنے اپنے قصور نظر کی وجہ سے اسلام اور اسلامی تعلیمات پر جتنے اعتراضات کرتے ہیں ان سب کے جوابات ان میں مل جائیں گئے، بشرطیکہ ان کا مطالعہ گھلے ذہن سے کیا جائے۔ پوری جلدوں میں اسلام کی جامعیت اور کاملیت کا ایک ایسا مرقع پیش کیا گیا ہے کہ یہ جدید علم کی معرکہ الآراء کتابیں بھی بن گئی ہیں، اور جب ہندوستان میں مسلمانوں کی عظیم الشان سلطنت ختم ہوئی اور انگریزوں کا چکا چوند کرنے والا تمدن آگیا تو اُس وقت مسلمان ایسے مرعوب اور مسحور ہو رہے تھے کہ اپنے مذہب سے بیگانہ ہو کر مغربی تہذیب کی نقل و تقلید ہی کو اپنے لئے نجات کا ذریعہ سمجھنے لگے تھے اور ان کو اپنے دینی علوم بلکہ دینی روح سے بے رغبتی ہونے لگی تھی اس بے رغبتی اور بیگانگی سے عیسائی مشنریوں نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، ان کی مدد مستشرقین نے کی، جو خود مسلمانوں کی کتابوں سے غلط اور غیر معتبر واقعات و روایات ڈھونڈھ کر اور صحیح روایات میں تدلیس اور ملمع سازی کر کے علم و تحقیق کے نام پر اسلام کی ایسی بدنما شکل پیش کرنی شروع کی، خود مسلمانوں کو اپنی مذہبی تعلیمات سے وحشت ہونے لگی، اس کو دور کرنے کے لئے جہاں اور کوشش کی گئیں وہاں اس زہر کا تریاق سیرۃ النبیؐ کی جلدوں کے ذریعہ سے بھی پیش کیا گیا، ان میں اسلام کی صداقت، عظمت، حقانیت اور جلالت کا ایسا نقشہ پیش کیا گیا کہ مسلمانوں کے طرز فکر کا زہر ہلا ہل دور ہوتا چلا گیا، اسی لئے یہ جلدیں جدید علم کلام میں شمار کئے جانے کے لائق سمجھی گئیں۔

## حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی سیرۃ النبیؐ جلد ششم پر ایک طالب علمانہ نظر

کراچی سے دینہ ایسوسی ایشن کی طرف سے حضرت سید صاحب کی صد سالہ سالگرہ کے جشن کے لئے برادر م شمیم دسنوی نے کوئی مضمون لکھنے کی فرمائش کی تو خیال ہوا کہ ان کی نجی زندگی پر مقالہ تیار کروں۔ لکھنے بیٹھا تو قلم سے بے اختیار نکلا کہ:

ان کے چہرے پر نظر پڑتی تو سنجیدگی اور متانت کے پھول اس پر بکھرے نظر آتے۔ اس کی سپیدی ایسی تھی جیسے کنول کا وہ رنگ ہو جو ابھی بالکل کھلا نہیں ہے بلکہ کھلنے والا ہے، چہرے پر دراڑھی ایسی دکھائی دیتی جیسے کسی صنایع نے ریشم کے خوبصورت، نرم اور باریک دھاگوں میں اپنی صنعت گری دکھائی ہے۔ آنکھوں کی پلکیں کہتیں کہ کسی کی طرف بھولے سے بھی نہ اٹھی ہوں گی لب ایسے کہ شاید کسی ناروا بات کے لئے کبھی نہ کھلے ہوں گے، جبیں کشادہ تو نہ تھی لیکن دیکھنے والے کہہ سکتے تھے کہ یہ حقیقت منتظر کو لباس میں دیکھنے کے لئے معلوم نہیں سجدوں میں کتنی بار ٹپتی رہی ہوں گی، کا ندھ جھکے جھکے تھے جیسے کسی بار کو اٹھائے ہوئے ہیں، اس سے ان کا جسم بھی دب گیا تھا، ان کے ہم نشین کہتے کہ یہ بار علم کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے، ان کی انگلیاں دیکھ کر بے ساختہ کہنا پڑتا کہ یہ صرف قلم پکڑنے ہی کے لئے بنائی گئی ہیں۔ ان کے پاؤں پردے کی آڑ سے کوئی دیکھتا تو کہہ اٹھتا کہ یہ کسی نازنین کے پاؤں ہی ہو سکتے ہیں، وہ چلتے تو معلوم ہوتا کہ وزن اور وقار ان کے قدموں کو

چوم رہے ہیں، وہ کھانا تناول فرماتے تو لقمے اٹھاتے وقت ایسا ظاہر ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت کا شکریہ ادا کر رہے ہیں، کھاتے وقت کام و دہن کی ستر پوشی کا لحاظ رکھتے، اس میں ان کے والد ماجد کی تربیت کا بھی بڑا اثر تھا، بہت چھوٹے سے تھے، والد صاحب کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے، لقمہ چپاتے میں منہ سے آواز نکل پڑی، والد نے ان کے گال پر ایک طمانچہ یہ کہہ کر مارا کہ تمیز سے کھانا کھاؤ، اس کی ضرب ان کو زندگی بھر یاد رہی، وہ اپنے والد بزرگوار سے سامنے آخر وقت تک اس طرح بیٹھتے کہ معلوم ہوتا کہ ادب پیکر محسوس بن گیا ہے، وہ اپنے بڑے بھائی سے بارہ برس چھوٹے تھے لیکن شروع سے ان کا احترام اسی طرح کرتے جس طرح اپنے والد بزرگوار کا کیا کرتے تھے۔

والدہ کے پاس ہوتے تو ان کو محسوس ہوتا کہ کونین کی دولت ان کے پاس سمٹ آئی ہے۔ ان کو اپنے گاؤں سے بھی محبت رہی، ان کے لئے کوچے کوچے نہ تھے بلکہ اوراق مصور تھے، یہاں کی ہر شکل ان کو تصویر نظر آتی، چھٹیوں میں یہاں آتے اور جب جانے لگتے تو دیکھنے والے ان کی آنکھوں کو اشکبار پاتے۔ ان کا آبائی گھر قدیم وضع کا بنا ہوا تھا لیکن اس کے اندر داخل ہوتے تو ان پر وہی کیفیت طاری ہو جاتی جو شاہ جہاں کے اپنے لال قلعہ میں داخل ہوتے وقت ہوتی ہوگی۔ گاؤں میں ان کے رشتہ کے چچا جناب سید عبدالحکیم صاحب تھے، آخر آخر وقت تک ان کے ایسے گردیدہ رہے کہ یورپ یا ہندوستان کے کسی گوشہ میں ہوں ان کو ضرور خطوط لکھتے، ان کی ایک ہموطن بوڑھی خاتون ان کو سلو کہہ کر مخاطب کرتیں، سلو کی آواز سن کر ان کے کان فردوس گوش بن جاتے، ان کے ایک ہم وطن مظفر امام مرحوم تھے، علی گڑھ میں تعلیم پا کر ڈپٹی کلکٹر ہو گئے تھے لیکن جوانی میں وفات پا گئے تو ایسے غمزدہ ہوئے کہ ایک مکتوب میں تحریر فرمایا کہ خدا کی قسم میرے دونوں بچے مر جاتے تو اتنا نہ غم ہوتا، راقم کے والد جناب محی الدین مرحوم بھی ڈپٹی کلکٹر نامزد ہوئے تھے لیکن عہدہ پر مامور ہونے سے پہلے اللہ کو پیارے ہوئے۔ ان کی وفات پر بڑا درد انگیز مرثیہ لکھا، اور جب یہ راقم دارالمصنفین ان کے سایہ عاطفت میں پہنچا تو فرمایا

کہ محی الدین مرحوم کا جو حق ادا نہ کر سکا تھا اب اس کو ادا کرنا ہے۔ دیسنہ کے بڑے پاکیزہ بزرگ جناب حافظ مختل حسین صاحب مرحوم مولانا فضل الرحمن گنج مراد آبادی کے بڑے چہیتے خلیفہ تھے، ان کی وفات پر جو مضمون لکھا اس میں وطن کی محبت کے جو ابدار موتی جھلملاتے نظر آتے ہیں، گاؤں والے بلکہ اس سے باہر کے لوگ بھی لطف اندوز ہوئے، بچپن میں ان کے بڑے بھائی گاؤں کی عورتوں کی اصلاح کے لئے پردے کی آڑ سے و عطا کیا کرتے تھے۔ اس میں وہ ان سے حضرت شاہ اسماعیل شہید دہلوی کی تقویۃ الایمان پڑھواتے اس کتاب کا اثر ان پر آخر وقت تک رہا، اپنی ایک تحریر میں لکھا کہ اس کو پڑھ کر جن باتوں نے پکڑی تھیں وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکیں، علم کلام کے مسائل، اشاعرہ و معتزلہ کے نزاعات، غزالی، رازی اور ابن رشد کے دلائل یکے بعد دیگرے نگاہوں سے گزرے لیکن اسماعیل شہید کی تلقین اپنی جگہ پر رہی۔

اتنا لکھ چکا تھا کہ یکا یک سید صاحب کی سیرۃ النبی کی جلدوں کا مطالعہ شروع کیا اور تاثرات قلمبند کرنے لگا تو یہ بہت طویل ہوتا چلا گیا، اس کا ایک حصہ دیسنہ ایسوسی ایشن کے لئے بھیج رہا ہوں تاکہ وہاں پڑھا جاسکے یا کسی مجموعہ میں چھپ سکے، سامعین غور سے پڑھیں گے تو اس میں حضرت سید صاحب نے جو باتیں بتائیں ہیں ان سے بہت کچھ سیکھا جاسکتا ہے۔

سیرۃ النبی جلد پنجم کی اشاعت کے پانچ سال کے بعد جلد ششم ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی جس کی ضخامت ۸۸۸ صفحات ہے، اس وقت تک سید صاحب کی عمر پچپن سال کی ہو چکی تھی لیکن کتاب کی ضخامت، اس کے اندر قلم کی روانی، تحریر کی متانت کے ساتھ اس کے نکتہ ورائہ اور دیدہ ورائہ مباحث سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تصنیف زندگی میں کہولت کے بجائے پہلے کی طرح رعنائی اور دل آویزی قائم اور برقرار تھی، انداز تحریر میں پہلے تو زبان کا تلاطم اور تموج تھا، اس جلد میں ان تلاطم اور تموج کے اندر سے ادب و انشاء کے درہائے شہور اسطرح پر آکر رولتے نظر آتے ہیں۔ طرز ادا میں فکر کی گہرائی کے ساتھ گیرائی بھی ہے اور قلم میں متانت اور سنجیدگی پہلے سے اور بھی زیادہ بڑھی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

اس جلد میں پہلے اسلام میں اخلاق کی اہمیت بتائی گئی ہے اور اس پر زور دیا گیا ہے کہ تعلیم محمدی نے اخلاق کی اہمیت کو عبادت سے زیادہ بڑھا دیا ہے۔ اس کی تصریح اس طرح کی گئی ہے کہ اخلاق حقوق عبادت یعنی باہمی انسانوں کے معاملات اور تعلقات کا نام ہے اور عبادت حقوق اللہ یعنی خدا کے فرائض ہیں، اللہ تعالیٰ نے ارحم الراحمین ہونے کی وجہ سے شرک اور کفر کے سوا ہر گناہ کو قابل معافی قرار دیا ہے۔ مگر حقوق عبادت یعنی باہمی انسانوں کے اخلاقی فرائض کی کوتاہی اور تقصیر کی معافی اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں نہیں بلکہ ان بندوں کے ہاتھوں میں رکھی ہے جن کے حق میں ظلم و تعدی ہوتی ہو۔ وہ معاف کر دیں تب ہی ارحم الراحمین کی بے نیاز ذات سے معافی کی توقع کی جاسکتی ہے، پھر بہت ہی خوبصورت انداز میں یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام کے ارکان پنج گانہ یعنی ایمان، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے نام الگ الگ جو کچھ ہوں مگر ان کے بنیادی مقاصد میں اخلاقی تعلیم کا راز مضمر ہے۔ اگر ان عبادات سے یہ روحانی اور اخلاقی ثمرہ ظاہر نہ ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ احکام الہی کی محض لفظی تعمیل ہے مگر عبادت کے جوہر معنی سے یکسر خالی اور معرا ہیں، وہ درخت ہیں جن میں پھل نہیں، وہ پھول ہیں جن میں خوشبو نہیں، وہ قالب ہیں جن میں روح نہیں، کسی کے ایمان کی پہچان اس کے اخلاق حسنہ میں ہو سکتی ہے۔ سید صاحب فرماتے ہیں تقویٰ والے وہی لوگ ہوتے ہیں جو راست باز بھی ہیں، عفو و درگزر اور میا نہ روی اختیار کئے رہتے ہیں، قتل، خون ریزی، بدکاری مکر اور زور وغیرہ سے پرہیز کرتے ہیں، اسی طرح ان کے خیال میں صاحب ایمان وہ ہے جو مفلسی میں بھی خدا کی راہ میں خرچ کرتا ہو۔ دنیا میں امن و سلامتی پھیلاتا اور اپنے نفس کے مقابلہ میں بھی انصاف کرتا ہو، اور مومن وہ ہے جس کو لوگ امین سمجھیں اور مسلم وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے لوگ سلامت رہیں۔ یہ وہ باتیں ہیں، جو آج کل کے مسلمان سوچیں کہ اس معیار پر پورے اترتے ہیں کہ نہیں۔

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اعلیٰ ترین درجہ اخلاقی معلموں میں متعین کیا گیا ہے۔ سید صاحب نے بتایا ہے کہ آپ کا سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ آپ نے جو کچھ کہا سب سے پہلے خود اس کو کر دکھایا۔ مثلاً اگر غریبوں اور مسکینوں کی امداد و اعانت کا

حکم دیا تو پہلے خود اس فرض کو ادا کیا، خود بھوکے رہے دوسروں کو کھلایا، اگر آپ نے اپنے دشمنوں اور قاتلوں کو معاف کرنے کی نصیحت کی تو پہلے خود اپنے دشمنوں اور قاتلوں کو معاف کیا۔ سید صاحب نے اس کی وضاحت بہت خوبصورت انداز میں کی ہے کہ آپ کی حیثیت ایک انسان، ایک باپ، ایک شوہر، ایک دوست، ایک خانہ دار، ایک کاروباری تاجر، ایک افسر، ایک حاکم، ایک قاضی، ایک سپہ سالار، ایک بادشاہ، ایک استاد، ایک واعظ، ایک مرشد، ایک زاہد اور آخر میں ایک پیغمبر کی نظر آتی ہے۔ اور ہر حیثیت سے آپ اپنے قول اور عمل میں مکمل نظر آتے ہیں، دوسرے مذاہب کے لوگ انسانوں کو اپنے ہادیوں اور رہنماؤں کی صرف تعلیمات اور اقوال سناتے ہیں مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروں نہ صرف آپ کے اقوال و نصائح بلکہ آپ کے عملی نمونوں اور کارناموں کو پیش کرتے ہیں کہ آپ خود کامل ہوئے تو دوسرے ناقصوں کو کس طرح کامل بنایا۔ خود پاک ہوئے تو دوسرے ناپاکوں کو بھی کس طرح دھوکہ پر پا کر کیا۔

اس کے بعد ”اسلام کا فلسفہ اخلاق“ کے عنوان سے ایک ایمان پرور بحث ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام نے اخلاق کا کمال یہ قرار دیا ہے کہ وہ یہ سمجھ کر ادا کئے جائیں کہ یہ خدا کے احکام ہیں۔ اس کی تمام تر بناء ارادہ و نیت پر ہو۔ یعنی اس کی غرض و غایت صحیح ہو، عمل قالب ہے تو صحیح غرض و غایت اس کی روح ہے۔ روح نہیں تو بے جان قالب کس کام آسکتا ہے۔ اسلام میں ہر قسم کے نیک کاموں کی غرض و غایت صرف ایک ہی قرار دی گئی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا مندی ہے۔ سید صاحب کے خیال میں یہیں آکر فلسفیانہ اخلاق اور اسلامی اخلاق کے اصول کا فرق نمایاں ہو جاتا ہے۔ حکمائے اخلاق کے یہاں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ضروری نہیں سمجھی جاتی، سید صاحب نے اس کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ تعلیم محمدی میں جماعت کے افراد پر ان کی قوت کے بقدر جماعت کے دوسرے افراد کی نگرانی فرض ہے، اسی اخلاقی فرض کا شرعی نام امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے یعنی اچھی باتوں کے لئے کہنا اور بری باتوں سے روکنا۔ یہ وہ تعلیم ہے جو

تمام دنیا کے مذاہب میں اسلام کی اخلاقی نگرانی کو نمایاں کرتی ہے اور قوی دل اور قوی ہمت افراد کا یہ فرض قرار دیتی ہے کہ وہ جماعت اور سوسائٹی کے مزاج اور قوم کی نگہبانی اور اس کی بگاڑ کی دیکھ بھال کرتے رہیں۔ مگر یہ حق ان ہی اشخاص کو دیا گیا ہے جو خود امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نمونے ہوں، اسی کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا یہ مقصد نہیں کہ کسی دوسرے کے گھر میں گھس کر اس کی حالت اور کیفیت کی جستجو کی جائے۔

سید صاحب یہ بھی بتاتے ہیں کہ اسلام کے اخلاق میں یہ بھی ہے کہ جو شخص کسی کے ساتھ بُرائی کرے تو اس کے ساتھ اتنی ہی بُرائی کی جائے، یہ عدل ہے، اور اس کو چھوڑ دینا معاف کر دینا اور درگزر کرنا یہ احسان ہے۔

اسلام میں ان دونوں کے الگ الگ مراتب ہیں، عدل کو جماعت اور سلطنت کے ہاتھ میں دیا ہے، یہ کسی ایک شخص کا کام نہیں ہے، مگر احسان ہر شخص کے ہاتھ میں ہے، یہ محض شخصی معاملہ ہے پھر قانون اور اخلاق کی بحث کرتے ہوئے سید صاحب لکھتے ہیں کہ دنیا میں امن و امان اور عدل و انصاف کے قیام اور فتنہ و فسادات اور برائیوں کے انسداد کے لئے دو چیزیں ہیں، قانون اور اخلاق اور گو مقصد ان دونوں کا ایک ہی ہے مگر ان کے منزل و مقصود تک پہنچنے کے راستے مختلف ہیں، ان دونوں میں کچھ نہ کچھ کمی ہے جس کی تلافی ایک دوسرے سے ہوتی ہے پھر سید صاحب نے کیسی اچھی بات فرمائی ہے کہ قانون برائیوں کو تو روک دیتا ہے مگر دل میں اس برائی کی طرف سے کراہت کا کوئی روحانی کیف پیدا نہیں کیا جاسکتا۔ رسول اللہ کی شریعت میں عدل، احسان، قانون اور اخلاق کی جامعیت ہے۔ تو راہ محض قانون ہے۔ انجیل محض اخلاق ہے، مگر اسلام نے قانون اور اخلاق دونوں کے درمیان حد فاصل قائم کر کے ہر ایک کی حد مقرر کر دی ہے، اور اپنی شریعت کی کتاب میں قانون کو قانون کی جگہ اور اخلاق کو اخلاق کی جگہ رکھ کر انسانیت کو تکمیل تک پہنچا دیا۔ موسوی عیسوی اور محمدی اخلاقی تعلیمات میں باہم جو باریک فرق ہے وہ اسی قانون اور اخلاق کی علیحدگی اور ترکیب کا نتیجہ ہے۔ (ص: ۹۴)

سید صاحب نے اس کی طرف بھی توجہ دلائی کہ انتقام اور سزا کا اصول نہ ہو تو جماعت کا نظام قائم نہیں رہ سکتا لیکن اگر عفو کا اصول نہ ہو تو روح کی بلندی اور اخلاق کی پاکیزگی کوئی چیز نہ رہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ سزا اور انتقام تو حکومت کے ہاتھ میں رہے۔ اس کے اجراء میں رحم نہ کیا جائے، اور امیر و غریب، بڑے چھوٹے میں تفریق نہ ہو تاکہ جماعت اور ملک کا نظام قائم رہے دوسری طرف اسلام میں عفو کی اہمیت بھی ہے تاکہ اس سے شخصیت کے مدارج کمال کا ذریعہ پیدا ہو، اور اشخاص کی روحانی پاکی اور اخلاقی بلندی برابر ترقی کرتی رہے، سید صاحب کی نظر میں اخلاق کی سب سے بھاری اور دشوار تعلیم عفو، درگزر، ضبط نفس، تحمل اور برداشت ہے، اسی لئے اسلام کی تعلیم میں اس کی بڑی اہمیت ہے، اس سلسلہ میں سید صاحب کہتے ہیں کہ جو برائی کرے نہ صرف اس کو معاف کرو بلکہ اس کے ساتھ بھلائی کرو اور جو عداوت کرے اس کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ اس ربانی تعلیم پر عمل کرنے والوں کا نام اللہ تعالیٰ نے صابر اور ذو حظ عظیم یعنی خوش قسمت رکھا ہے۔ اسلام کے فلسفہ اخلاق کی بحث کر پڑھ کر ناظرین اس نتیجہ پر ضرور پہنچیں گے کہ اسلام میں اخلاق کا فلسفہ کس قدر اہم اور کامل ہے۔

پھر سید صاحب نے یہ بھی بتایا ہے کہ اسلام کی اخلاقی تعلیم کی تکمیل اس میں ہے کہ انسان اپنے اخلاق سے اللہ تعالیٰ کی محبت کا جو یار ہے، کفر، بدگوئی، بدلہ لینے میں حد سے آگے بڑھ جانا، فخر، غرور، سختی، خباثت، ناشکری، فساد، اسراف، ظلم، گناہ وہ بد اخلاقیات ہیں جو انسان کو محبت الہی کے سایہ سے دور کرتی ہیں (ص: ۱۸۵)، کیسی ایمان پرور اور کیسی نشاط انگیز ہے یہ تعلیم، اس کے بعد تعلیم اخلاق کے طریقے اور اسلوب بتائے ہیں جو یہ ہیں:

۱۔ اپنے اپنے موقع پر سختی اور نرمی دونوں ہوں۔

۲۔ فضائل کو عمدہ تشبیہوں اور رذائل کو قبیح مناظر اور قابل نفرت صورتوں میں اس

طرح پیش کیا جائے کہ سننے والا بالطبع فضائل کی طرف مائل اور رذائل سے روگرداں ہو جائے۔

۳۔ اچھے کاموں کے اچھے اور برے کاموں کے برے نتیجہ کو کھول کر بیان کر دیا جائے جس سے اچھے اخلاق کے اختیار اور برے کام کے ترک کا جذبہ ابھرے۔ (ص: ۹۱-۱۸۸)

سید صاحب نے اس کی بھی وضاحت کی ہے کہ اسلام نے فضائل اخلاق کو الوہیت، ملوکیہ اور نبوت کے محاسن قرار دیا ہے اور رذائل کو شیطان کے محاسن میں داخل کیا ہے۔ (ص: ۱۹۲)

پھر اخلاق کی تین قسمیں بتائی ہیں، فضائل اخلاق رذائل اخلاق اور آداب اخلاق، فضائل اخلاق میں یہ عنوانات قائم کئے گئے ہیں۔

سچائی، سخاوت، عفت، پاکبازی، دیانتداری، امانت، شرم، حیا، رحم، عدل، انصاف، عہد کی پابندی، احسان، عفو و درگزر، رفق و لطف، تواضع، خاکساری، نرم کلامی، ایثار، اعتدال، میانہ روی، خودداری، عزت نفس، شجاعت، شہادت، استقامت، حق گوئی اور استغناء۔ رذائل کے یہ عنوانات ہیں:

جھوٹ، جھوٹی قسمیں، وعدہ خلافی، خیانت، بددیانتی، غداری، دغا بازی، بہتان، چغل خوری، غیبت، بدگوئی، دو رو خاپن، بدگمانی، خوشامد، تحمل، حرص، طمع، بے ایمانی، چوری، ناپ تول میں کمی بیشی، رشوت، سود خوری، شراب خوری، غیظ و غضب، بغض و کینہ، ظلم، فخر، غرور، ریا، خود بینی، خود نمائی، فضول خرچی، حسد، فحش گوئی۔

آداب اخلاق کے یہ عنوانات ہیں:

فطری آداب، طہارت کے آداب، کھانے پینے کے آداب، آداب مجلس، آداب ملاقات، آداب گفتگو، باہر نکلنے اور چلنے پھرنے کے آداب، آداب سفر، آداب خواب، آداب لباس، آداب مسرت، آداب ماتم، متفرق آداب۔

ان عنوانات کو دیکھنے سے یہ ظاہر ہو جائے گا کہ ان موضوعات پر کیا کچھ نہیں لکھا گیا ہوگا۔ زیر نظر کتاب میں ان کی تفصیلات سے ظاہر ہوگا کہ ان سے جو نظام پیدا ہوتا ہے



اس میں تمام مہذب قوموں کی اجتماعی اور معاشرتی خوبیاں بھی سامنے رکھی گئی ہیں، اور اس کے ساتھ اسلام کے اپنے احکام بھی ملحوظ رکھے گئے ہیں اور ان سے طریق زندگی کی جو ہدایت نصیب ہوتی ہے اور اخلاق کی بلندی اور طہارت سے معاشرت میں جو پاکیزگی پیدا ہوتی ہے ان ہی کے مجموعہ کا نام اسلام کا خاص تمدن اور معاشرت ہے جس کے بنانے میں اخلاق کے فضائل میں جتنی پاکیزگی پیدا ہوگی اتنے میں تمدن اور معاشرت پاکیزہ ہوگی۔

اس جلد کی نمایاں خصوصیات یہ بھی ہیں کہ جو بھی بات کہی گئی ہے اس کی تائید کے لئے فوراً قرآن کی آیتیں اور حدیثیں پیش کر دی گئی ہیں۔ اور وہ اس لئے خشک نہیں ہو پائی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی کے واقعات اس کے ساتھ اس طرح پیش کر دیئے گئے ہیں کہ شروع سے آخر تک کتاب پڑھتے وقت یہ نہیں محسوس ہوتا کہ ہم پند و موعظت کی کوئی کتاب پڑھ رہے ہیں، بلکہ لذیذ حکایتوں کے ایک مجموعہ سے لذت آشنا ہو رہے ہیں۔

پھر اگر کھلے ذہن کے ساتھ کوئی غیر مسلم بھی اس کا مطالعہ کرے تو اس کو غیر شعوری طور پر یہ محسوس ہوگا کہ بلند اخلاق کی تعمیر کے لئے ان تعلیمات سے بہتر اور بلند ترین تعلیمات کیا ہو سکتی ہیں، یہ نہ صرف مسلمانوں کے خیر الامت ہونے کیلئے دستور حیات ہے بلکہ ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوگا کہ اسلام کا رب رب العالمین ہے رب المسلمین ہی نہیں۔ اور اس کے رسول بھی رحمۃ المسلمین ہونے کے بجائے رحمۃ للعالمین ہیں۔ اس لئے مسلمانوں کے رب اور رسول کے ذریعہ سے جو تعلیمات ملی ہیں وہ انسانیت کے لئے پیغام رحمت اور انسانوں کے لئے نصاب زندگی ہیں، اور ان ہی کو حاصل کر کے دنیا کو زندگی کے موتی، ہیرے اور لعل، سیرت کے یاقوت، زمرہ اور عقیق، کردار کے نیلم، پکھراج اور لاجورد سے جگمگائی جاسکتی ہے۔